إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد دوم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (مسلم)

بیشک یہ علم دین ہے پس خوب سوچ لو کہ تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟

تفہیم المسائل

جلد دوم

پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی - پاکستان

نام کتاب	تفہیم المسائل (جلد دوم)
مصنف	پروفیسر مفتی منیب الرحمٰن
تصحیح	مولانا حافظ محمد ابراہیم فیضی
	مولانا فیصل ندیم احمد قادری (ایم اے، ایل ایل بی، بی ایڈ)
طبع بار	ہشتم، فروری 2010ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	FQ5
قیمت	-/325 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔37221953 فیکس:۔042-37238010

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔37247350-37225085

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:021-32212011-32630411 فیکس:۔021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں نے پبلشر "ضیاء القرآن پبلی کیشنز" سے شائع کردہ کتاب

"تفہیم المسائل (حصہ دوم)"

تالیف وتصنیف

پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمٰن صاحب

کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں، میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج قرآنی آیات کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراہیم فیضی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ بِعَدَدِ مَا فِی جَمِیْعِ الْقُرْاٰنِ حَرْفًا حَرْفًا وَّبِعَدَدِ كُلِّ حَرْفٍ اَلْفًا اَلْفًا

کتاب الزکوٰۃ

متفرق	

☆☆☆......☆...☆...☆......☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمدللّٰه رب العٰلمین، والصلوٰةُ والسلام علیٰ رحمة للعٰلمین، سیدنا ومولانا محمدٍوّعلیٰ اٰله الطیبین الطاھرین وعلیٰ صحابته الصدیقین الکاملین، وعلیٰ اولیاءِ امته وعلماءِ ملته من الفقھاء المجتھدین والمحدثین والمفسرین اجمعین

حدیثِ دل

الحمدللّٰہ علیٰ احسانہٖ ''تفہیم المسائل'' کے عنوان سے ہم نے روزنامہ ''ایکسپریس'' کی اشاعت جمعہ کے دینی صفحے پر سوال وجواب کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام عطا فرمایا، ملک اور بیرونِ ملک دینی ذوق رکھنے والے قارئین کرام نے اس کی تحسین فرمائی۔ بعد میں ہم نے اس کی افادیت کے پیش نظر احباب کی خواہش پر کتابی شکل میں تفہیم المسائل (جلد اول) کے نام سے شائع کیا اور قلیل مدت میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہوگئے، ہم اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں کرم اور اہلِ علم وقارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر متشکر وممنون ہیں۔

اب تفہیم المسائل جلد دوم پیش خدمت ہے، اس میں بعض نئے مفید اور دلچسپ مسائل ہیں، اس امر کا اندازہ آپ کو فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہوجائے گا، ہمیں امید ہے ان شاء اللہ العزیز قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔ ہم نے سلسلہ تفہیم المسائل کی اشاعت کی ذمہ داری اہلسنّت کے انتہائی مؤقر وممتاز اشاعتی ادارے ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' کو تفویض کی ہے۔ یہ ادارہ محسنِ اہلسنّت منبع کرم حضرت علامہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری قدس سرہم العزیز کی باقیاتِ صالحات میں سے ہے، اور یہ ''وہ شجرۂ طیبہ ہے'' جس کی مہک وبہار میں روز افزوں اضافہ ہورہا ہے۔ ادارے کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب زید مجدہٗ گفتار وکردار، نفاستِ طبع، متوازن ومتواضع مزاج، طبیعت میں ٹھہراؤ، رچاؤ اور وقار وتمکنت میں، ''اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ'' کے مصداق، اپنے والد گرامی کا عکس ہیں، یہ حضرت قبلہ پیر صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ نظر اور حسنِ تربیت ہے، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے جس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

اللہ کرے وہ اسی روش پر ہمیشہ قائم ودائم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔ مشاغل کثیرہ کے سبب بعض اوقات ہم روزنامہ ایکسپریس میں اپنا ہفتہ وار کالم تسلسل کے ساتھ اور بلا ناغہ جاری نہیں رکھ سکے، قارئین کرام سے گذارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مصروفیت کار سے ایسی فراغت عطا فرمائے کہ اس مشن کو تسلسل اور تندہی سے جاری رکھ سکیں۔

ہم پیش آمدہ دینی مسائل کے حل کیلئے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تفسیر تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں اور براہ راست بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا وجود اہلسنّت وجماعت کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، انہوں نے تحریری میدان میں جو علمی شاہکار تخلیق کیے ہیں، مجھے امید ہے وہ آئندہ صدیوں بلکہ ہزاریوں تک مطلع علم پر آفتاب نصف النہار کی طرح ضوفگن رہیں گے، جبکہ ان سے بغض وحسد رکھنے والوں کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا، ارشاد باری تعالیٰ حق اور سچ ہے: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (الرعد: 17)، (ترجمہ) ''یعنی جھاگ تو بے فائدہ ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز انسانیت کیلئے نفع رساں ہوتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) وہ زمین میں قرار ودوام پاتی ہے''۔ آپ بھی ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل علامہ محترم کو اپنی تمام تر جسمانی، فکری، علمی اور عقلی قویٰ کی سلامتی کے ساتھ تادیر اپنے دین متین کی خدمت کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

ممکن ہے مجھ سے کسی مسئلے کے تفہم یا تفہیم میں خطا ہو گئی ہو، اگر کوئی صاحب علم ہماری کسی خطا پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم میری اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں، ہم ان کے ممنون رہیں گے۔

میں مولانا محمد ابراہیم فیضی اور مولانا محمد ناصر خان چشتی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اِن منتشر ومتنوع مسائل کی ترتیب وتدوین اور تبویب میں تعاون فرمایا اور تصحیح کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھایا۔ اسی طرح ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے میں مولانا منور احمد نعیمی کا تعاون بھی شامل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ماجور فرمائے۔

انشاء اللہ العزیز! ''تفہیم المسائل'' کی آئندہ مجلدات بھی آتی رہیں گی۔ آخر میں ہم بہ صد عجز ونیاز وبہ غایتِ خلوص اللہ جل شانہ، سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں ملتجی ہیں کہ وہ اپنے

حبیب کریم علیه وعلى اٰله وصحبه الوف التحيّة والتّسليم کے طفیل اس سعی ناتمام کو اپنے حضور عالی شان میں مقبول وماجور فرمائے اور اہل علم، اربابِ فکر ونظر اور دینی مطالعے کا ذوق رکھنے والے قارئین کی نظر میں اسے وقعت وتکریم عطا فرمائے۔ آمین۔

بندۂ عاجز

منیب الرحمٰن

15/جون 2003ء

Scanned with CamScanner

كتاب العقائد

اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا

سوال: ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض علماء اللہ تعالیٰ کیلئے واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، وغیرہ، جبکہ اس کے برعکس بعض دیگر علماء ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ اسے فرطِ ادب سے تعبیر کرتے ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وغیرہ۔ اس میں کونسا طریقہ درست ہے، کیا اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کے صیغے کے استعمال سے شرک کا ایہام تو نہیں ہوتا؟ مدلّل و مفصل تحریر کیجئے۔

(مولانا محمد ناصر خان چشتی......R-618 بلاک 14، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں ہمیں یہ دونوں باتیں ملتی ہیں۔ قرآن مجید کا عمومی اسلوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کیلئے واحد کے صیغے کا استعمال ہے، مثلاً: اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وغیرہ۔ لیکن بعض مقامات پر جمع کے صیغے کا استعمال بھی ہے، مثلاً: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۹)

ترجمہ: ’’بلاشبہ ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں‘‘۔

قرآن مجید میں دس مقامات پر نَزَّلْنَا (ہم نے اتارا)، دو مقامات پر نَزَّلْنٰہُ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر نَزَّلَہٗ (اس نے اسے اتارا)، ایک مقام پر نُنَزِّلُہٗ (ہم اسے اتارتے ہیں)، چالیس مقامات پر اَنْزَلْنَا (ہم نے اتارا)، چودہ مقامات پر اَنْزَلْنٰہُ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر اَنْزَلْنٰھَا (ہم نے اسے اتارا)، کے کلمات مبارکہ آئے ہیں، ان کے علاوہ عَبْدِنَا (ہمارے بندے)، لَطَمَسْنَا، نَّطْمِسَ (ہم مٹادیں گے)، حَشَرْنٰھُمْ (ہم نے انہیں جمع کیا)، وٰعَدْنَا (ہم نے وعدہ کیا)، فَاَنْبَتْنَا (ہم نے اگایا)، ظَلَّلْنَا (ہم نے سایہ کیا)، نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (ہم اتارنے والے ہیں)، بَیَّنّٰہُ (ہم نے وضاحت سے بیان کیا)، الْمُنْزِلِیْنَ (ہم اتارنے والے ہیں)، صَرَّفْنَا (ہم نے پھیرا)، سُقْنٰہُ (ہم نے چلایا)، لِنُبَیِّنَ (تاکہ ہم واضح طور پر بیان کریں)، فَاَسْکَنّٰہُ (ہم نے ٹھہرایا)، مُنْذِرِیْنَ (ڈرانے والے)، وَضَعْنَا (ہم نے (بوجھ) اتارا)، اَرْسَلْنَا (ہم نے بھیجا)، فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ (ہم نے تمہیں وہ پلایا)، وغیرہ، تو قرآن مجید میں ذات

باری تعالیٰ کیلئے واحد وجمع دونوں کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ سورۃ الحجر آیت نمبر ۹ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''ہر چند کہ یہ جمع کا صیغہ ہے لیکن بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت کے اظہار کیلئے خود کو جمع کے صیغے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ ان میں سے جب کوئی ایک کام کرتا ہے یا کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس کو یوں کہتا ہے کہ ہم نے یہ کام کیا یا ہم نے یہ بات کہی، (تفسیر کبیر، ج۷، ص۱۲۳، مطبوعہ دار الحیاء والتراث العربی، بیروت)''

ہماری فہم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بالعموم اپنی احدیت، وحدانیت اور فردیت (یکتائی) کو اجاگر فرمایا ہے، بعض مقامات پر اس نے اپنی عزت وجلالت، سطوت وشوکت، ہیبت ودبدبہ اور قدرتِ کاملہ محیطہ کے اظہار کیلئے جمع کے کلمات بھی استعمال فرمائے ہیں۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''اللہ عزّ وجل کو ضمائر مفرد سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وتر ہے اور تعظیماً ضمائر جمع میں بھی حرج نہیں، اس کی نظیر قرآن میں ضمائر متکلم میں تو صدہا جگہ ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، اور ضمائر خطاب میں صرف ایک جگہ ہے، وہ بھی کلام کافر سے کہ عرض کرے گا: رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا، اس میں بھی علماء نے تاویل فرمادی ہے کہ یہ ارجعونی جمع باعتبار تکرار ہے یعنی ارجع ارجع ارجع۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: بہر حال یوں کہنا مناسب ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''، مگر اس میں کفر وشرک کا حکم کسی طرح نہیں ہوسکتا، نہ گناہ ہی کہا جائے گا، بلکہ خلاف اولیٰ''۔

(فتاوٰی رضویہ، ج۶، ص۱۳۶-۱۳۷، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)۔

علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''بشیر القاری شرح صحیح البخاری'' صفحات ۲۴۱ تا ۲۴۳ میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جو حضرات چاہیں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض مقامات پر اپنے لیے جو جمع کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس کی ذاتِ جلیل کے لئے خاص ہے، اس نے ایسے کلمات بندوں کی زبان سے بیان نہیں فرمائے، بلکہ جہاں بندوں کو اپنی بارگاہِ عالی کیلئے کچھ عرض کرنے کا حکم ہوا ہے، وہ کلمات مفردہ پر مشتمل ہے، مثلاً:

(۱) سورۂ آل عمران آیت ۲۶، ۲۷ میں مٰلِكَ الْمُلْكِ، تُؤْتِي، تَنْزِعُ، تُعِزُّ، تُذِلُّ، تُوْلِجُ، تُخْرِجُ، تَرْزُقُ، سب مفرد کے صیغے ہیں۔

(۲) سورۂ انعام آیت نمبر ۱۲ میں ''كَتَبَ''، (۳) اسی سورت کی آیت میں ''شَهِيْدٌ''، ''قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ'' (۴) آیت نمبر ۲۵ میں ''قُلْ هُوَ الْقَادِرُ''

(۵) سورۃ یونس آیت نمبر ۳۴ میں قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ (۶) سورۃ الرعد میں قُلْ هُوَ رَبِّيْ (۷) سورۂ الاسراء آیت ۲۴ میں قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا (۸) اس سورۃ کی آیت نمبر ۸۰ میں قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ (۹) سورہ طٰہٰ آیت نمبر ۱۱۴ میں قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (۱۰) سورۃ المؤمنون آیت نمبر ۲۹ میں قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (۱۱) اسی سورہ کی آیت ۱۱۸ میں قُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۲) سورہ اخلاص آیت نمبر ۱ میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔

اسی طرح قرآن مجید میں بارگاہ الوہیت سے تعلیم مومنین کیلئے دعا کے جتنے کلمات ارشاد فرمائے گئے ہیں، وہ سب کے سب مفرد کلمات ہیں، سورۂ ''فاتحہ'' ہی میں ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ انبیاء کرام کی سب دعائیں مفرد کے صیغوں کے ساتھ ہیں، سورۂ بقرہ کے آخر میں ہے، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، فَانْصُرْنَا، (یعنی ہمیں معاف فرمادے، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما، ہماری مدد فرما) سب مفرد کے صیغے ہیں۔

میں یہ ادّعاء تو نہیں کرتا کہ تمام احادیث مبارکہ یا اکثر میرے مطالعے سے گذر چکی ہیں، لیکن جہاں تک میرا محدود مطالعہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ ثابت نہیں ہے، تو بندوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسلوبِ دعا اور رسول اللہ ﷺ کی سنتِ طیبہ میں ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے مفرد کلمات ہی ارشاد فرمائے ہیں۔

مولانا غلام جیلانی نے تو طنز وتعریض کے طور پر یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض حضرات کے اکابر نے اپنے لئے ننگِ اسلاف، بندۂ ظلوم وجہول، ناکارۂ خلائق، کمترین خلائق کے کلمات استعمال فرمائے ہیں، تو کیا ان کے تلامذہ اور متوسلین اپنے ان اکابر کیلئے یہی کلمات استعمال کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی ذات جلالت کیلئے مفرد کا صیغہ ہی استعمال کرنا اولیٰ ہے، لیکن اگر کوئی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو اسے شرک وبدعت یا گمراہی قرار دینا درست نہیں ہے، یہ بھی بہر حال مباح اور جائز ہے---

ادب گاہیست زیرِ آسماں ازعرش نازک تر

سوال: ایک مقامی اخبار میں مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ: میں نوافل پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو بخشنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح قرآنِ پاک کی تلاوت ختمِ قرآن کے بعد اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو بخشا جاسکتا ہے؟ نیز اس کے لئے کیا نیت کی جائے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ: نوافل ادا کر کے اس کا ثواب نبی اکرم ﷺ کو بخش دیں۔ اسی طرح قرآن کریم کو پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے، کیا یہ اندازِ بیان مقامِ رسالت کے شایانِ شان ہے؟ (فضل واحد...... ضلع مردان، صوبہ سرحد)

جواب: اصولی طور پر تو یہ مسئلہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ بلکہ جمیع انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کو ایصالِ ثواب نہ صرف جائز بلکہ مستحسن امر ہے اور امتی کے لئے باعثِ سعادت ہے کہ وہ اپنی بدنی و مالی عبادات یعنی نوافل، تلاوت، اذکار و تسبیحات، تلاوتِ قرآن مجید، حج و عمرہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ایصالِ ثواب اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے لئے کرے، اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس ایصالِ ثواب کے لئے کوئی مخصوص طریقہ کا اختیار کرنا ضروری نہیں ہے، نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ اس ایصالِ ثواب کی نیت سے یہ عبادات اور اعمالِ خیر انجام دیئے تو یہ بھی کافی ہے اور اختتامِ عبادت کے بعد لفظاً دعا کر کے ایصالِ ثواب کریں تو بھی احسن ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لئے ''ثواب بخش دینا'' کا لفظ مقامِ نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے، اس سے بے ادبی جھلکتی ہے۔ اُردو کی لغت فیروز اللغات میں بخشش کے معنی درج ہیں: 'انعام، عطیہ، معافی، عفو و درگزر' اس لفظ کے معانی میں ''معافی اور درگزر'' مقامِ رسالت کے شایانِ شان نہیں ہیں کہ اُمتی ایسا کلمہ استعمال کرے۔ کیونکہ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ آیت: ۱۰۴ میں رسول اللہ ﷺ کیلئے ایسا ذو معنی لفظ استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، جس کا ایک معنی تو مقامِ رسالت کے موافق ہو لیکن دوسرا دور کا کوئی معنی ایسا ہو جسے کوئی بدعقیدہ اور گستاخ شخص توہین آمیز معنوں میں استعمال کرسکتا ہے۔ اس کے بجائے ہمارے فقہاءِ کرام اور بزرگانِ دین نے ''اِھداء'' (یعنی حضور ﷺ کی بارگاہ میں ثواب کا ہدیہ کرنا) کا کلمہ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی اپنی عبادات اور اعمالِ خیر کا ثواب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیتاً پیش کرنا، یعنی یوں کہے کہ ''اے اللہ! میں

اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ کرتا ہوں' یا یہ کہے کہ ''یا رسول اللہ! میں اپنے اعمال کو آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے۔'' اہلِ عقیدت نے کہا ہے کہ

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

رسول اللہ ﷺ کو سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سیدُ المرسلین کہنا

سوال: عرض یہ ہے کہ میرے حسبِ ذیل دو سوالات کا جواب از روئے قرآن و حدیث عنایت فرمائیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مولائے کل، سرکارِ دو عالم، سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سید المرسلین کہا جاتا ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ تمام صفات ہیں تو پھر اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: محمد صرف نبی ہی تو ہیں اور ان سے پہلے بھی نبی گزر چکے ہیں یعنی تمام نبی برابر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اللہ کے علاوہ کوئی حاکم، حاجت روا اور معبود نہیں، اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے، (سورۂ مومن: ۳)، (خواجہ احمد بخاری...... ملیر، کراچی)۔

جواب: حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ ان القابات کے اہل ہیں اور ان سب اعزازات کے حامل ہیں، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات مبارکہ ہمارے اس دعوے کی روشن دلیل ہیں:

> ''اور (اے حبیب یاد کیجئے!) جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دے دوں، پھر تمہارے پاس ایک عظیم رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہو، تو تم اس پر ضرور بہ ضرور ایمان لانا اور ضرور بہ ضرور اس کی مدد کرنا، فرمایا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور میرے اس بھاری عہد کو قبول کر لیا؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا: تم اس عہد پر گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں، پھر جو شخص اس کے بعد عہد سے پھر گیا، سو وہ لوگ فاسق ہوں گے۔'' (آلِ عمران: ۸۲-۸۱)

اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رو سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں

کے نبی ہیں۔اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے عالمِ ارواح میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کا پختہ عہد واقرار لیا، چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

''ابن جریر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم یا ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا تو اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا تو وہ ان پر ایمان لائے گا ان کی نصرت کرے گا اور اپنی امت کو ان پر ایمان لانے کا حکم دے گا، آگے چل کر وہ مسندِ ابویعلیٰ کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہ ہوتا۔'' (روح المعانی ۳/۲۱۰-۲۰۹)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت ورسالت کو تمام مخلوق اور تمام انسانیت کے لیے عام فرما دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (الاحزاب:28)

''اے نبی ہم نے آپ کو شاہد اور (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے (رحمتِ الٰہی کی) بشارت دینے والا اور (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے''۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (الاعراف:158)

''کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول (مبعوث ہوا) ہوں،

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء:107)

''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے''۔

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سید المرسلین، سرورِ کائنات اور سرورِ کونین ایسے القاب مبارکہ کا تعلق ہے تو حدیث کی معروف کتاب ''مشکوٰۃ المصابیح'' میں باب فضائل سید المرسلین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ'' میں کتبِ احادیث کے حوالے سے متعدد روایات درج ہیں جن میں سے ہم چند کا ذکر سطور ذیل میں کر رہے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وكان النبى يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة

''اور (ماضی کی امتوں میں اللہ کی سنت یہ رہی کہ) ہر نبی بطورِ خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور مجھے سارے انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

اُرسلت الى الخلق كافة۔

''مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

انا سيد ولد ادم يوم القيمة ولا فخر و بيدى لواء الحمد ولا فخر وما من نبى يومئذ ادم فمن سواه الا تحت لوائى۔

''میں قیامت کے دن ساری اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں (بلکہ تشکر کے طور پر) کہہ رہا ہوں اور حمدِ باری تعالیٰ کا پرچم میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور اُس دن آدم اور ان کے علاوہ جو نبی بھی ہوگا وہ میرے ہی پرچم کے نیچے ہوگا''۔

انا قائد المرسلين ولا فخر وانا خاتم النبيين ولا فخر وانا اوّل شافع واوّل مشفع۔

''میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور میں خاتم النبیین ہوں اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا اور میری ہی شفاعت سب سے پہلے (اللہ کی بارگاہ میں) مقبول ہوگی''۔

اذا كان يو م القيمة كنت امام النبيين و خطيبهم وصاحب شفاعتهم غير فخر۔

''قیامت کے دن میں انبیاء کا امام ہوں گا اور ان کا ترجمان ہوں گا، اور ان کی شفاعت کا ذمہ دار ہوں گا اور یہ میں بطورِ فخر نہیں کہہ رہا۔''

جہاں تک ''مولائے کل'' کے لقب کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق بھی بلاشبہ جائز ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب:٦)

''نبی مومنوں سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔

''ولی'' کے معنی قریب کے ہیں، یہ قرب مکانی بھی ہوسکتا ہے اور زمانی بھی، نسبت کا قرب

بھی ہوسکتا ہے، محبت کرنے والا، دوست، نصرت کرنے والا، رشتہ داری، ملکیت، معاملات کا منتظم ونگران اور حاکم وغیرہ، یہ لفظ متعدد معانی پر مشتمل ہے، اسی سے ''مولیٰ'' بھی ہے، ''مولیٰ'' کے معنی ہیں مالک آقا، آزاد کردہ غلام، محبت کرنے والا، رشتے دار وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہم ''مولیٰ'' کہتے ہیں تو قرب، نصرت، محبت، تصرف واختیار سب معنوں کو یہ شامل ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید میں غیر اللہ پر بھی ''ولی'' کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''تو یقیناً اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومنین، اور اس کے بعد فرشتے بھی (ان کے) مددگار ہیں''۔ (التحریم:۴)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ، جبریل امین اور صالح مومنین سب پر ''مولیٰ'' کا اطلاق کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تو جبریل امین اور مومنین صالحین بلکہ سب انبیاء سے بڑا ہے تو آپ کو مولائے کل کیوں نہیں کہہ سکتے۔ سورۂ احزاب کی مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی نے ''روح المعانی'' میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقام ہے تو مومنوں پر واجب ہے کہ رسول کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب جانیں اور رسول کا حکم ان پر ان کے نفسانی تقاضوں سے زیادہ نافذ العمل اور موثر ہو، اور نبی کا حق ان پر ان کی جانوں کے حق سے زیادہ ہو۔

آپ کا یہ کہنا کہ تمام نبی برابر ہیں، قرآن کی رو سے درست نہیں، بلاشبہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (البقرہ:۲۸۵)

''(رسول اور تمام مومن یہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے میں ہم رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ ایک پر ایمان لائیں اور دوسرے پر نہ لائیں، بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید خود رسولوں کے درمیان تفاوتِ مراتب کی تصدیق کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ

دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ:۲۵۳)

''یہ سب رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کسی کو (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دیں اور روح القدس (جبریل) سے ہم نے ان کی مدد فرمائی۔''

مفسرین کرام کے مطابق وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (اور ان میں سے کسی کو (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی)'' سے سید المرسلین ﷺ ہی مراد ہیں۔

آپ کا یہ ارشاد کہ اگر یہ تمام القاب رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں تو پھر اللہ کے لیے کیا ہے؟ جواباً گذارش ہے کہ اللہ جل شانہ اس عظیم المرتبت، رفیع الشان رسولِ مکرم کا خالق ہے، مالک ہے، معبود ہے، مسجود ہے، مختار ہے اور یہ رسول عظیم اپنی اس تمام تر رفعتِ شان کے باوجود اس کے بندۂ خاص ہیں، مخلوق ہیں، نیازمند ہیں۔ وہ رب العلمین، واجب الوجود ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے، اور بشمول رسولِ کریم سب اس کے نیازمند اور محتاج ہیں۔ رحمۃ للعلمین ﷺ کی ساری رفعتیں، عظمتیں اور شانیں اس کی عطا سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور کی تواضع کا عالم یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

عن عائشة رضى الله عنها عن النبى ﷺ قال: سددوا وقاربوا وابشروا فانه لا يدخل احدا الجنة عمله، قالوا: ولا انت يا رسول الله؟ قال: ولا انا الا ان يتغمدنى الله بمغفرة و رحمة.

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: راہِ راست پر چلو، اور اللہ کا قرب اختیار کرو اور (اجر وثواب کی) بشارت دو، کیونکہ کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا، (صحابہ نے) عرض کیا: یارسول اللہ! آپ کی نجات کا مدار بھی عمل پر نہیں ہوگا؟ فرمایا: میرا بھی نہیں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و مغفرت سے ڈھانپ لے (یعنی اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے دے''۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث:۶۴۶۷)

باقی رہا آپ کا یہ اشکال کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایسی صفات کا اطلاق کردیا جائے جو اللہ

تعالیٰ کے لیے ہیں تو کیا اس سے شرک لازم نہیں آئے گا۔ جواباً گزارش ہے کہ اس سے شرک بالکل لازم نہیں آئے گا، کیونکہ قرآن مجید میں متعدد ایسی صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہیں جیسے رؤف، رحیم، عزیز، شاہد، سمیع، بصیر وغیرہ، ان صفات کا اطلاق قرآن ہی میں رسول اللہ صلی اللہ وسلم پر بھی ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ابراء (شفا دینا)، احیاء (زندہ کرنا)، خلق (پیدا کرنا) کی صفات کا اطلاق ہوا ہے، یہ قطعاً شرک نہیں بلکہ عین توحید ہے، کیونکہ جب یہ صفاتِ جلیلہ اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں تو معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں، ان کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، کسی اور سے مستعار یا مستفاد نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اپنی ذات و صفات میں مستقل بالذات ہونے کے عقیدے کو "واجب الوجود" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے برعکس انبیاء کرام، رسلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں یہ صفات ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (البقرہ:255)

"کون ہے جو اس کی بارگاہ میں (کسی کی) شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذن عطا فرما دے"۔

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبْرِیُٔ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (آل عمران:۴۹)

"میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے اڑنے والا (پرندہ) بن جاتا ہے، اور میں اللہ کے اذن سے مادر زاد اندھے اور برص کے مریض کو شفاء دیتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں"۔

خلق، ابراء (شفایاب کرنا) اور احیاء (زندہ کرنا) اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر کوئی اپنی ذات سے ان کا دعویٰ کرے یا کوئی ان امور کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی کمال سمجھے تو یہ شرک ہوگا۔ لیکن اگر یہی کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے کرنے کا دعویٰ کرے یا کوئی ان کی طرف منسوب کرے تو یہ عین توحید ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو "اے حبیب!" کہنے کا جواز؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہاں اور کس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لفظ سے مخاطب کیا ہے، جس کے معنی ہیں اے حبیب، اور کیا اے نبی کا ترجمہ اے حبیب! معنی میں تصرف نہیں ہے اور کیا معنی کا تصرف یا تاویل جائز ہے؟

(خواجہ احمد بخاری......C-78 الفلاح ہاؤسنگ پروجیکٹ ملیر ہالٹ)۔

جواب: مشکوٰۃ المصابیح میں باب فضائل سید المرسلین میں سنن دارمی اور جامع ترمذی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"(ترجمہ) رسول اللہ علیہ وسلم کے کچھ احباب بیٹھے ہوئے تھے، حضور ﷺ، باہر تشریف لائے یہاں تک کہ ان کے قریب ہوگئے۔ آپ نے سنا کہ صحابہ آپس میں مذاکرہ کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے کہا: بیشک اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل (دوست) بنایا ہے، دوسرے نے کہا: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا ہے، ایک اور نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ اور اس کی (جانب سے مقدس) روح ہیں۔ ایک اور نے کہا: آدم کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا: میں نے تم سب کی گفتگو سن لی ہے اور (اس امر پر) تمہاری حیرت کو بھی نوٹ کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں، ہاں ہاں وہ اسی شان کے (مالک) ہیں اور موسیٰ اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے والے ہیں ان کی بھی یہی شان ہے، عیسیٰ اللہ کی جانب سے روح اور اس کا کلمہ ہیں اور بلاشبہ ان کی یہی شان ہے، اور آدم اللہ کے برگزیدہ و چنیدہ (Selected) ہیں اور ان کی یہی شان ہے، مگر سنو! میں اللہ کا حبیب ہوں"۔

تو اس حدیث مبارک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں، واضح رہے کہ "حبیب" اور "محبوب" ہم معنی ہیں۔ اسی طرح قرآن نے متعدد مقامات پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ متقین، متوکلین، صابرین، مقسطین، توابین، محسنین، مطہرین سے محبت فرماتا ہے اور حضور ﷺ تو ان سب کے سردار و امام ہیں بلکہ ان سب کو یہ شرف حضور کی

نسبتِ غلامی سے ملا ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب درجے میں محبوب ہیں۔ اس لیے حضور کو اللہ تعالیٰ کا حبیب یا محبوب کہنا درست ہے۔ کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کے حبیب یا محبوب کا اطلاق بالکل درست ہے۔

باقی یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ! کا معنیٰ کسی نے ''اے حبیب!'' یا ''اے محبوب!'' نہیں کیا، بلکہ اُس کا ترجمہ سب نے ''اے نبی!'' کیا ہے، بعض مفسرین ومترجمین کرام نے اس کا ترجمہ ''اے (غیب بتانے والے) نبی! کیا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ لفظ ''نبی'' کے ایک معنیٰ ہیں ''غیب کی خبر دینے والا۔'' البتہ جہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''قُل'' کے کلمے کے ساتھ مخاطب فرمایا جس کے معنیٰ ہیں کہو، کہہ دو، کہیے، کہہ دیجیے، اس میں ضمیر مخاطب مستتر (پوشیدہ) ہے، یعنی ''اَنْتَ'' (تو، تم) اور ظاہر ہے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو اس کا ترجمہ کہہ دیجیے ''اے نبی!''، ''اے رسول!''، ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!'' یا ''اے حبیب!'' یا ''اے محبوب!'' کرنا درست ہے اور صرف کہو یا کہہ دو یا کہہ دیجیے کردیں تو تب بھی درست ہے۔

کیا درود تاج پڑھنا شرک ہے؟

سوال: ہمارے لوگ درود تاج، درود لکھی، دعائے گنج العرش اور اس طرح کے دیگر ورد و وظائف بڑے شوق سے اور ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ کیا یہ واقعی کارِ ثواب ہے؟ ایک مقامی اخبار میں لکھا ہے کہ درود تاج پڑھنا شرک ہے، دعائے گنج العرش نام ہی مہمل ہے، ان کی کوئی سند نہیں ہے اور انہیں پڑھنے والا وعید کا حقدار ہے، وغیرہ۔

(محمد ناصر خان چشتی، گلشن اقبال......حافظ محمد شمیم، قیوم آباد)

جواب: درود تاج کو علماء عاملین اور صوفیاء کرام ہمیشہ وفورِ شوق اور محبت سے پڑھتے رہے ہیں۔ اہل اللہ کے ہاں اس کو بکثرت شوق سے پڑھا جانا ہی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی قبولیت کی روشن دلیل ہے۔ کسی ورد، وظیفہ، درود یا دعا کا کتاب وسنت میں نہ ہونا اور بات ہے اور کتاب وسنت کے خلاف ہونا اور بات۔ یہ دونوں باتیں اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل جدا ہیں، لیکن اس سے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیا جاتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ قرآن وسنت میں نہیں ہے، لہٰذا باطل ہے۔ قرآن وسنت میں مذکورہ دعائیں پڑھنا بلاشبہ کارِ

ثواب اور برکت وسعادت کی بات ہے، لیکن قرآن وسنت کی کسی نصِ صریح میں یہ حکم نہیں کہ صرف وہی درود اور دعائیں پڑھنا جائز ہیں جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور اس کے علاوہ ہر درود و دعا اور وظیفہ باطل ہے۔ قرآن وسنت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ تو متعین فرمادیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس سے انحراف کر کے نماز پڑھی جائے گی تو قبول نہیں ہوگی، البتہ درود اور وظائف پڑھنے کا طریقہ یا کلمات متعین نہیں ہیں، لہٰذا ایسا درود اور وظیفہ جائز ہے جو کلماتِ خیر پر مشتمل ہو اس میں کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ ہو۔ اگر کسی دعاء اور درود کے کلمات شرعاً جائز ہیں تو اس سے قطعِ نظر کہ وہ سندِ صحیح کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں یا نہیں، پڑھنا جائز ہیں اور ثواب کا باعث ہیں۔ ہاں اگر کسی کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ان خاص کلمات کے ساتھ درود اور دعا پڑھنا جائز ہے اس سے ہٹ کر کسی اور طریقے سے پڑھنا ناجائز، تو یہ عقیدہ درست نہیں ہوگا۔ مہمل تو بے معنی لفظ کو کہتے ہیں اور ''گنج العرش'' تو بامعنی نام ہے اور اس طرح کا نام رکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

درود تاج رسول اللہ ﷺ کے فضائل وکمالات اور محاسن پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی شخص العیاذ باللہ: ان کلمات کو شرک سے تعبیر کرتا ہو کہ ''دَافِعِ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْاَلَمِ'' یعنی حضور ﷺ ہر بلاء و مصیبت، ہر وبا، قحط، مرض اور رنج والم کو دور کرنے والے ہیں، مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان بلاؤں، وباؤں، امراض، قحط اور ہر رنج والم کے ازالے کے لئے وسیلہ ہیں، آپ کی برکت سے یہ مصائب دفع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نجات عطا فرماتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے روزمرہ زندگی میں ہم کہتے ہیں مجھے فلاں بیماری سے اس دوا نے شفاء دی، فلاں ڈاکٹر کے ہاتھ میں بڑی شفاء ہے، یا فلاں چیز نے مجھے بیمار کردیا، اس طرح کے کلمات استعمال کرنے والے کو نہ کوئی مشرک کہتا ہے اور نہ سمجھتا ہے، کیونکہ اس کا مسلمان ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ دوا یا طبیب کو بالذات شافی نہیں جانتا، بلکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاء دینے والا ہے اور دوا یا طبیب وسیلہ شفاء ہیں۔

قرآن پاک میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ

اللهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (آل عمران:۴۹)

"میں تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اڑتا ہوا پرندہ بن جاتی ہے اللہ کے حکم سے، اور میں شفایاب کرتا ہوں مادر زاد اندھے اور برص والے کو، اور میں زندہ کرتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو"۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خلق (پیدا کرنے)، نفخ (پھونک مارنے)، شفاء دینے، زندہ کرنے اور غیب کی خبریں دینے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتے ہیں کہ میں اللہ کے حکم سے یہ سب کام انجام دیتا ہوں، جو دراصل مخلوق کے نہیں بلکہ خالق کے کام ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ذاتی کمال سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن، حکم اور عطا سے یہ سارے کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی اپنی ذاتی قدرت سے بلاؤں، آفات، بیماریوں اور آلام کو دفع کرتا ہے تو یہ شرک ہے، اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے ایسا کرتے ہیں تو یہ عین توحید ہے اور یہ قرآن پاک کے خلاف نہیں بلکہ قرآن کے مطابق ہے، اور ہم بھی درود تاج میں مذکورہ بالا کلمات اسی عقیدے سے پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجات اور دفعِ مشکلات کا وسیلہ ہیں اور یہ عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے۔ باقی ہر درود اور دعاء کے لئے سندِ صحیح سے ثابت ہونا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ ورنہ دنیا بھر کے لوگوں کا اپنی اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا، نبی پر درود بھیجنا اللہ سے دعائیں مانگنا خلافِ شرع قرار پائے گا۔

جنات نظر کیوں نہیں آتے؟

سوال: انسانوں کو آگ نظر آتی ہے تو جنات کیوں نظر نہیں آتے ہیں، حالانکہ وہ آگ ہی سے پیدا کئے گئے ہیں؟۔ (سیّد محمد فرحان زیدی......نیول کالونی، کراچی)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن:۱۵)

"اور اس نے جن کو خالص آگ کے شعلے سے پیدا کیا"۔

شیاطین بھی جنات ہی کی نوع سے ہیں، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

"ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، وہ جنات میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کی حکم عدولی کی"۔ (الکہف:۵۰)

دوسرے مقام پر شیاطین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف:۲۷)

"بلاشبہ وہ (شیطان) اور اس کا کنبہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ پاتے"۔

ہمیں نظر نہ آنے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ جس آگ سے انہیں بنایا ہے، ہوسکتا ہے وہ اتنی لطیف ہو کہ نظر نہ آسکتی ہو، کیونکہ شیطان نے اپنے اس مادۂ تخلیق کی لطافت کی بنا پر اپنے آپ کو انسان سے افضل قرار دیا ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف:۱۲)

"(اللہ نے) فرمایا: تجھے (آدم کو) سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا، جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا؟ بولا، میں اس سے بہتر ہوں، (اے اللہ!) تو نے مجھے آگ سے تخلیق کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے"۔

یعنی اس نے آگ کی لطافت کو مٹی کی کثافت پر فضیلت کا سبب قرار دیا۔ اور ہمیں تو بہت سی خاکی مخلوق بھی، انتہائی چھوٹے جراثیم (Virus)، خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے، لہٰذا جنات بھی لطیف ناری مخلوق ہوتے ہوئے ہمیں نظر نہ آئیں تو یہ حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے۔ واللہ اعلم

گمراہ پیر

سوال: ایک شخص بظاہر تبلیغِ دین کا کام بھی کرتا ہے، لوگوں کو مرید بھی بناتا ہے یعنی بیعت وارشاد کا کام بھی کرتا ہے۔ اور تعلّی کے طور پر کہتا ہے کہ میں فلاں بزرگ کو مزار سے نکال کر پھینک دوں گا اور اس پر اپنا قبضہ کرلوں گا، ساتھ ہی مدرسہ تعلیم القرآن، جس میں محلے کے ۹۰ طلبہ وطالبات قرآن

کریم کی تعلیم حاصل کررہے تھے، اپنے ذاتی مفادات کے لئے بند کردیا۔ بتایئے ازروئے قرآن و سنت ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ (محمد اقبال نقشبندی مجددی ملنگی......سیکٹر5-E، نیوکراچی)

جواب: رسول اللہ ﷺ نے جنازہ، میت اور قبر کی تکریم و احترام کا حکم دیا ہے، صحیح مسلم میں روایت ہے، آپ نے فرمایا:

"قبر کے اوپر نہ بیٹھو اور قبر کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو۔"

یعنی ایسا نظر آئے کہ قبر کو سجدہ کیا جارہا ہے۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً قبر کی اہانت و تحقیر بھی جائز نہیں اور حدِ شرع سے بڑھ کر تکریم بھی جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی شخص آگ کی چنگاری پر بیٹھے کہ اس سے اُس کے کپڑے جل جائیں اور آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے، (اس اذیت کا برداشت کرنا) اس سے بہتر ہے کہ وہ قبر پر بیٹھ جائے (اور اس کا وبال اور گناہ اس کے ذمے آئے)"۔

بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے:

"حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ ایک جنازے کا ہمارے پاس سے گزر ہوا، رسول اللہ ﷺ (جنازے کو دیکھ کر) کھڑے ہوگئے، ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم) یہ تو ایک یہودی عورت کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا: موت ایک ہولناک چیز ہے، پس جب تم جنازہ دیکھو تو (موت کی ہولناکی کا تصور کرکے) کھڑے ہوجایا کرو"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں میت، جنازے اور قبر کی تکریم اور ان چیزوں کو دیکھ کر آخرت کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قبر پر بیٹھنے کی رسول اللہ ﷺ نے شدت سے ممانعت فرمائی ہے اور اس کی سنگینی کو آگ میں جلنے سے زیادہ شدید بتایا ہے۔ تو قبر کا کھودنا اور میت کو قبر سے نکالنا تو قبر کے اوپر بیٹھنے سے بدرجہا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو دین کی تبلیغ اور بیعت و ارشاد کا کام کرتا ہے، وہ دین کی بنیادی تعلیمات سے اس قدر ناواقف ہے۔ اسی لئے امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جاہل کے تبلیغ کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر وہ مسئلہ جانتے ہوئے اور حکمِ شرعی کو رد کرتے ہوئے ایسا کہتے ہیں، تو یہ فسق ہے اور انہیں توبہ

کرنی چاہئے۔ اگر وہ قبر کسی ولی اللہ کی ہے اور وہ شخص ان کے مقام سے واقف ہے اور ان سے عناد رکھتے ہوئے ایسا کہتا ہے تو حدیث قدسی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت رکھے گا، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں"۔

ویسے کسی شخص کی ملکیتی زمین میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی میت کو دفن کردیا گیا ہو تو وہ میت کے ورثاء سے مطالبہ کرسکتا ہے کہ میت کو اس کی ملکیتی یا غصب شدہ زمین سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا جائے۔

سوال کے دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ پیر صاحب نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے "مدرسہ تعلیم القرآن" بند کردیا ہے، یہ سوال مبہم ہے اور ذاتی مفاد کی وضاحت سوال میں نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مدرسہ اس پیر صاحب کے ذاتی مکان یا ذاتی ملکیتی جگہ پر چل رہا تھا، تو اگرچہ یہ سعادت اور خیر سے محرومی کی بات ہے، لیکن شرعاً انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ انہوں نے ابتداءً اسے وقف نہ کیا ہو بلکہ عاریتاً مدرسہ تعلیم القرآن کے لئے دیا ہو۔ اور اگر وہ مدرسہ کسی ایسی جگہ چل رہا تھا جو مدرسے ہی کے مقاصد کے لئے وقف تھی یا اس کے اصل مالک نے برضا و رغبت اس کی اجازت دے رکھی تھی تو پیر صاحب کو اس کے بند کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ قرآن مجید نے "سورۃ القلم" کی ابتدائی آیات میں دشمنانِ رسول کے جو اوصاف رذیلہ بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ یعنی "خیر کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے والا" بھی ہے۔ الغرض اگر سوال میں درج کردہ واقعات و الزامات حقیقت ہیں، محض بہتان طرازی نہیں ہے تو ایسا شخص منصبِ تبلیغ، بیعت و ارشاد اور دینی رہنمائی کا اہل نہیں ہے، حق واضح ہونے پر انہیں اپنے طرزِ عمل سے رجوع کرکے توبہ کرنی چاہئے۔

محاورہ کلمۂ کفر ہے؟

سوال: یہ جملہ کفر کیوں ہے؟ (میری آنتیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ رہی ہیں؟)،

(عرفان اللہ قادری......کراچی)

جواب: "میری آنتیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ پڑھ رہی ہیں" یہ اردو زبان کا محاورہ ہے اور یہ محاورہ اس

وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا معدہ خالی ہو اور بھوک کی شدت اسے ستا رہی ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر ہے۔

پروانے کو چراغ بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

ظاہر ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا تھا اور ان کے گھر میں باقی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سوائے اللہ جل جلالہ اور اس کے حبیب ﷺ کی برکات اور مقدس نام کے۔ مذکورہ بالا محاورے میں بظاہر کوئی موجب کفر بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کلمۂ کفر ہے۔ ہاں البتہ شرعی احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے اسماء گرامی کو روزمرہ محاورات میں اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ تقدس و تعظیم کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کا نام لینا چاہیے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ قرآنی کلمات ہیں اور اعضاء کا حسب حال اللہ کی تسبیح بیان کرنا عقلاً کوئی بعید بات نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ (اسرا: ۴۴)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے''۔

(بقیہ جواب صفحہ 409 پر ملاحظہ کریں)

روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بسم اللہ پڑھنے پر خواہش کا پورا ہونا

سوال: آپ کا کالم شروع ہونے سے پہلے ایکسپریس اخبار میں ایک بار یہ چھپا تھا کہ کوئی سات روز تک روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے تو اس کی ہر خواہش پوری ہوگی، کیا یہ درست ہے؟ ایسی کوئی حدیث ہے؟ (م الف ع......کراچی)

جواب: میرے ناقص علم میں حدیث کا کوئی ایسا حوالہ یا روایت نہیں ہے، نہ ہی سلف صالحین میں سے کسی ایک کا ایسا قول مجھے معلوم ہے، جو بزرگ ایسا عمل بتائیں، انہی سے اس کا اصل معلوم فرمالیجیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات اور مقدس اسماء صفات پر مشتمل ہے، اسے جتنی بار بھی پڑھیں گے، اجر و ثواب ملے گا۔ مخصوص تعداد کے بارے میں کسی بزرگ کا مجرب عمل ہو تو ان سے رہنمائی حاصل کیجیے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت کعبہ جھکا تھا؟

جبریل امین نے ہر ستر ہزار سال بعد طلوع ہونے والا ستارہ بہتر ہزار مرتبہ دیکھا تھا اس کا حوالہ

سوال: (۱) بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت کے وقت کعبہ جھکا تھا، اس کے بارے میں یہ بات کونسی کتاب میں ہے حوالہ لکھ دیں۔ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے سلام کا معروف شعر بھی ہے۔

جن کے سجدے کو محرابِ کعبہ جھکی
ان بھنوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام

سوال: (۲) حضور اکرم ﷺ نے ایک بار جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے، جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ایک ستارہ ستر ہزار سال کے بعد نکلتا تھا اس کو میں نے بہتر ہزار مرتبہ دیکھا، یہ بات بھی کون سی کتاب میں ہے حوالہ لکھیں۔

(محمد عارف الحق قادری......لودھراں، پنجاب)

جواب: (۱) اس کے بارے میں علامہ مفتی محمد خان قادری نے اپنی تالیف ''شرح سلام رضا'' میں حاشیۂ سیرۃ حلبیہ کا حوالہ دیا ہے لیکن ہمیں یہ حوالہ مل نہیں سکا۔ تاہم اس سے قریب تر مفہوم کی جو روایت ملی ہے، وہ یہ ہے:

عن عبدالمطلب قال: كنت فيّ الكعبة فرأيت الاصنام سقطت من اماكنها و خرت سجداً و سمعت صوتا من جدار الكعبة يقول: ولد المصطفى المختار الذى تهلك بيده الكفار و يطهر من عبادة الاصنام ويامر بعبادة الملك العلام.

''عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ میں کعبہ میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ بت اپنی جگہوں سے گر کر سجدہ ریز ہوگئے اور میں نے دیوار کعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مصطفیٰ مختار کی ولادت ہوگئی جن کے ہاتھوں کفار کی ہلاکت ہوگی اور وہ (بیت اللہ کو) بت پرستی سے پاک کریں گے اور مالک حقیقی علام (الغیوب) کی عبادت کا حکم دیں گے۔ (انسان

العیون فی سیرۃ الامین المامون الشہیر بالسیرۃ الحلبیہ، مؤلفہ علی بن برہان الدین الحلبی، ج اول ص ۱۱۵۔ ۱۱۴)۔"

اور دوسرے مقام پر ہے:

ولیلۃ ولادتہ ﷺ تزلزلت الکعبۃ ولم تسکن ثلاثۃ ایام ولیالیھا۔

"اور ولادت مصطفیٰ ﷺ کی شب کعبہ لرز گیا اور تین دن اور تین رات وہ ساکن نہیں ہوا" (سیرۃ حلبیہ ۱/۱۱۶)

مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۳۲ مصنفہ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مترجم مفتی غلام معین الدین نعیمی میں ہے:

حضرت عبدالمطلب سے منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں شب ولادت، کعبہ کے پاس تھا جب آدھی رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کعبہ مقام ابراہیم کی طرف جھکا اور سجدہ کیا اور اس سے تکبیر کی آواز آئی کہ:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ رَبُّ مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰى اَلْاٰنَ قَدْ طَهَّرَنِىْ رَبِّىْ مِنْ اَنْجَاسِ الْاَصْنَامِ وَاَرْجَاسِ الْمُشْرِكِيْنَ

"ترجمہ: اللہ بلند و بالا ہے اللہ بلند و بالا ہے وہ رب ہے محمد مصطفیٰ کا، اب مجھے میرا رب بتوں کی پلیدی اور مشرکوں کی نجاست سے پاک فرمائے گا"۔

اور غیب سے آواز آئی رب کعبہ کی قسم، کعبہ کو برگزیدگی ملی، خبردار ہو جاؤ کعبہ کو ان کا قبلہ، ان کا مسکن ٹھہرایا۔ اور وہ بت جو کعبہ کے گرداگرد نصب تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور سب سے بڑا بت جسے ہبل کہتے تھے منہ کے بل گر پڑا تھا۔ ندا آئی کہ سیدہ آمنہ سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور ابر رحمت ان پر اتر آیا ہے۔

شواہد النبوۃ (مصنفہ علامہ نور الدین عبدالرحمٰن جامی مترجم بشیر حسین ناظم) صفحہ نمبر ۵۷ پر ہے:

کعبے میں بت سرنگوں ہو گئے

حضرت عبدالمطلب کا بیان ہے کہ میں حضور علیہ السلام کی ولادت کے وقت طوافِ کعبہ میں مصروف تھا۔ جب آدھی رات گزری تو میں نے خانہ کعبہ کو مقام ابراہیم کی طرف سجدہ اور اللہ اکبر

کی آوازیں بلند کرتے دیکھا اور کہتے سنا کہ اب مجھے مشرکوں کی نجاستوں اور زمانۂ جہالت کی ناپاکیوں سے پاک و صاف کر دیا گیا ہے۔ پھر اس میں تمام بت جھک گئے، میں نے ہبل کی طرف دیکھا جو سب سے بڑا بت تھا تو وہ بھی اوندھے منہ ایک پتھر پر پڑا ہوا تھا اور منادی نے یہ صدا دی کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے محمد پیدا ہو چکے ہیں۔ اس وقت میں صفا پہاڑ پر چلا گیا، صفا پہاڑ کو میں نے پرغوغا دیکھا۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا گویا تمام پرندے اور بادل مکہ پر سایہ کرنے آئے ہیں۔ پھر میں حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف آیا، دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا کہ دروازہ کھولو۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے کہا ابا جان! محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: لاؤ ذرا دیکھوں تو کہنے لگیں: اجازت نہیں۔ پھر میں نے کہا: اے آمنہ رضی اللہ عنہا! اس بچے کو تین دن تک کسی کو مت دکھانا۔ یہ کہہ کر میں نے تلوار سونتی اور گھر سے باہر چلا گیا۔ میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو تلوار سونتے ہوئے تھا اور چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھا، کہنے لگا: اے عبدالمطلب! واپس جا تاکہ ملائکہ مقربین اور تمام علیین کے رہنے والے تیرے بچے کی زیارت سے فارغ ہوں۔ اس سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں اسی حالت میں باہر آ گیا تاکہ قریش کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کی خبر دوں لیکن میری زبان ایک ہفتہ تک بند ہو گئی اور میں کسی سے بات نہ کر سکا۔

یہ تمام روایات سند کے بغیر ہیں، ویسے فضائل میں ضعیف روایات بھی معتبر ہوتی ہیں۔

(۲) ستارے سے متعلق حدیث مندرجہ ذیل ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ سأل جبریل علیہ الصلوۃ والسلام فقال یا جبریل کم عمرت من السنین؟ فقال یا رسول اللہ! لست اعلم غیر ان فی الحجاب الرابع نجما یطلع فی کل سبعین الف مرۃ، رأیتہ اثنین و سبعین الف مرۃ فقال یا جبریل وعزۃ ربی جل جلالہ أنا ذالک الکوکب۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا اے جبریل! آپ کی عمر کتنی ہے؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ "حجاب رابع" میں ایک ستارہ ستر ہزار سال

میں ایک مرتبہ طلوع ہوتا ہے اور میں اسے بہتر ہزار مرتبہ دیکھ چکا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا اے جبرئیل! میرے رب کی عزت وجلال کی قسم، وہ ستارہ میں ہی ہوں"۔

(سیرۃ حلبیہ، جلد اول صفحہ ۴۹)

اسی روایت کو علامہ اسماعیل حقی نے اپنی تفسیر روح البیان میں سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۹-۱۲۸ کی تفسیر میں نقل کیا ہے، (روح البیان، ج ۳، ص ۶۸۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔ سند دونوں جگہ مذکور نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق، ایک دلچسپ عقلی سوال

سوال: اللہ تعالیٰ نے اب تک کروڑوں اور اربوں انسان پیدا کئے ہیں تو اس سلسلے میں (یعنی انسان کی پیدائش میں) اللہ تعالیٰ کا Criteria کیا ہے، مطلب یہ کہ فلاں انسان اس دور میں پیدا ہوں گے اور فلاں اس دور میں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس دور میں پیدا ہونے کے بجائے ۵۰۰ سال پہلے یا اس سے بھی پہلے پیدا ہوا ہوتا تو مجھے ہر لحاظ سے فائدہ ہوتا۔ اچھا ماحول، اچھے لوگ، اچھی چیزیں اور اچھی صحبت میسر آتی۔ اس دور میں تو بڑے بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے، آج کتنے نظر آتے ہیں؟ تو بس سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو جو مختلف ادوار میں پیدا فرماتا ہے اس کی منطق (Logic) یا حکمت کیا ہے؟ (عبداللہ...... دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: آپ کا سوال عقلی ہے، نہایت دلچسپ بھی اور گہرے غور وفکر کا بھی متقاضی ہے۔ اگر چہ اس کالم میں زیادہ تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے، لیکن اس حد تک وضاحت ناگزیر ہے کہ مسئلہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جائے اور اشکال رفع ہو جائے۔ بنیادی طور پر یہ قضا وقدر کا مسئلہ ہے اور اس مسئلے میں زیادہ بحث وتمحیص کو شریعت نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قادرِ مطلق اور مالک ومختار ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے مسئول اور جوابدہ نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (الانبیاء:۲۳)

"اللہ سے نہیں پوچھا جا سکتا ان کاموں کے متعلق جو کرتا ہے اور ان سب سے باز پرس کی

جائے گی"۔

لہٰذا کون سا کام کب کیا جائے؟ کس کی تخلیق پہلے ہو اور کس کی بعد میں؟ یہ باری تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے، مخلوق میں سے کوئی یہ سوال کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ایسا سوال ایک نامعقول جسارت اور مقام بندگی سے برتر معاملہ ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ اس کے افعال مبارکہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آجائے تو اس توفیقِ خیر اور سعادتِ وہبی پر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور اگر مشیت باری تعالیٰ کا کوئی فعل ہماری سمجھ سے بالاتر ہو، ماورائے عقل ہو، اس کی حکمت وحقیقت تک ہماری ناقص ونا تمام عقل کی رسائی نہ ہو سکے، تو اس کے حق وصواب ہونے پر ایمان کامل رکھتے ہوئے معاملہ اللہ کی طرف تفویض کر دینا چاہئے، اسی لئے علماء ربانیین نے تقدیر کو "سرِ الٰہی" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جو ضروری نہیں کہ ہم پر منکشف ہو جائے۔ اسلام، تسلیم ورضا اور مکمل خود سپردگی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ (النساء:۷۸)

"تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو، اور اگر انہیں کچھ بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ (تو) اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ (اے رسول) یہ آپ کی طرف سے ہے، آپ فرما دیجئے کہ (خیر ہو یا شر، نفع ہو یا ضرر) سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے"۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (الواقعہ:۶۰)

"ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کو مقدر فرمایا"۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ (فاطر:۱۱)

"اللہ ہی کے علم سے ہر ماں حاملہ ہوتی ہے اور وہ (بچہ) جنتی ہے اور جس معمر شخص کو (بھی) عمر (طویل) دی جاتی ہے یا کسی کی عمر کم کی جاتی ہے، وہ سب کچھ، لوح محفوظ میں (مرقوم) ہے"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے تکوینی امور مثلاً کون کب پیدا کیا جائے، کس کی عمر کتنی ہو، کوئی مرد ہو یا عورت، کوئی حسین وجمیل ہو یا بدصورت، کوئی دانا ہو یا نادان وغیرہ، جن میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے، ان پر جزا اور سزا کا مدار نہیں ہے۔ اسی طرح کسی غیر اختیاری امر پر نہ کسی پر اللہ کے غضب کا نزول ہوتا ہے اور نہ ہی اس بنا پر وہ جزاء کا حقدار ہوتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ

(النساء:۷۹)

”(اے مخاطب!) تجھے جو بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے“۔

اللہ تعالیٰ یہود کی سرکشی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا

”پھر ہم نے ان کی عہد شکنی کے باعث (ان پر لعنت کی) اور آیاتِ الٰہی کے انکار، ان کے انبیاء کو ناحق قتل کرنے، اور (سرکشی کی بناء پر) یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دلوں پر پردے (چڑھے ہوئے) ہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے کفر کے سبب (سزا کے طور پر) ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور (اب ان میں سے) بہت کم ایمان لائیں گے“۔ (النساء:۱۵۵)

یہ سزا جسے قرآن مجید نے جا بجا ختم، طبع، غلاف، اَکِنَّۃ اور اس جیسے دیگر کلمات کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مفسرین کرام نے بتایا ہے کہ یہ کوئی حسی یا حقیقی مہر، غلاف یا پردہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کے قلوب واذہان میں نورِ ایمانی اور ہدایت کے داخل ہونے کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں، بلکہ قبولِ خیر سے ان کے صریح انکار، عناد، ضد اور ہٹ دھرمی کو علامتی طور پر ان کلمات سے تعبیر کیا ہے، اور اب وہ محض مجبور ہو گئے ہیں یا ان سے مراد ایسی علامات ہیں جن سے فرشتے ان کو پہچان لیں گے، جیسے دنیا میں بھی قیدیوں کے مخصوص لباس ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت میں میری امت کی امتیازی پہچان یہ ہوگی کہ وہ مُحَجَّلْ (پنج کلیان) ہوں گے، یعنی

ان کے اعضاء وضو چمک رہے ہوں گے اور نورانی ہوں گے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ

(الحدید:۱۲)

”(اے محبوب!) جس دن آپ مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑتا ہوا ہوگا“۔

اور اس کے برعکس کفار، منکرینِ آخرت اور فساق وفجار کی کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین:۱۴)

”ہرگز نہیں بلکہ ان کے اعمال (بد) کے سبب ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں“۔

اب رہا یہ سوال کہ سعادت وشقاوت، خیر وشر جب سب کچھ پہلے ہی سے تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے تو اس میں بندے کا کیا قصور؟ تو جواباً گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ کون کیا کرے گا؟ نیک ہوگا یا بد، سعادت مند ہوگا یا شقی وبدنصیب؟ الغرض اپنے علمِ حق کے مطابق اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، یعنی یہ نہیں کہ چونکہ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اس لئے اس نے لازماً ایسا ہی کرنا ہے، بلکہ جو کچھ اس نے آگے چل کر کرنا تھا وہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک آرکیٹیکٹ اور انجینئر کسی پل یا ڈیم کا ڈیزائن بناتا ہے، اس کے تعمیراتی سامان کا ایک معیار مقرر کرتا ہے، پھر مقررہ ڈیزائن اور معیار کے مطابق اسے تعمیر کیا جاتا ہے اور آرکیٹیکٹ اور انجینئر پہلے ہی یہ بتا دیتا ہے کہ یہ پل یا ڈیم اتنی مدت کے لئے کارآمد ہوگا اور پھر عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ انجینئر ہزار سال تک کی پیشین گوئی کر دیتا تو وہ پل ہزار سال تک کارآمد رہتا، بلکہ اس کا تعلق اس پل یا ڈیم کے ڈیزائن یا استعداد پر ہے اور انجینئر کی پیش گوئی اس کے فنی علم و تجربے کی روشنی میں ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کے ظن وتخمین اور علم میں خطا کا احتمال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے علمِ یقینی میں رائی کے دانے کے برابر بلکہ اس کے کروڑویں حصے کے برابر بھی خطا کا کوئی احتمال نہیں۔

کوئی عالم، انجینئر یا سائنسدان تو درپیش حالات وواقعات اور حقائق کے پیشِ نظر رائے قائم کرتا ہے لیکن وہ عالم الغیب نہیں ہے۔ مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اسے علم نہیں ہوتا،

غیر متوقع طور پر کوئی بہت بڑا سیلاب آ جائے، زلزلہ آ جائے، میٹریل ناقص نکل آئے، آندھی یا طوفان آ جائے، یا اچانک آگ لگ جائے وغیرہ، تو اس کے سارے کے سارے تخمینے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اس کی پیش گوئی یا تخمینہ ناکام ہو جائے گا۔ جبکہ علمِ الٰہی ماضی، حال اور مستقبل، غیب وشہود، حوادث وآفات، ظاہر وپوشیدہ، کمالات ونقائص سب پر محیط ہے، لہٰذا اس میں کسی بھی درجے میں کسی بھی مرحلے میں از ابتداءِ آفرینش تا ابد کسی بھی خطا کا عقلاً یا عادتاً کوئی امکان نہیں ہے۔

یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیرِ ازل میں کسی کے بارے میں کیوں لکھ دیا کہ وہ بامراد ہوگا یا نامراد، اس کے برعکس کیوں نہیں لکھ دیا؟ ۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک معلم اپنے ایک شاگرد کے جملہ احوال کو جانتا ہے اور ان حقائق کے پیشِ نظر وہ پیش گوئی کر دیتا ہے کہ تم فیل ہو جاؤ گے اور وہ فیل ہو جاتا ہے، اس کو عام محاورے میں نوشتۂ دیوار کہتے ہیں۔ کیا اگر اسے معلم کہہ دیتا کہ تم یونیورسٹی میں ٹاپ کرو گے تو ایسا ہو جاتا، ہرگز نہیں۔ مزید یہ کہ استاد کا اپنے شاگرد کی ناکامی کی پیش گوئی کرنا اس کی رضا اور تمنا نہیں ہے بلکہ قانونِ مکافاتِ عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی فرق رضاءِ الٰہی اور مشیتِ الٰہی میں ہے، کفار ومشرکین اور فساق وفجار کو نارِ جہنم کا عذاب دینا رضاءِ الٰہی نہیں بلکہ مشیتِ ربانی اور قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ کسی کو پہلی صدی میں اور کسی کو پندرھویں صدی ہجری میں پیدا کرنے میں خالق کی حکمت کیا ہے اور کیا اس دور میں پیدا ہونے والوں کے ساتھ معاذ اللہ خالق جلّ شانہٗ نے کوئی ناانصافی تو نہیں فرمائی؟ اس کا ایک سادہ اور اٹل جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعلِ مختار اور قادرِ مطلق ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی بھی نہیں ہے اور اس نے اپنے کرمِ عالی اور فضل واحسان سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ اگر اس نے سابقین اولین کے لئے درجات رکھے ہیں تو متاخرین یا بعد میں آنے والوں کے لئے بھی حصولِ خیر کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ بلاشبہ قرونِ اولیٰ میں نیکیوں کی فراوانی تھی۔ ماحول سارے کا سارا ایمان افروز اور روح پرور تھا۔ ایسے ماحول میں نیک بن کر رہنا اور نیکی کرنا نسبتاً آسان تر تھا، آج صورتِ حال بالکل برعکس ہے، برائی معاشرے میں اس طرح اندر تک سرایت کئے ہوئے ہے جیسے انسان کی نس نس میں خون دوڑ رہا ہے۔ ایسے ماحول میں خیر کے

جادۂ مستقیم پر رہنا جہادِ اکبر نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر خیر کے راستے میں رکاوٹیں جس قدر زیادہ ہیں اتنا ہی اجر وثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّکُمْ فِیْ زَمَانٍ مَنْ تَرَکَ مِنْکُمْ عُشْرَ مَا اُمِرَ بِهٖ هَلَکَ ثُمَّ یَاْتِیْ زَمَانٌ مَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ بِعُشْرِ مَا اُمِرَ بِهٖ نَجَا۔

’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) فرمایا: تم ایک ایسے (مبارک) دور میں ہو کہ تم میں سے جو شخص احکامِ شریعت کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے گا ہلاک ہو جائے گا، پھر (تمہارے بعد) ایک ایسا دور آئے گا کہ ان لوگوں میں سے جو شخص احکامِ شریعت کے دسویں حصے پر بھی عمل پیرا رہا تو نجات پالے گا‘‘۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

رسول اللہ ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’بے شک میری امت میں سے مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے لوگ وہ ہیں جو میرے (وصال کے) بعد آئیں گے، ان میں سے ایک شخص تمنا کرے گا کہ کاش میں اپنا گھر بار اور مال ومتاع سب کچھ قربان کر دوں اور (اس کے صلے میں) مجھے اللہ کے رسول کا دیدار نصیب ہو جائے، (صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)۔‘‘

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: ’’جب میری امت (کے عقائد، اخلاق اور معاملات) میں بگاڑ پیدا ہوگا تو اس وقت جو شخص میری سنت پر قائم رہے گا، اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا‘‘۔ (بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ)‘‘

تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں ہمارے لئے بڑی بشارتیں، سعادتیں، اجر وثواب اور انعام واکرام کا خزانہ موجود ہے جو ہمارا منتظر ہے، کاش کوئی ہم میں سے اسے حاصل کرنے کے لئے پیش قدمی کرے، اس لئے اس دور پرفتن میں پیدا ہونا مایوسی کی بات نہیں ہے، بلکہ اجر وثواب کے مواقع زیادہ ہیں۔

کسی بندے کے بارے میں کہنا ’’(العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں‘‘

سوال: میرے کچھ سسرالی جو ایک معروف شخص کے پیروکار و عقیدت مند ہیں، جن میں میرے شوہر کی سگی بہنیں بھی شامل ہیں، یہ لوگ اپنے مرشد کے بارے میں کہتے ہیں کہ: (نعوذ باللہ) ’’ہمارے اللہ وہ ہیں‘‘ ان کے ایک ساتھی کا انتقال ہوا تو ان کا کہنا تھا کہ اسے پیر صاحب نے اپنے پاس بلالیا، اس کے جنازے میں کلمے کے بجائے پیر صاحب کے نعرے لگاتے رہے۔ یہ لوگ اذان اور نماز کو نہیں مانتے اور نہ ہی قرآن شریف پڑھتے ہیں بلکہ مذاق اڑاتے ہیں۔ میری نند جو پیر صاحب کی پیروکار ہے، اس کی شادی اس جیسے خیالات رکھنے والے شخص سے ہو رہی ہے۔

جناب میں معلوم یہ کرنا چاہتی ہوں کہ:

۱) میری ساس اور سسر جو کہ نماز اور روزے کے پابند ہیں، اس شادی کے کرنے میں ان کے لئے کیا حکم ہے؟، کیا وہ گناہگار ہوں گے؟۔

۲) کیا میرے شوہر اور میں اس شادی میں شرکت کر سکتے ہیں؟۔

۳) جن والدین کی اولاد اس طرح کے خیالات رکھتی ہو ان کو اپنی اولاد کے ساتھ کیسا سلوک رکھنا چاہئے؟۔

۴) اگر کسی شخص کی بیوی اس پیر صاحب کی پیروکار ہو جائے تو ان کے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا نکاح قائم رہے گا؟ (اہلیہ انور احمد، کراچی)۔

جواب: بر تقدیر صدقِ سائلہ جو شخص غیر اللہ کے بارے میں کہے کہ (العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں، یہ صریح کفر اور شرک ہے اور جو راہنما یا پیشوا یہ جانتا ہو کہ اسے (معاذ اللہ) اللہ کہا جا رہا ہے اور وہ اپنے پیروکار کو روکے ٹوکے نہیں تو یہ کفر و شرک پر رضامندی ہے اور یہ بھی کفر ہے۔ ایسے لوگ اگر شادی شدہ ہوں تو ان کا نکاح باطل ہو جائے گا تاوقتیکہ یہ کفر سے توبہ نہ کر لیں۔ پھر ان کی تجدیدِ نکاح ہو سکے گی۔ جب تک یہ لوگ اپنے (سوال میں بیان کردہ) عقائدِ کفریہ پر قائم ہوں، ان سے ہر طرح کا میل جول، رشتہ نکاح قائم کرنا اور ان کی سماجی تقریب میں شرکت کرنا حرام ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے: ’’اور ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ چھوئے گی۔‘‘

۱) آپ کی ساس اور سسر اگر ان کے کفر پر مطلع ہونے کے باوجود اس پر راضی ہوں گے اور ایسے

شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیں گے تو یہ ’’رضا علی الکفر‘‘ کی بنا پر کفر ہے۔

۲) آپ لوگوں کے لئے شرعاً اس شادی میں شرکت سے اجتناب لازم ہے۔

۳) والدین کو چاہئے کہ ایسے عقائد کی حامل اولاد کو ان عقائدِ باطلہ کے کفر پر مطلع کر کے انہیں اُن سے رجوع کی دعوت بلکہ حکم دیں، اور اگر وہ باطل سے ’’رجوع الی الاسلام‘‘ پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے قطع تعلق کر لیں، ہر مسلمان روزانہ دعائے قنوت میں اپنے رب سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ:

وَنَخْلَعُ وَ نَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ

یعنی ’’اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہے ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں۔‘‘

۴) اگر وہ شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہے تو بیوی کے کفریہ عقائد اختیار کرنے سے نکاح باطل ہو جائے گا تاوقتیکہ وہ اپنے کفر پر مطلع ہونے کے بعد توبہ کر کے دوبارہ اسلام قبول کر لے۔ تجدیدِ ایمان کے بعد تجدیدِ نکاح بھی کرنی ہوگی۔

تخلیق ارض و سماء سے پہلے عرش کہاں تھا؟

سوال: زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے عرشِ الٰہی کہاں تھا؟ (عبداللہ...... گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (ہود:۷)

’’اور (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل سب سے اچھا ہے‘‘۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں ہے کہ عرش پانی پر تھا، تو پانی کس چیز پر تھا؟، انہوں نے کہا کہ وہ ہوا کی پشت پر تھا، (جامع البیان، رقم الحدیث: ۱۳۹۰۵)‘‘۔

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کا عرش پانی پر تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب و غریب قدرت کے اظہار کے لئے یہ فرمایا ہے، کیونکہ کسی عمارت کو بنانے والا اپنی عمارت کو تخت زمین پر پانی سے

دور رکھ کر بناتا ہے تاکہ اس کی عمارت منہدم نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پانی پر بنایا تاکہ عقل والے اس کی قدرت کے کمال کو جان لیں، (تفسیر کبیر ج ٦ ص ١٩٢)''۔

امام رازی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلالت ہے، کیونکہ عرش تمام آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی پر قائم کیا ہے، پس اگر اللہ تعالیٰ کسی ستون کے بغیر کسی وزنی چیز کو رکھنے پر قادر نہ ہوتا تو عرش پانی پر نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو بھی بغیر کسی سہارے کے قائم کیا، نیز عرش کے پانی پر ہونے کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ عرش پانی کے ساتھ ملتصق اور متصل ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آسمان زمین کے اوپر ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ٦، ص ٣٢٠-٣١٩)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ١٢٧٠ھ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر ہے اور عرش سے مراد وہی عرش معروف ہے، اور عرش کے پانی پر ہونے کا معنیٰ عام ہے، خواہ عرش پانی سے متصل ہو یا منفصل، (روح المعانی ج ٧ ص ١٥)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن جلد پنجم صفحہ ٥٠٣ پر لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ پانی سے مراد یہی معروف پانی ہے یا اس سے مراد مادّے کی مائع حالت (FLUID) ہے جس پر بطور استعارہ پانی کا اطلاق کیا گیا ہے، اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ زمین و آسمان سے پہلے پانی کی تخلیق ہو چکی تھی، اور ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوا کہ پانی ہی اصل کائنات اور منبع حیات ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا ۖ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (الانبیاء: ٣٠)

کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا، تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے''۔

کافر ملت پر معلق کر کے قسم کھانا

سوال: بعض لوگ قسم کھاتے وقت جوش میں آکر اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں کہ: ''اگر میں نے یہ کام کیا ہو یا ایسا کام کروں تو یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا کافر ہو کر مروں یا ایمان سے محروم ہو جاؤں''، اور وہ قسم میں جھوٹا ہے یا قسم توڑ دی، تو کیا حکم ہے؟

(کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی)۔

جواب: جس شخص نے کسی کام کے کرنے کو ''ملتِ غیر اسلام'' پر معلق کیا، مثلاً کہا ''اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں''، تو اس کے تین محامل ہیں:

١) اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کام اسی طرح ''واجب الامتناع'' ہے (یعنی اس کا نہ کرنا ضروری ہے)، جیسے یہودی نہ ہونا ضروری ہے اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن چونکہ حدیث میں ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، اس لئے وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اور حدیث میں جو اس کو کافر فرمایا گیا ہے، وہ زجر و توبیخ پر مشتمل ہے،

(البحر الرائق، ج ٤، ص ٢٨٤، مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ)۔

اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، اور اس نے یہ کام کیا تو اس کا یہودی ہونا صحیح، برحق اور حلال ہے تو اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے ماضی کے حوالے سے کسی کام کے نہ کرنے کی جھوٹی قسم کھائی اور کہا کہ اگر اس نے یہ کام کیا ہو تو یہودی ہے، اور اس کا یہودی ہونا صحیح اور برحق ہے، تو اس صورت میں وہ فی الفور کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، (البحر الرائق، ج ٤، ص ٢٨٦-٢٨٥ مطبوعہ کوئٹہ، الدر المختار علیٰ ردالمحتار، ج ٥، ص ٣٩٤-٣٩٢، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ١٤١٩ھ)۔

اس سلسلے میں تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت سے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں تو ایسی صورت میں بھی وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت نہیں کی تھی تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور حدیث پاک میں جو ارشاد ہے، ''وہ کافر ہو جائے گا'' یہ کفرانِ نعمت پر محمول ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: ۱۱۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)۔

حدیث مبارک، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ ہے: ''ثابت بن قیس ضحاک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے درخت کے نیچے (یعنی بیعت رضوان، جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئی) رسول اللہ ﷺ (کے دست اقدس پر) بیعت کی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ''ملتِ غیر اسلام'' پر جھوٹی قسم کھائی (یعنی یمینِ غموس) تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا۔''

جنت کی حوریں کیا ہیں؟ اور نیک خواتین کے لئے کیا ہوگا؟

سوال: قرآن مجید میں حوروں کا تذکرہ ہے، یہ بھی علماء سے سنتے رہتے ہیں کہ نیک مردوں کو جنت میں حوریں ملیں گی، تو نیک وصالح اور پاکباز خواتین کو کیا ملے گا؟ (صالحہ خاتون، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں چار مقامات پر صراحت کے ساتھ حوروں کا تذکرہ آیا ہے، متعلقہ آیات مبارکہ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿٥١﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿٥٢﴾ يَلْبَسُونَ مِن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٥٣﴾ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ

''بیشک پرہیزگار امن کی جگہ میں ہوں گے، باغات اور چشموں میں، باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنے آمنے سامنے (بیٹھے ہوئے) ہوں گے، ایسا ہی ہوگا اور ہم گوری کشادہ چشم عورتیں ان کی زوجیت میں دیں گے''۔ (الدخان: ۵۱ تا ۵۴)

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ ۖ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ (الطور: ۲۰)

''وہ برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، اور ہم انہیں زوجیت میں دیں گے گوری، کشادہ چشم عورتیں''۔

حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ (الرحمٰن: ۷۲)

''گوری کشادہ چشم بیویاں خیموں میں (باپردہ) ٹھہرائی ہوئی ہوں گی''۔

وَحُورٌ عِينٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ (الواقعہ: ۲۲، ۲۳)

''گوری کشادہ چشم بیویاں، جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی''۔

معتبر و مستند تفاسیر میں احادیث و روایات کے حوالے سے حوروں کے متعلق جو تشریحات آئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

امام طبرانی روایت کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! قرآن مجید میں ''حورعین'' کا تذکرہ ہے، اس کی تفسیر فرمائیے! آپ نے فرمایا: وہ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی اور ان کی اتنی گھنی پلکیں ہوں گی، میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! قرآن کی آیت كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ کی تفسیر بیان فرمائیں، آپ نے فرمایا! جیسے صدف میں موتی صاف اور شفاف ہوتا ہے، جس کو کسی نے چھوا تک نہ ہو، وہ اس طرح صاف اور غیر کے لمس اور مس سے پاک ہوں گی، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ کی تفسیر بیان فرمائیے! آپ نے فرمایا: ان کی جلد اس طرح ہوگی جیسے انڈے کے چھلکے کے اندر لپٹی ہوئی جھلی باریک ہوتی ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! دنیا کی عورتیں، آپ نے فرمایا: دنیا کی عورتیں ''حورعین'' سے اس طرح افضل ہوں گی، جس طرح ظاہر باطن سے افضل ہوتا ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فضیلت کا سبب؟ آپ نے فرمایا: اس فضیلت کا سبب ان کے روزے اور ان کی نمازیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں میں نور پیدا فرمادے گا، ان کا جسم ریشم کی طرح ہوگا، رنگ گورا ہوگا، کپڑے سبز ہوں گے، سنہرے زیورات ہوں گے، ان کی انگوٹھی موتی کی ہوگی، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، وہ کہیں گی: سنو! ہم دائمی ہیں، کبھی نہیں مریں گی، سنو! ہم ہمیشہ نعمت میں ہیں، کبھی مغموم نہیں ہوں گی، ہم قیام کرنے والیاں ہیں، کبھی سفر نہیں کریں گی، ہم خوش ہونے والیاں ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، اس کو مبارک ہو جس کے لئے ہم ہیں اور وہ ہمارے لئے ہے، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا! ہماری بعض عورتیں دنیا میں (یکے بعد دیگرے) دو خاوندوں سے نکاح کرتی ہیں، بعض تین سے اور بعض چار سے تو ایسی عورتیں جنت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: ام سلمہ! اس عورت کو اختیار دیا جائے گا، اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا ہوگا وہ اس کو اختیار کرے گی، وہ کہے گی: اے میرے رب! اس خاوند کا اخلاق سب سے اچھا تھا، میرا اس سے نکاح کردے، اے ام سلمہ! دنیا اور آخرت کی خیر اچھے اخلاق کے ساتھ وابستہ ہے''۔ (المعجم الکبیر، جلد ۲۳، صفحات ۳۸۷، ۳۸۶)

امام سیوطی بیان کرتے ہیں: امام احمد اور امام ترمذی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، ادنیٰ درجے کا جنتی شخص وہ ہوگا جس کی بہتر (72) بیویاں ہوں گی، دو دنیا کی

عورتیں ہوں گی اور ستر آخرت کی''۔ (درمنثور، ج۱، ص۳۹)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی صالحہ، عابدہ، زاہدہ، طیبہ و طاہرہ خواتین کو بھی اللہ تعالیٰ جنت میں شباب اور بے مثال حسن و جمال عطا فرمائے گا اور سب عالم شباب میں ہوں گی، وہ حورانِ جنت سے کم تر نہیں ہوں گی، بلکہ شاید برتر ہی ہوں گی، ایک روایت میں ہے کہ ایک بڑھیا خاتون نے حضور ﷺ سے التجا کی کہ میرے لئے جنت کی دعا فرمایئے! آپ کبھی کبھی مزاح لطیف بھی فرماتے تھے، آپ نے فرمایا: ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، یہ سن کر وہ عورت افسردہ ہوگئی تو اس کی تسلی خاطر کے لئے آپ نے فرمایا: ''جو خوش نصیب بھی جنت میں جائے گا، عالم شباب میں جائے گا''۔

یہ بھی ہوسکتا ہے، جن صالح مردوں اور عورتوں کی دنیا میں شادی نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے مردوں اور عورتوں کے مابین نکاح فرمادے، اگر خدانخواستہ کوئی بیوی جنتی ہے، مگر خاوند جہنمی یا اس کے برعکس، تو ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے جنتی مردوں اور عورتوں کے درمیان نکاح کے حکم فرمادے جن کا دنیوی رفیقِ حیات اپنی بداعمالیوں اور شقاوت کی وجہ سے جہنم میں جاچکا ہے، اللہ ہم سب کو ایسی صورتحال سے امان وعافیت عطا فرمائے۔

ایک مفسر مولانا مودودی نے یہ لکھا ہے کہ ممکن ہے یہی دنیا کی عورتیں، جو جنتی ہوں گی، جنت میں جاکر جمال و شباب بے مثال کی وجہ سے ''حورعین'' کی صورت میں ڈھل جائیں، لیکن جب ایسی روایات موجود ہیں جن میں جنت کی ''حورعین'' کے الگ وجود کی تصریح فرمادی گئی، تو ہمارے لیے کسی دلیل شرعی کے بغیر اس کے انکار یا گریز کا کوئی جواز نہیں ہے، جب کہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، صادق الوعد ہے تو اس کی قدرت و کرم سے کوئی بھی چیز بعید نہیں ہے۔

ناگہانی مصیبت کا نزول؟

سوال: اگر کسی کے گھر میں چوری یا ڈکیتی ہوجائے، یا آگ لگ جائے تو کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ ان کا تمام مال واسباب حرام کا تھا، یا یہ نظریہ غلط ہے؟ (محمد شاہد اعجاز۔ ناظم آباد، کراچی)

جواب: شریعت نے کوئی ایسا قاعدہ کلیہ نہیں بتایا کہ ہمیشہ کسی واقعے کا ظہور ایک ہی سبب کی بنا پر ہوگا۔ کسی ناگہانی مصیبت یا افتاد کے نازل ہونے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں اور اس کا قطعی علم

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہوتا ہے۔ ہم صرف اپنی دستیاب معلومات کے مطابق قیاس ہی کرسکتے ہیں۔ ہمیں قطعی سبب کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے، کسی بھی افتاد کی ممکنہ وجوہ حسب ذیل ہوسکتی ہیں:

ا) یہ کہ انسان کو کسی غلطی، جبر یا ظلم کی سزا مل رہی ہے، کیونکہ قدرت اپنی حکمت کے تحت کبھی مہلت دیتی ہے اور کبھی جلد مواخذہ فرمالیتی ہے۔

۲) یہ کہ اس ابتلاء وآزمائش میں انسان کے لئے خیر کا پہلو پوشیدہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مسلمان کو جو بھی تکلیف، دشواری، غم واندوہ، حزن وملال، حتیٰ کہ اسے کانٹا بھی اگر چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے عوض اس کے گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے (بشرطیکہ جزع وفزع نہ کرے، صبر واستقامت کا مظاہرہ کرے اور تقدیر الٰہی پر شاکی نہ ہو بلکہ راضی ہو)''

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)

(ب) حدیث قدسی میں اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: ''جب میں اپنے بندے کی دو محبوب چیزیں لے کر (یعنی اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی سلب کرکے) اسے مصیبت میں مبتلا کردیتا ہوں اور وہ اس (مصیبت) پر صبر کرتا ہے تو میں ان کے بدلے میں اسے جنت دے دیتا ہوں''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری)

(ج) ''جب بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی اس کے علم اور تقدیر میں) کوئی اعلیٰ مرتبہ پہلے سے مقدر ہوجاتا ہے، جس کا وہ اپنے عملِ صالح کے ذریعے حقدار نہیں بن پاتا تو اللہ تعالیٰ اسے جان، مال یا اولاد کی کسی مصیبت میں مبتلا فرمادیتا ہے۔ پھر وہ اس (ابتلاء) پر صبر کرتا ہے، یہاں تک کہ صبر واستقامت کے ذریعے اس مقام عالی کا حقدار بن جاتا ہے جو اللہ کے علم میں پہلے سے اس کے لئے مقدر ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داوٗد)

(د) ''جو لوگ دنیا میں عافیت وسلامتی کی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں، وہ جب قیامت کے دن اہل ابتلاء وآزمائش کے اجر کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش (دنیا میں) ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی)

۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی غلطی، تمرّد وسرکشی یا کسبِ حرام پر متنبہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس پر کوئی ناگہانی افتاد ڈال دی جاتی ہے تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور اپنی اس

(باغیانہ) روش یا دینی معاملات میں غفلت وتساہل سے باز آجائے، ایسے میں وہ افتاد یعنی جان و مال کا سلب ہوجانا، انسان کو اچھا تو نہیں لگتا لیکن انجامِ کار اس میں خیر ہوتی ہے، بشرطیکہ انسان اس ابتلاء سے سبق حاصل کرلے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ:۲۱۶)

''کوئی بعید نہیں کہ تم ایک چیز کو (ظاہرِ حال میں) اپنے لئے برا سمجھو لیکن وہ (حقیقتِ حال میں) تمہارے لئے خیر ہو''۔

امید ہے اس تفصیلی جواب سے آپ کی تسلی ہوجائے گی۔

انتقال کرنے والے خواب میں نظر آتے ہیں؟

سوال: انتقال کرنے والے خواب میں کیوں نظر آتے ہیں، میرے بعض مرحوم اقارب کھانا کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں، (مسز عائشہ بھومبل، دردانہ۔عزیز آباد)۔

جواب: اس کا ایک سبب تو نفسیاتی ہے کہ انسان کے ذہن میں جو اشخاص، افکار اور خیالات بکثرت تازہ رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی خواب میں بھی متشکل ہوکر آجاتے ہیں، بعض اوقات اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے محبت ہوتی ہے یا ان ارواح کو آپ سے محبت ہوتی ہے، کھانا کھاتے ہوئے نظر آنا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ ان کے لئے دعاء مغفرت کریں اور ہوسکے تو ان کے ایصالِ ثواب کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ و خیرات کریں، حدیث شریف میں ہے کہ اس سے عالمِ برزخ میں انہیں راحت ملتی ہے، اگر خدانخواستہ کسی اذیت وعذاب کی کیفیت سے دوچار ہوں تو اللہ تعالیٰ دعاء مغفرت و ایصالِ ثواب کی برکت سے تخفیف فرماتا ہے۔

''میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں''، کیا یہ کلمۂ کفر ہے؟

سوال: ''بکر نے زید سے کہا کہ آپ بادشاہ بننے والے ہیں''، تو زید نے کہا کہ: ''میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ میں بادشاہ بننے والا ہوں''، کیا یہ جملہ کلمۂ کفر ہے؟

(عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)

جواب: یہ کلمۂ کفر نہیں ہے، کیونکہ ہر فرشتے کے بارے میں علمِ غیب کلی کا اعتقاد شرعاً ثابت نہیں ہے، بالعموم فرشتے انہی امور کا علم رکھتے ہیں جو انہیں تفویض کئے جاتے ہیں، جیسے قبضِ ارواح اور ہر ذی روح کی اَجَل (یعنی موت کا وقت اور مقام) کا علم ''ملک الموت'' (فرشتۂ اجل) اور اس کے کارندوں کو ہے، قیامِ قیامت کا علم حضرت اسرافیل کو ہے، علیٰ ھذا القیاس وہ فرشتے جو بادلوں کو چلانے اور بارش برسانے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو رحمِ مادر میں جنین میں روح ڈالنے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو بندوں کے اعمال کا ریکارڈ لکھنے پر مامور ہیں وغیرہ، انہیں ''کراماً کاتبین'' (معزز لکھنے والے) کہا جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ

(الانفطار:۱۰۔۱۲)

''اور بیشک تم پر ضرور نگہبان (مقرر) ہیں، معزز (فرشتے) لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (ق:۱۸)

''وہ زبان سے کوئی بات نہیں کہتا، مگر اس کے پاس (اس کا) نگہبان لکھنے کے لئے تیار ہوتا ہے''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ وہ انسان کے قلبی واردات، وسوسوں، ذہن کے پوشیدہ گوشوں میں مچلنے والی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات اور سینوں میں پوشیدہ رازوں کو بھی جانتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق:۱۶)

''اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان وسوسوں کو (بھی) جانتے ہیں جو اس کا نفسِ امارہ (اس کے ذہن میں) ڈالتا رہتا ہے اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔

اور اشاد باری تعالیٰ ہے:

يَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ (المؤمن:۱۹)

''اللہ جانتا ہے خیانت کرنے والی نگاہوں کو اور جو (راز) سینوں میں پوشیدہ ہیں،

یعنی رب ذوالجلال کسی غیر محرم پر پڑنے والی اچانک بے اختیار نظر کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس مرحلے پر کسی شیطان صفت انسان کی نظر میں فریب نفس اور لذت شیطانی پیدا ہوئی اور وہ نفس انسانی میں پوشیدہ شرارتوں اور خباثتوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ہر فرشتے کے لئے ہر بات کا ہر حال میں جاننا ضروری نہیں ہے، اس سلسلے میں یہ حدیث پاک ملاحظہ فرمایئے:

عَنۡ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهَا قَالَتۡ: كَانَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ يُفَضِّلُ الصَّلٰوةَ الَّتِىۡ يُسۡتَاكُ لَهَا عَلَى الصَّلٰوةِ الَّتِىۡ لَا يُسۡتَاكُ لَهَا بِسَبۡعِيۡنَ ضِعۡفاً. وَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ: يَفۡضُلُ الذِّكۡرُ الۡخَفِىُّ عَلَى الَّذِىۡ لَا يَسۡمَعُ الۡحَفَظَةُ بِسَبۡعِيۡنَ ضِعۡفاً، وَيَقُوۡلُ: اِذَا كَانَ يَوۡمُ الۡقِيٰمَةِ وَجَمَعَ اللّٰهُ الۡخَلَآئِقَ لِحِسَابِهِمۡ، وَجَآءَتِ الۡحَفَظَةُ بِمَا حَفِظُوۡا وَكَتَبُوۡا، قَالَ اللّٰهُ لَهُمۡ: اُنۡظُرُوۡا، هَلۡ بَقِىَ لَهٗ مِنۡ شَىۡءٍ؟ فَيَقُوۡلُوۡنَ: رَبَّنَا مَا تَرَكۡنَا شَيۡئًا مِمَّا عَلِمۡنَاهُ وَحَفِظۡنَاهُ اِلَّا وَقَدۡ اَحۡصَيۡنَاهُ وَكَتَبۡنَاهُ، فَيَقُوۡلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى لَهٗ: اِنَّ لَكَ عِنۡدَنَا خَبِيۡئًا لَا تَعۡلَمُهٗ، وَاَنَا اُجۡزِيۡكَ [اُحَدِّثُكَ] بِهٖ وَهُوَ الذِّكۡرُ الۡخَفِىُّ.

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ جس نماز کے لئے (وضو کے وقت) مسواک کی گئی ہو، اسے اس نماز پر ستر درجے فضیلت عطا فرماتے تھے، جس کے لئے مسواک نہ کی گئی ہو'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ذکر خفی جسے نگہبان فرشتے (بھی) نہیں سن سکتے، ستر درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے'' اور آپ فرماتے تھے: ''جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان کے حساب کے لئے جمع فرمائے گا، اور نگہبان فرشتے (وہ سارا ریکارڈ لے کر)، جو انہوں نے محفوظ رکھا ہوگا اور لکھا ہوگا، حاضر ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا: (اچھی طرح) دیکھ لو، کیا اس

کے (اعمال حسنہ میں) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی، تو وہ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایسی کوئی چیز، جسے ہم جانتے تھے اور ہم نے اسے (ریکارڈ میں) محفوظ کر رکھا ہے، نہیں چھوڑی مگر ہم نے اس کا احاطہ کرلیا ہے اور لکھ دیا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے فرمائے گا: ہمارے پاس تمہارے لئے ایک پوشیدہ چیز ہے، جسے تم نہیں جانتے اور اب میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں (یا تمہیں اس کے علم کی اجازت دیتا ہوں) اور وہ میرے بندہ کا ''ذکر خفی'' ہے''۔

(مختصر اتحاف السادۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ، کتاب الاذکار رقم الحدیث:۶۸۰۹، اس حدیث کو حارث، ابو یعلیٰ، احمد بن حنبل، بزار، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط مسلم پر صحیح ہے)''۔

علامہ غلام رسول سعیدی ''تبیان القرآن'' جلد نمبر ۳ ص ۵۰۷۔۵۰۸ پر لکھتے ہیں:

آیا دل کی باتوں کو کراما کاتبین لکھتے ہیں یا نہیں؟

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''جب میرا بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ لو، اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ لو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھ لو'' امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ایک روایت اس طرح کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''فرشتے عرض کرتے ہیں اے رب! تیرا بندہ گناہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے، حالانکہ اسے گناہ پر خوب بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا انتظار کرو، اگر یہ اس گناہ کو کرے تو اس کا گناہ لکھ لو اور اگر اس کو ترک کردے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو، کیونکہ اس نے میری وجہ سے اس گناہ کو ترک کیا ہے۔'' (صحیح مسلم، ایمان، ۲۰۵، ۲۰۳، (۱۲۸) ۳۲۷/صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۵۰۱/سنن ترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۸۴/سنن کبریٰ للنسائی، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۱۸۱/صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۰/مسند احمد، ج ۳، رقم

الحدیث:۷۳۰۰)۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کے احوال اور نیات پر مطلع نہیں ہوتے۔

امام عبداللہ بن محمد ابوالشیخ الاصبہانی المتوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں:

''ضمرہ بن حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''فرشتے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے عمل لے کر اوپر چڑھتے ہیں، اس عمل کو وہ بہت زیادہ اور بہت بابرکت گمان کرتے ہیں، وہ اللہ کی سلطنت میں جہاں تک اللہ چاہتا ہے، اس عمل کو لے کر پہنچتے ہیں۔ اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرماتا ہے تم میرے بندے کے عمل کی حفاظت کرنے والے ہو، اور میں اس کے دل کی نگہبانی کرنے والا ہوں۔ میرے اس بندہ نے یہ عمل میرے لیے اخلاص سے نہیں کیا، اس کو سجین (جہنم کی ایک وادی) میں ڈال دو۔ اور وہ اللہ عزوجل کے بندوں میں سے ایک اور بندے کے عمل کو لے کر اوپر چڑھیں گے، اور اس عمل کو بہت کم گمان کریں گے۔ پھر وہ اللہ کی سلطنت میں سے جہاں تک اللہ چاہے گا، اس عمل کو لے کر پہنچیں گے۔ پھر اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرمائے گا تم حفاظت کرنے والے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہے، میں اس پر نگہبان ہوں۔ اس کے اس عمل کو دگنا چوگنا کردو اور اس کو علیین میں ڈال دو'' (کتاب العظمۃ، رقم الحدیث: ۵۲۲، ص ۱۸۵، مطبوعہ بیروت/ کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث: ۴۵۲، مطبوعہ بیروت)

امام ابن المبارکؒ کی روایت میں ہے ''میرے اس بندے نے اخلاص سے عمل کیا ہے، اس کو علیین میں لکھ دو''۔

بظاہر ان حدیثوں میں تعارض ہے، لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن حبان اور سنن ترمذی اور سنن نسائی کی روایت ہے اور جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتے، وہ کتاب العظمۃ اور کتاب الزہد کی روایت ہے، اور ثانی الذکر کتابیں اول الذکر کتابوں کے پائے کی نہیں ہیں۔ نیز اول الذکر حدیث متصل ہے اور ثانی الذکر مرسل روایت ہے، اور اول الذکر سنداً صحیح ہے اور ثانی الذکر سنداً ضعیف ہے۔ اس لئے ترجیح پہلی

حدیث کو ہے اور راجح یہی ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر بھی مطلع ہوتے ہیں اور مؤخر روایت کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ریا اور اخلاص کو مستثنیٰ فرمایا ہے، اخلاص کو مخفی رکھا، تاکہ قیامت کے دن اس بندے کی عزت افزائی کی جائے، اور ریا کو مخفی رکھا، تاکہ ریاکار کے عمل کی قیامت کے دن زیادہ رسوائی ہو، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

البتہ احادیث مبارکہ، روایات اور احوال سیرت النبی ﷺ میں متعدد واقعات مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے بارہا لوگوں کے احوال قلبی اور وارداتِ قلبی کو ان کے بتانے سے پہلے بتادیا۔ ''اس بات کا میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے۔'' یہ اردو زبان کا محاورہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات میرے خواب وخیال میں بھی نہیں آئی یا اس بات کی بابت میں نے کبھی سوچا تک نہیں۔ یعنی اگر میں نے ایسا سوچا ہوتا یا اس کی منصوبہ بندی کی ہوتی تو فرشتوں یا ''کراماً کاتبین'' کو علم ہوتا، اس سے معاذ اللہ، فرشتوں کی توہین یا تنقیص مقصود نہیں ہوتی کہ اسے کفر یا ضلالت یا فسق پر محمول کیا جائے۔

انبیاءِ کرام کی تعداد کتنی ہے؟

سوال: انبیاء کرام کی تعداد کتنی ہے، دلیل اور حوالے کے ساتھ بتایئے؟

(مولانا علی عمران صدیقی، اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب: قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر ۱۶۳ میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''(اے حبیب!) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف وحی (نازل) فرمائی، جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔'' اس کے بعد اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ

(النساء:۱۶۴)

"اور ہم نے ایسے رسول (بھیجے) جن کا قصہ ہم نے اس سے پہلے آپ کو بیان فرمایا اور ہم نے ایسے رسول بھی بھیجے جن کا قصہ ہم نے آپ سے (ابھی تک) بیان نہیں کیا"۔

بعینہٖ اسی مفہوم کی آیت سورۃ المومن میں بھی موجود ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن:۷۸)

"اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرما دیا ہے اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر (ابھی تک) بیان نہیں فرمایا"۔

سارے انبیاء کرام و رسلِ عظام علیہم السلام کے اسماء مبارکہ اور احوال قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں، تاہم جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، ان کے اسماء مبارکہ یہ ہیں:

۱۔حضرت آدم علیہ السلام، ۲۔حضرت نوح علیہ السلام، ۳۔حضرت ابراہیم علیہ السلام، ۴۔حضرت اسماعیل علیہ السلام، ۵۔حضرت اسحاق علیہ السلام، ۶۔حضرت یعقوب علیہ السلام، ۷۔حضرت یوسف علیہ السلام، ۸۔حضرت موسیٰ علیہ السلام، ۹۔حضرت ہارون علیہ السلام، ۱۰۔حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، ۱۲۔حضرت ہود علیہ السلام، ۱۳۔حضرت داؤد علیہ السلام، ۱۴۔حضرت سلیمان علیہ السلام، ۱۵۔حضرت ایوب علیہ السلام، ۱۶۔حضرت الیاس علیہ السلام، ۱۷۔حضرت الیسع علیہ السلام، ۱۸۔حضرت یحییٰ علیہ السلام، ۱۹۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ۲۰۔حضرت یونس علیہ السلام، ۲۱۔حضرت ادریس علیہ السلام، ۲۲۔حضرت ذوالکفل علیہ السلام، ۲۳۔حضرت صالح علیہ السلام، اور ۲۴۔حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کے علاوہ سورۃ الکہف میں حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے لیکن ان کا نام مذکور نہیں ہے، ان کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ وہ نبی تھے اور دوسرا یہ کہ وہ نبی نہیں تھے لیکن راجح قول یہی ہے کہ وہ نبی تھے، اسی طرح حضرت لقمان کے بارے میں بھی دو قول ہیں لیکن قولِ راجح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ حکیم و دانا تھے۔

باقی رہا یہ سوال کہ انبیاء کرام کی کل تعداد کتنی ہے تو اس سلسلے میں مسند امام احمد بن حنبل میں ایک طویل حدیث مذکور ہے۔ جس میں آگے چل کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قال: قلت یا رسول اللّٰہ! کم وَفیٰ عِدَّۃُ الانبیاء؟ قال: مائۃ الف و اربعۃ و عشرون الفا، الرسل من ذالک ثلث مائہ و خمسۃ عشر جما غفیراً

"(حضرت ابوذر) بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! انبیاء کرام کی گنتی کتنی پوری ہوئی؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں سے رسول تین سو پندرہ کا جم غفیر (بڑی جماعت) ہے"۔ (مسند امام احمد، رقم الحدیث:۲۲۱۸۹)

علامہ غلام رسول سعیدی نے تبیان القرآن جلد اول صفحہ ۶۱۹ پر "نبیوں، رسولوں اور صحیفوں کی تعداد کی تحقیق کے عنوان کے تحت اس موضوع پر متعدد روایات با حوالہ جمع کی ہیں، جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! رسول کتنے ہیں آپ نے فرمایا تین سو تیرہ جم غفیر ہیں، میں نے کہا بہت اچھے ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ! پہلا نبی کون ہے؟ آپ نے فرمایا آدم، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ نبی مرسل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ان میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی پھر ان کو اپنے سامنے بنایا، پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! چار نبی سریانی ہیں آدم، شیث، اور اخنوخ، یہ ادریس ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے خط کھینچا اور نوح، اور چار نبی عرب ہیں: ہود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی، اے ابوذر! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل کیں، آپ نے فرمایا سو صحیفے اور چار کتابیں، شیث پر پچاس صحیفے نازل کیے گئے، اخنوخ پر تیس صحیفے نازل کیے گئے، ابراہیم پر دس صحیفے نازل کیے گئے اور موسیٰ پر تورات سے پہلے دس صحیفے نازل کیے گئے اور تورات، انجیل، زبور اور فرقان کو نازل کیا گیا"۔

(حلیۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۱۶۷، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس حدیث کو امام ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے"۔ (موارد الظمآن، ص ۵۴-۵۲، مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ بیروت)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بعض روایات میں رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ مذکور ہے اور بعض

میں تین سو پندرہ ہے۔ اگرچہ اکثر روایات میں انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار مذکور ہے اور ہم ان احادیث کی روشنی میں اس تعداد کا بطور تعیین ذکر کرسکتے ہیں، لیکن افضل و اولیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس قرآن مجید کی اتباع کرتے ہوئے ہم اجمالاً اپنے عقیدے کو اس طرح بیان کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں اپنے جن برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب برحق تھے اور ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تعداد کی تعیین کے مکلف نہیں ہیں، کیونکہ روایات و احادیث کی روشنی میں تعداد متعین کرلی جائے تو ان سب کے اسماء مبارکہ تو پھر بھی ہمارے علم میں متعین نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ (البقرہ:۲۸۶)

"رسول مکرم ایمان لائے اس کلام پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومن (بھی ایمان لائے)، سب (کے سب) ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (یہ اقرار کرتے ہوئے) کہ ہم (ایمان لانے میں) اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے (کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کردیں)"۔

قیامت کے دن کس کی نسبت سے پکارا جائے گا؟

سوال: ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ جب قیامت کے دن میدانِ حشر میں پکار ہوگی تو انسان کو کس نام کے ساتھ پکارا جائے گا؟ اپنی والدہ کے نام سے یا اپنے والد کے نام سے پکارا جائے گا۔ ہمیں قرآن مجید اور حدیث پاک کی روشنی میں اس کا جواب چاہیے؟

(محمد اختر......کراچی)

جواب: قرآن مجید کی کسی آیت میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا، البتہ قرآن مجید کی اس آیت کے تحت مفسرین کرام نے اس مسئلے پر گفتگو فرمائی ہے:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (الاسراء:۷۱)

"جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ہمراہ بلائیں گے"۔

اس آیت مبارکہ کا واضح معنی تو یہ ہے کہ قیامت میں لوگوں کو ان پیشواؤں کے ہمراہ حساب و کتاب اور سوال و جواب کے لئے بلایا جائے گا۔ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کے ہمراہ بارگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوں گے، اور ائمہ کے ہمراہ ان کے پیروکاروں کو طلب کیا جائے گا۔ چنانچہ جو گمراہ اور باطل پرست لوگ ہیں، وہ اپنی عذرخواہی اس انداز میں کریں گے:

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۞ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (الاحزاب:۶۸۔۶۷)

"اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کی، تو انہوں نے ہمیں راہ (راست) سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں (ہمارے مقابلے میں) دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی بھاری لعنت فرما"۔

تاہم بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں لفظ "امام" کو امّ (بمعنی ماں) کی جمع قرار دے کر ایک نئے انداز سے اس کی تفسیر کی ہے، ذیل میں ہم چند تفاسیر کے حوالہ جات درج کررہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر کا یہ نیا انداز سب سے پہلے علامہ زمخشری صاحب "تفسیر کشاف" نے اختیار کیا ہے۔

نئے انداز کی تفسیر یہ ہے کہ "امام" "ام" (بمعنی ماں) کی جمع ہے اور یہ کہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا اور (باپوں کے بجائے) ماؤں کے نام کے ساتھ پکارنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی پاسداری ہوجائے اور حضرت حسن و حسین کا شرف ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ کہ جو لوگ "ولد الزنا" ہیں، ان کی (سرعام) رسوائی نہ ہو"۔ (تفسیر الکشاف، ج ۲ ص ۶۳۷ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ زمخشری کی اس تفسیر کا حوالہ علامہ آلوسی حنفی بغدادی نے بھی دیا ہے، لیکن پھر اسے دلائل سے رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"صاحب تفسیر کشاف نے محمد بن کعب سے اسے روایت کیا ہے اور اس تفسیر کے قابل قبول نہ ہونے کے دلائل یہ ہیں: اولاً، اس لئے کہ "امّ" کی جمع امام غیر معروف ہے اور اس کی معروف جمع "امہات" ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی رعایت تو اس میں ہے کہ انہیں "شانِ امتیازی" کے طور پر ماں کے نام سے پکارا جائے (یعنی سب کو اگر ماں کے نام سے پکارا

جائے تو اس میں ان کا امتیاز کہاں رہے گا؟)، کیونکہ باپ کے بغیر ان کی پیدائش ان کے لئے باعثِ کرامت وافتخار ہے (کیونکہ یہ ایک معجزہ ہے)، تو اس افتخار کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس سے چشم پوشی کی کہ اس بنا پر مجبوراً سب کو ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے، اور حضرات حسنین کریمین کا شرف تو ویسے ہی کامل دائم ہے، کیونکہ ان کے باپ کا مرتبہ ان کی ماں سے زیادہ ہے، اور رہے ''اولاد الزنا'' تو اس میں ان کا تو کوئی گناہ نہیں ہے جو ان کے لئے باعثِ رسوائی ہو، رسوائی تو ان کی ماؤں کے لئے ہے (اور یہ قائم رہتی ہے) خواہ دوسروں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے یا ان کے باپوں کے نام سے''۔

اس کے بعد علامہ آلوسی نے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے، جس میں اس امر کو تو تسلیم کیا ہے۔ کہ ''امّ'' کی جمع امام معروف نہیں ہے، لیکن حضرات حسنین کریمین کی نسبت ماں کی طرف کرنے سے ان کی نسبی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہونا، بہت بڑا شرف ہے۔ اس طرح ''اولاد الزنا'' کے رسوائی سے بچنے کی بھی تاویل کی ہے کہ ماں کی نسبت تو دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم تھی، لیکن باپ کی نسبت معلوم ہونے پر رسوائی ہوگی۔ لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے ''صاحب کشاف'' کا موقف کسی روایت پر مبنی ہو، لیکن وہ حدیثِ صحیح کے معارض ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا''۔ (روح المعانی، ج۹، ص۱۷۶-۱۷۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت)

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی مالکی حکماء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ''اور امام، امّ کی جمع ہے، حکماء نے کہا ہے اس میں تین حکمتیں ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کے سبب، دوسری حضرات حسنین کریمین کے شرف کا اظہار اور تیسرا یہ کہ اولاد الزنا کی رسوائی نہ ہو۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ قول محلِ نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ اولین وآخرین کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا، تو ہر بدعہد کے لئے ایک (علامتی) جھنڈا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی (کا نشان) ہے، یہ حدیث متفق علیہ ہے، اس حدیث میں ''فلاں بن فلاں'' کے الفاظ ہیں نہ کہ ''فلاں بن فلانہ'' کے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت میں لوگوں کو ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا اور یہ ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی

نسبت سے پکارا جائے گا''۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج۵، ص۲۶۷)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قیامت کے دن ماؤں کے ناموں کے ساتھ پکارے جانے کے قول کو ان کی تمام تر عقلی توجیہات اور فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود جلیل القدر مفسرین کرام علامہ محمود آلوسی اور علامہ قرطبی مالکی نے حدیث صحیح سے معارض ہونے کی بنا پر رد کیا ہے اور حدیث صحیح کو عقلی توجیہات پر ترجیح ہے۔

حدیث پاک میں ہے: حضرت ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔ (مشکوٰۃ ص۴۰۸)

اس حدیث کے تحت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ المصابیح میں لکھتے ہیں: ''بعض روایات میں آیا ہے کہ روز قیامت لوگوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا اور اس کی حکمت یہ بیان کی کہ اولادِ زنا کو شرمساری نہ ہو اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے حال کی رعایت کہ اللہ نے ان کو بن باپ کے پیدا کیا اور حضرات حسنین کی شرافتِ نسبت کے اظہار کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت کا اظہار ہو، اگر یہ روایت پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو حدیث کی توجیہ کی جائے کہ لفظ ''آباء'' تغلیب کے طور پر آیا ہے (جیسے حکم تو مرد وزن سب کے لئے ہوتا ہے لیکن صیغہ مذکر کا آتا ہے) جیسے ماں باپ دونوں کو ''اَبَوَیْن'' کہا جاتا ہے، اور کبھی آباء کہا جاتا ہے، اور کبھی امہات، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعض کو باپوں کے ناموں سے پکارا جائے اور بعض لوگوں کو ماؤں کے ناموں سے، یا بعض مواقع پر ماؤں کے ناموں سے اور بعض مواقع پر باپوں کے ناموں سے، واللہ اعلم، (اشعۃ اللمعات، ج۴، ص۵۰ مطبوعہ لکھنو)''۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تاویلات وتوجیہات اس پر موقوف ہیں کہ ماں کے نام سے پکارے جانے کی روایت صحیح ہو۔ اسی حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے، جیسے کہ ابن قیم نے سنن ابی داؤد کے حاشیے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بعض بندوں کی پردہ داری کے لئے ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا، علقمی نے کہا ہے کہ دونوں روایات میں تطبیق اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ صحیح النسب لوگوں کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا، اور سنن ابی داؤد کی روایت اسی سے متعلق

ہے، اور طبرانی کی حدیث دوسروں سے متعلق ہے، یا یہ کہ بعض کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا اور بعض کو ماں کے نام سے۔

تفہیم المسائل جلد اول میں ہم نے ''حدیثِ صحیح'' ہی کو راجح قرار دیا تھا اور اب بھی ہمارا موقف یہی ہے، تاہم دیگر روایات، اقوال، توجیہات اور تاویلات بھی درج کر دی ہیں۔

واللہ ورسولہ اعلم بالصواب

مسلکی اختلافات سے ذہنی اضطراب

سوال: ہمارے ملک میں، جو مسلمانوں کا ملک ہے، کئی مسالک اور مذہبی مکاتبِ فکر (Schools of Thought) پائے جاتے ہیں، ہر ایک نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے، ہر ایک اپنے آپ کو حق اور دوسرے کو باطل سمجھتا ہے، خالص دینِ اسلام کی دعوت دینے والا کوئی نہیں، فقط طرف مسالک کی طرف دعوت دی جاتی ہے، ایسے حالات میں عام آدمی کیا کرے؟ سادہ لوح بندے کدھر جائیں؟، کوئی غیر مسلم اسلام سے متاثر ہو تو کیا کرے؟۔ ان حقائق و واقعات پر غور کرتے ہیں تو شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ازراہِ کرم بتایئے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ (عبداللہ شیخ پی ای سی ایچ ایس اور متعدد دوسرے افراد)۔

جواب: میں نے آپ سب حضرات کے مفصل خطوط کو کافی غور اور توجہ سے پڑھا ہے۔ اس مفہوم پر مشتمل گفتگو اکثر محافل میں ہوتی ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے والے لوگ اکثر پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو تلاشِ حق میں سرگرداں ہے، یہ لوگ حق کو جاننے، اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہیں، ان کا ذہنی اضطراب اور تلاشِ حق کے لئے بے قراری لائقِ تحسین ہے، ان کا جذبہ قابلِ قدر ہے اور وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کے حقدار ہوں گے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو شرحِ صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور بین المسالک مسلکی تصادم نے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ رہا ہے، غلبۂ اسلام کی جد و جہد نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی اور اس سے لادینی قوتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور مسلکی تصادم کو مذہب سے گریز اور انحراف

کے لئے ایک بہانہ اور وجہِ جواز (Justification) بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ اور طرزِ فکر قابلِ مذمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ تاہم نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے، ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم شخصی طور پر کسی کے بارے میں بدگمانی کریں۔ لہٰذا ہر ایک کو اپنی علمی استعداد اور فکری استطاعت کے مطابق مطمئن کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

سوچ اور فکر کا اختلاف (Approach) اور اختلافِ رائے انسان کی فطرت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی، صناعی اور قدرت ہے کہ اس نے انسانوں کی صورتوں کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان میں بھی بڑا تنوع (Variety And variation) پیدا فرمایا ہے۔ آپ کو ایسے دو انسان بہت کم ملیں گے یا شاید بالکل نہ ملیں، جن کی ذہنی سوچ ہر چیز کے بارے میں یکساں ہو۔ لہٰذا اختلافِ فکر و نظر آپ کو حیاتِ اجتماعی کے ہر شعبے میں نظر آئے گا۔ کسی مقدمے کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے اور قطعی فیصلے تک پہنچنے میں آئین کی تعبیر و تشریح (Interpretation) اور قوانین کے اطلاق (Application) میں اعلیٰ عدالتوں کے ججوں میں اختلاف ہوتا ہے، حالانکہ مقدمے کے حقائق و واقعات ان سب کے سامنے یکساں طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح قوانین کی تعبیر و تشریح میں ماہرینِ قانون کے درمیان اختلافِ رائے ہوتا ہے۔ مرض کی تشخیص (Diagnosis) میں ماہر ڈاکٹروں کے درمیان بعض اوقات اختلافِ رائے ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاست، معیشت اور حیاتِ انسانی کے دیگر شعبوں میں بھی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان تمام شعبوں کی بساط کار لپیٹ دی جائے یا ڈاکٹرز سے علاج کرانا چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اختلافات ہیں اور بندہ کس کی سنے اور کدھر جائے۔ اس کے برعکس ہر عقلمند انسان اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بہتر سے بہتر کی جستجو جاری رکھتا ہے، اندھی تقلید (Blind Faith) کسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا مذہب کے معاملے میں بھی ہمیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے حق و صواب کو سمجھنے اور پانے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس امر کا اہتمام کرنا چاہئے کہ اسلام کے بنیادی معتقدات سے روگردانی نہ ہونے پائے۔ اختلافات تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں، خواہ وہ الہامی مذاہب (Revealed Religion) ہوں یا انسانوں کے خود ساختہ مذاہب ہوں، مثلاً یہودیت، مسیحیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ۔

لہٰذا اولاً تو ہم میں سے ہر ایک کو اس امر کی آگاہی ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور

اصول ونظریات کیا ہیں؟ اور پھر یہ جاننا ہوگا کہ کون سا مسلک یا مکتبۂ فکر کتاب وسنت کے عین مطابق ہے کہ جس میں توحید، ناموسِ الوہیت وناموسِ رسالت وعقیدۂ ختمِ نبوت کی مکمل پاسداری ہو، جو رسالت مآب ﷺ، اصحابِ رسول اور ان کے اتباع سلفِ صالحین، ائمہ مجتہدین، اولیاء کرام اور علماءِ ربانیین کے طریق پر ہو۔ کیونکہ ہم ہر نماز میں سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں: ''(اے اللہ!) ہمیں سیدھی راہ پر چلا، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے''۔

پھر قرآن مجید نے دوسرے مقام اپنے ان انعام یافتہ بندوں، جن کی حیات کو ہمارے لئے مشعلِ راہ قرار دیا ہے، کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمادی: ''اور جس نے اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو وہ لوگ (حشر میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی جو اس کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور عباد صالحین ہیں''۔

اور اللہ تعالیٰ نے حق وباطل، صواب وخطاء، نور وظلمت اور خیر وشر میں تمیز کا ملکہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''کیا ہم نے انسان کو (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں (بولنے کے لئے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور ہم نے اسے (خیر وشر کی) دونوں راہوں کو سجھا دیا ہے، (البلد: ۱۰۔۸)''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''انسان اپنی ذات پر کامل بصیرت کے ساتھ (شاہد) ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (القیامہ)''۔ جب انسان تلاشِ حق (In Search of Truth) میں آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نورِ ہدایت اس کی رہنمائی فرماتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بھلا اللہ تعالیٰ جس کے سینے کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دے، تو وہ اپنے رب کی جانب سے ایک (عظیم) نور (معرفت) سے فیض یاب ہوتا ہے، (الزمر: 22)''۔

رسول اللہ ﷺ نے مستقبل کی خبر دیتے ہوئے پہلے ہی ہماری رہنمائی فرمادی تھی کہ جب مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ جائیں تو صرف وہ گروہ ہدایت یافتہ اور حق وصواب پر ہوگا جو: ''اس جادۂ مستقیم پر (سختی سے) کاربند ہو، جس پر میں اور میرے اصحاب (ہمیشہ) کاربند رہے ہیں۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا دستِ (تائید وحمایت) جماعت پر ہوتا ہے۔'' اس لئے فرمایا: ''جماعت (کی اتباع) کو لازم پکڑو، کیونکہ جو بکری ریوڑ سے جدا ہو کر دور چلی جاتی ہے

یا ایک جانب کو ہو جاتی ہے اسے بھیڑیا شکار کر لیتا ہے۔'' یہ بھیڑیا، یہ دشمنِ ایمان، شیطان ہے۔ اور خود اللہ جل شانہٗ کا فرمان ہے:

''جو شخص مومنوں کی (اجماعی راہ کو چھوڑ کر) کسی دوسری راہ کو اختیار کرے گا، ہم اسے اسی رخ پر پھیر دیں گے، جسے اس نے (از خود) اختیار کر لیا ہے اور اسے ہم جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے، (النساء: 115)''

☆......☆......☆

كتاب الطهارت

محض خواب دیکھنے پر غسل کا وجوب؟

سوال: ایک شخص مباشرت کا خواب دیکھتا ہے لیکن جب صبح بیدار ہو کر اٹھتا ہے تو اس کے بدن یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہیں ہوتا تو کیا محض خواب دیکھنے سے اس پر غسل جنابت فرض ہو جاتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: محض احتلام کا خواب دیکھنے پر، جبکہ بیدار ہونے پر اس کے جسم پر یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہ ہو، اس پر غسل جنابت فرض نہیں ہوتا اور وہ شرعاً پاک ہے۔

ناپاک بدن پر پاک کپڑے

سوال: ایک شخص جس پر غسل جنابت فرض ہے، وہ کسی ضروری کام کی بنا پر غسل کئے بغیر پاک کپڑے پہن لیتا ہے، تو کیا محض حالتِ جنابت میں پہننے سے پاک کپڑا ناپاک ہو گیا یا بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اسی لباس کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: پاک کپڑا محض حالتِ جنابت میں پہننے سے ناپاک نہیں ہوتا، وہ بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اور دوبارہ وہی لباس پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ انسان کا پسینہ بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا حالتِ جنابت میں کسی کو پسینہ آ گیا اور پاک کپڑا بدن سے مس ہو گیا تو ناپاک نہیں ہوگا۔ اسی طرح بیوی یا شوہر میں سے کوئی ایک ناپاک ہے اور دوسرے کا بدن اس سے مس ہو گیا تو وہ اس سے ناپاک نہیں ہوگا البتہ اگر بدن پر منی یا خون کا دھبہ ہے اور پاک کپڑا پہن لیا ہے اور پسینہ آنے سے وہ ناپاکی کپڑے پر لگ گئی تو کپڑے کے اس حصے کو دھو کر پاک کر لیں، باقی لباس پاک رہے گا۔

ناپاک کپڑا پہننے سے کیا بدن ناپاک ہو جاتا ہے؟

سوال: ایک شخص کے کپڑوں پر پیشاب یا کوئی اور ناپاکی (مثلاً پاخانہ وغیرہ) لگ جاتا ہے اور وہ اس کے جسم کے کسی حصے پر نہیں لگتا، تو وہ شخص اگر باوضو ہے تو ناپاک کپڑے اتار کر اور پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟ (مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: محض ناپاک کپڑا پہننے سے بدن ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ نجاست بدن پر نہ لگے۔ البتہ

ZQ-6 تفہیم المسائل دوم

اگر نجاست مرطوب ہونے کی بناء پر بدن پر لگ جاتی ہے یا بدن کسی وجہ سے پانی یا پسینے سے تر ہوگیا اور وہ نجاست اس پر لگ گئی تو اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، صرف اس ناپاک جگہ کو دھولے، وضو بدستور قائم رہے گا۔

جلد سے جڑے ہوئے مصنوعی بالوں کی طہارت کا مسئلہ؟

سوال: آج کل جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مستقل بنیادوں پر جو مصنوعی بال لگائے جا رہے ہیں کیا ایسے بال لگوا کر طہارت حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ ان بالوں کو جلد کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ دیا جاتا ہے؟ (شمیم یاسر۔شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: اگر یہ بال جلد کے ساتھ جڑ گئے ہیں یعنی انہیں ظاہراً اگی ہوئی شکل یا مستقل پیوستگی کی شکل میں کر دیا گیا ہے تو وہ اصل بالوں ہی کے حکم میں ہوں گے بشرطیکہ وہ بال کسی ناپاک اور حرام چیز سے نہ بنائے گئے ہوں یا کسی حرام جانور کے نہ ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں ان کے ہوتے ہوئے طہارت ممکن ہی نہیں رہے گی اس لئے کہ جو چیز اصلاً ناپاک ہوا سے دھوکر پاک نہیں کیا جاسکتا۔ دھونے سے صرف وہ چیز پاک ہوسکتی ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے پاک ہو لیکن اس کو حقیقی، حکمی یا مصنوعی نجاست لاحق ہوئی ہو۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اگر مصنوعی بال فی نفسہ پاک ہوں تو وہ اصل بالوں کے حکم میں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جن مواقع پر اصل بالوں کے لئے مسح کافی ہے، وہاں ان پر بھی مسح کافی ہوگا اور جہاں اصلی بالوں کو دھونا اور ان کی جڑوں تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے وہاں ان کا بھی وہی حکم ہوگا۔

حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہ کو غسل دینا (وضاحتی نوٹ)

میں نے کامران قریشی کے استفسار پر، شوہر کے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینے کے مسئلے پر، ایک مقامی اخبار میں شائع شدہ اور ایک مفتی صاحب سے منسوب ایک فقہی مسئلے کی تصحیح کی تھی، جو جمعہ ۱۵ ستمبر کی اشاعت میں آچکی ہے۔ ہمارے ایک اور قاری سید عمیر الحسن برنی، جو ماشاء اللہ دینی مسائل کا ذوق رکھتے ہیں، کے توجہ دلانے پر اس مسئلے کی مکمل تشریح و توضیح کے لئے یہ سطور درج کی جا رہی ہیں۔ یہ ساری تفصیل فتاویٰ شامی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت جلد نمبر ۳ ص ۸۵ سے ماخوذ ہیں۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

"شوہر کے لئے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینا اور چھونا منع ہے، صحیح ترین قول کے مطابق دیکھنا منع نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ حضرت علی نے بی بی فاطمہ کو غسل دیا تھا، ہم جواباً کہتے ہیں کہ حضرت علی کا غسل دینا اس پر محمول ہے کہ ان کا بی بی فاطمہ کے ساتھ رشتۂ زوجیت بعداز وفات بھی قائم تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "رشتۂ نکاح اور رشتہ نسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے میرے رشتۂ نکاح اور میرے رشتہ نسب کے"۔ حالانکہ بعض صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ (نوٹ اس روایت کو حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے (۳/۱۴۲) اور علامہ ذہبی نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسے منقطع کہا ہے۔)

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے کی ممانعت سے البحر الرائق کی اس عبارت کی طرف اشارہ ہے کہ غاسل کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کے لئے مغسول (جسے غسل دیا جائے) کی طرف دیکھنا جائز ہو، یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کو غسل نہیں دے سکتے، اور عنقریب یہ مسئلہ آئے گا کہ مرد کا انتقال ہو جائے اور صرف عورتیں ہوں یا عورت کا انتقال ہو جائے اور صرف مرد ہوں تو کیا کریں؟ ظاہر یہ ہے کہ غاسل کے لئے مغسول کو دیکھنے کے جواز کا مسئلہ غسل کے وجوب یا جواز کے لئے شرط ہے، صحت غسل کے لئے نہیں۔ "شوہر کے لئے بیوی کی میت کو دیکھنا منع نہیں ہے"۔ "منحہ" میں اس قول کو "القنیہ" کی طرف منسوب کیا ہے اور فتاویٰ خانیہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ اگر مردہ عورت کا محرم مرد ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے تیمم کرائے اور اگر اجنبی مرد ہے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے اور نگاہیں اس کے بازوؤں پر نہ ڈالے، اسی طرح شوہر اپنی بیوی کو تیمم کرائے مگر اس کے لئے نگاہیں نیچے رکھنے کی پابندی نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چھونے سے دیکھنا کم تر چیز ہے۔ ہم کہتے ہیں "شرح المجمع" کے مصنف نے کہا ہے (درحقیقت) حضرت فاطمہ کو ان کی دائی ام ایمن نے غسل دیا تھا۔ حضرت علی کے غسل دینے کی روایت اس پر محمول ہے کہ انہوں نے تیاری کی تھی اور سارا سامان فراہم کیا تھا، اور اگر یہ (غسل علی کی) روایت درست بھی ہو تو ان کی خصوصیت پر محمول ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود نے اعتراض کیا تو حضرت علی نے جواب دیا کہ "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: بے شک فاطمہ دنیا اور آخرت (دونوں)

میں تمہاری بیوی ہے۔" (اس روایت کو امام شافعی، امام دار قطنی، امام بیہقی اور امام ابونعیم نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔) یہ اس امر کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک عام حکم شرعی یہی تھا کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں ہے اور حضرت علی اپنے لئے خصوصیت کے دعویدار تھے۔

نفاس کی مدت

سوال: اکثر خواتین بچے کی ولادت کے بعد سوا مہینے یعنی چالیس دن تک غسل نہیں کرتیں، اس مدت کے دوران نماز، تلاوت سب کچھ موقوف ہو جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟

(رخسانہ شاکر۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: زچگی (Delivery) یعنی بچے کی ولادت کے بعد عورت کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں، اس کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ مدت چالیس دن ہے، یعنی چالیس دن تک اگر خون جاری رہا تو اسے نفاس ہی سمجھا جائے گا، اور وہ شرعاً ناپاک رہے گی، اور اس عرصے کی نمازیں اسے معاف ہیں، لہٰذا ان کی قضا بھی اس پر نہیں ہے۔ اس عرصے میں رمضان کا روزہ رکھنا بھی منع ہے، لیکن روزہ معاف نہیں ہے، بعد میں اس کی قضا لازم ہوگی۔ اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بھی جاری رہے تو اب یہ نفاس نہیں ہے، بلکہ استحاضہ ہے، یعنی 'سیلان الرحم' کی بیماری ہے۔ اب نفاس والی عورت پر لازم ہے کہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں پڑھے، روزے رکھے اور تلاوت کرے، بیت اللہ کا طواف بھی کر سکتی ہے۔ خون مستقل جاری رہتا ہے تو یہ بیماری ہے اور شرعی عذر ہے، بس اتنا ہے کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے یا ہو سکے تو غسل کرے، اور خون کے قطرے آنے کے باوجود وہ نماز پڑھتی رہے اور تلاوت کرتی رہے۔ نفاس کے لئے کم سے کم کوئی مدت متعین نہیں ہے، لہٰذا خون جب بھی رک جائے، خواہ ایک دن بعد یا زیادہ دنوں کے بعد، غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں شروع کر دے، تلاوت کرے وغیرہ۔ چالیس دن پورے کرنے ضروری نہیں ہیں۔ اگر چالیس دنوں سے کم مدت میں، خواہ ان ایام کی تعداد کوئی بھی ہو، خون بند ہو گیا، لیکن عورت نے غسل کر کے اور پاک ہو کر نمازیں نہیں شروع کیں، تو ان دنوں کی قضا اس پر لازم ہوگی۔

کیا ڈیڑھ سالہ بچی کے پیشاب سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں

سوال: میری بچی ڈیڑھ سال کی ہے، کبھی اس کا پیشاب میرے کپڑوں اور بدن پر گر جاتا ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟

(ڈاکٹر بشریٰ۔ گلستان جوہر)۔

جواب: بدن کے جس حصے پر اور کپڑے پر جہاں بچی کا پیشاب لگا ہے، وہ ناپاک ہو جاتے ہیں، بس انہیں دھو ڈالیں، نہ دوبارہ غسل کی ضرورت ہے نہ اس سے وضو ٹوٹتا ہے۔

خواتین کا ایامِ مخصوص میں مہندی لگانا

سوال: کیا خواتین ایامِ مخصوص میں مہندی لگا سکتی ہیں اور اگر لگا دی جائے تو ایام گزرنے پر غسل کر کے پاک ہو سکتی ہیں؟ (لبنیٰ رشید، کیماڑی، کراچی)

جواب: جی ہاں، خواتین ایامِ مخصوص میں مہندی لگا سکتی ہیں، اپنے ہاتھ پاؤں پر یا بالوں پر، اور ایام گزرنے پر جب وہ غسل کریں گی تو پاک ہو جائیں گی۔

گلی کوچوں کے ناپاک پانی کا بدن یا کپڑوں پر لگنا

سوال: ہم جب گھروں سے نکلتے ہیں تو اکثر گلی کوچوں میں پانی جمع رہتا ہے اور وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جاتا ہے، کیا اس کا ازالہ متاثرہ جگہ کے دھو لینے سے ہو جاتا ہے، یا وضو یا غسل کرنا پڑے گا؟ (سیّد محمد عارف۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: عام طور پر یہ یقین یا ظنِ غالب ہوتا ہے کہ یہ پانی گٹر کا ہے جو سیوریج لائن کے بند ہونے یا کسی لائن یا مین ہول کے ٹوٹ جانے سے ابلنے لگتا ہے اور گلی کوچوں میں پھیل جاتا ہے، یہ پانی ناپاک ہے اور بدن یا کپڑے کے جس حصے پر لگے، اسے اچھی طرح سے دھو ڈالیں۔ اس کے ازالے کے لئے غسل یا وضو کی ضرورت نہیں، اگر آپ پہلے سے باوضو ہیں تو آپ کا وضو بدستور قائم رہے گا۔

كتاب الصلوٰة

مسجد میں داخل ہوتے وقت اونچی آواز سے سلام کرنا

سوال: آج کل لوگ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے سلام کرتے ہیں، جس سے نماز واذکار میں مشغول نمازیوں کا خیال بٹ جاتا ہے اور بعض نمازی بیٹھے ہوئے نمازیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور بعض نمازی آپس میں گفتگو کرتے ہیں، بعض دفعہ وہ گفتگو تفریح و مذاق کا رخ اختیار کرجاتی ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ اس طرح کے معمولات مسجد میں جائز ہیں یا نہیں۔

(قاری محمد صدیق قادری، خطیب جامع مسجد خلفائے راشدین، گلشن اقبال، کراچی)

جواب:

عن عبد اللّٰہ بن عمرو ان رجلا سال رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم: ای الاسلام خیرٌ؟ قال: تطعم الطعام و تقرئ السلام علی من عرفتَ و من لم تعرف۔(مشکوٰۃ، باب السلام ص۳۹۷)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تم (مساکین کو) کھانا کھلاؤ اور (ہر مسلمان کو) سلام کرو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں''۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: للمؤمن علی المؤمن ستُّ خصال یعودہ اذا مرض ویشھَدہ اذامات و یجیبہ اذا دعاہ و یُسَلِّم علیہ اذا لقیہ و یشمتہُ اذا عطس و ینصح لہ اذا غاب او شھد لم اجدہ۔(مشکوٰۃ، باب السلام، صفحہ ۳۹۷)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ (عمومی) حقوق ہیں، جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، جب وہ وفات پائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو، جب وہ دعوت دے تو اسے قبول کرے، جب اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرے، جب اسے چھینک آئے

تو (اس کی الحمدللہ کے جواب میں) ''یَرْحَمُكَ اللّٰه'' کہے اور وہ موجود ہو یا نہ ہو (ہر حال میں) اس کی خیرخواہی کرے''۔

عن ابی اُمامة قال: قال رسول ﷺ: ان اولی الناس باللّٰه من بدأ بالسلام۔(مشکوٰة باب السلام صفحہ ۳۹۸)

''حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عام لوگوں کے بہ نسبت اللہ تعالیٰ (کی رحمت و مغفرت) کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہے جو سلام کی ابتدا کرے''۔

عن ابی هريرة قال: قال رسول اللهﷺ: يسلم الراكب على الماشي والماشي على القاعد والقليل على الكثير

''حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوار پیدل کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو تعداد میں کم ہوں وہ اپنے بہ نسبت زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں''۔

عن ابی هريرة قال: قال رسول اللهﷺ يسلم الصغير على الكبير والمار على القاعد والقليل على الكثير ۔ (مشكوٰة باب السلام)

''حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے، (راستے پر) چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے زیادہ کو سلام کریں''۔

عن ابی هريرة عن رسول اللهﷺ قال: اذا اتى احد كم الى مجلس فليسلم فان بدا له ان يجلس فليجلس ثم اذا قام فليسلم فليست الاولى باحق من الأخرة ۔(مشكوٰة باب السلام)

''حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے، اگر وہ بیٹھنا مناسب سمجھے تو بیٹھ جائے، پھر جب مجلس سے (روانہ ہونے کے لیے) اُٹھے تو تب بھی سلام کرے کیونکہ پہلا دوسرے سے کوئی زیادہ اہم نہیں ہے، (یعنی اسلامی شعار ہونے کے اعتبار سے دونوں کی یکساں اہمیت ہے)''۔

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ''سلام'' اسلام کا شعار ہے، سنت متوارثہ ہے، اسلامی

اخلاقیات کا اعلیٰ نمونہ ہے، دنیا کی ہر قوم میں باہمی ملاقات کے موقع پر تحیت کے کچھ خاص کلمات رائج ہیں، جیسے انگریزوں کے ہاں گڈ مارننگ، گڈ نائٹ وغیرہ، فارسی میں صبح بہ بخیر، شب بخیر وغیرہ۔ لیکن اسلام کا شعارِ ملاقات والوداع سب سے منفرد ہے، یہ ایک جامع کلمۂ دعاء خیرخواہی ہے، اللہ کی سلامتی و رحمت و برکت کی دعا ہے اور اپنی جانب سے بھی پیغامِ سلامتی ہے۔ ایک حدیث مبارک میں آپ نے پڑھ لیا کہ آدمی باہر سے آ کر مجلس میں شریک ہو تو سلام کرے، اُٹھ کر جانے لگے تو سلام کرے، اگرچہ اہلِ مجلس میں سے ہر ایک پر اس کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے ایک یا چند افراد نے جواب دے دیا تو جواب کی ''سنتِ کفایہ'' ادا ہو گئی۔

لیکن اگر مسجد میں لوگ نماز میں مشغول ہیں، تلاوتِ قرآن کریم، تسبیح، اوراد و وظائف اور درود شریف پڑھنے میں مشغول ہیں یا وعظ و تذکیر اور درس و تدریس کی مجلس میں مشغول ہیں تو پھر آنے والا اونچی آواز سے سلام نہ کرے (اور اگر اس نے اونچی آواز سے سلام کر بھی دیا تو ان لوگوں پر سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے) بلکہ وہ خاموشی سے آئے اور اپنی عبادت میں مشغول ہو جائے، ہاں اگر کوئی شخص یا چند اشخاص کسی عبادت، تلاوت، اوراد و اذکار وغیرہ میں مشغول نہیں ہیں تو ان کے قریب جا کر انہیں سلام کرے، تاکہ جو لوگ مصروفِ عبادت ہیں ان کی توجہ اور یکسوئی میں خلل واقع نہ ہو۔ یہ مسئلہ مسجد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ خارجِ مسجد بھی کوئی مجلسِ وعظ، تلاوت، درود خوانی یا ذکر و فکر کی مجلس برپا ہو تو جا کر خاموشی سے بیٹھ جائے۔ جہاں سلام کی اجازت ہے وہاں مصافحہ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی کھانا کھانے میں مشغول ہو تو بھی اسے سلام نہ کرے۔ لیکن اگر اسے کسی نے سلام کر دیا تو وہ جواب دے دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے کھانے کے دوران بات چیت کا جواز ثابت ہے۔ البتہ اگر بھوک ہو اور کھانے کی طلب ہو تو سلام عرض کر دیں، شاید وہ پیش کش کرے۔

مسجد میں شور و غوغا کرنا، دنیوی باتیں کرنا، گپ شپ کرنا، ہنسی مذاق کی باتیں کرنا، کاروباری لین دین کی باتیں کرنا سخت منع ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

عن ابی هريرة قال قال رسول اللهﷺ: من سمع رجلاً ينشد ضالة في المسجد فليقل لاردها الله عليك فان المساجد لم تُبْنَ لهٰذا۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی

شخص کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو کہے کہ اللہ کرے تجھے یہ چیز نہ ملے کیونکہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں''۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نهی رسول الله ﷺ عن تناشد الاشعار فی المسجد و عن البیع والاشتراء فیه وان یتحلق الناس یوم الجمعة قبل الصلوة فی المسجد.

''عمرو بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد میں (فحش) اشعار پڑھنے، خرید وفروخت کرنے اور جمعہ کے دن مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا''۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ: اذا رایتم من یبیع او یبتاع فی المسجد فقولوا لا اربح الله تجارتک و اذا رایتم من ینشد فیه ضالة فقولوا لاردالله علیک۔(مشکوٰۃ، باب المساجد)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب تم دیکھو کہ کوئی شخص مسجد میں لین دین کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم دیکھو کہ کوئی گمشدہ چیز کا اعلان کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تعالیٰ یہ گمشدہ چیز تمہیں نہ لوٹائے''

عن الحسن مرسلا قال قال رسول الله ﷺ: یاتی علی الناس زمان یکون حدیثهم فی مساجد فی امردنیاهم فلا تجالسوهم فلیس لله فیهم حاجة۔(مشکوٰۃ باب المساجد)

''حضرت حسن سے ایک حدیث مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ وہ مساجد میں دنیوی باتیں کریں گے ان کے ساتھ نہ بیٹھو، اللہ کو ان (کی عبادت) سے کوئی غرض نہیں''۔

علامہ ابن عابدین شامی مسجد میں باتیں کرنے کی ممانعت کو منکرات یا ''لہو الحدیث'' (بیہودہ یا بے مقصد باتوں) پر محمول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''المصفّٰی میں ہے مسجد میں بات چیت کے لیے بیٹھنا شرعاً جائز ہے کیونکہ اہل صفہ کا رہن سہن مسجد ہی میں ہوتا تھا وہ وہاں پر سوتے بھی تھے اور بات چیت بھی کرتے تھے، لہٰذا کسی کے لیے اس

سے منع کرنا جائز نہیں ہے۔ ''الجامع البرہانی'' میں بھی اسی طرح ہے''۔

(فتاویٰ شامی ۲/۳۷۸ طبع جدید بیروت)

لیکن ظاہر ہے کہ اہل صفہ زیادہ تر دین ہی کی باتیں کرتے تھے، احادیث کا بیان کرتے تھے یا یہ اس طرح کی ضروری باتوں پر محمول ہے جیسے کسی مسجد کی انتظامیہ کے لوگ مسجد میں بیٹھ کر مسجد کے انتظامی معاملات پر بات کرتے ہیں یا کچھ لوگ کسی دینی، ملی اور فلاحی مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی نیت کر لینی چاہیے۔

گزشتہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں نماز کا تذکرہ

سوال: کہا جاتا ہے کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ہمارے رسول اکرم ﷺ اور آپ کی امت پر معراج کی شب فرض ہوئی، جبکہ عمومی طور پر نماز کا تذکرہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں کون کون سے اوقات کی نمازیں فرض تھیں، تحریر فرمائیے۔ (زاہد اللہ۔ اوگی، مانسہرہ)۔

جواب: قرآنی ارشادات کے مطابق تمام نبی اپنی امتوں کو نماز کی تعلیم دیتے رہے ہیں، انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو نماز پڑھائی بھی ہے اور پڑھی بھی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ (ابراہیم: ۴۰)

''اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے (بھی)''۔

قرآن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (مریم: ۵۵)

''وہ اپنے اہل وعیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے''۔

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (لقمان: ۱۷)

''اے میرے بیٹے نماز پڑھو''۔

اللہ جل شانہٗ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرماتا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ: ۱۴)

"میری یاد (کو تازہ رکھنے) کے لئے نماز پڑھو"۔

بنی اسرائیل کو حکم ہوا:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (بقرہ:۴۳)

"اور نماز قائم کرو"۔

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ (مریم:۳۱)

"اور (اللہ تعالیٰ نے) مجھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے"۔

امام نسائی اپنی سند کے ساتھ واقعہ معراج بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: "(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) پھر میں پانچ نمازوں (کا حکم لے کر) لوٹا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: جائیے! اپنے رب سے مزید تخفیف کی گزارش کیجئے، کیونکہ بنی اسرائیل پر صرف دو نمازیں فرض کی گئی تھیں، لیکن وہ ان کو بھی نہ پڑھ سکے، (سنن نسائی، جلد ا، ص ۵۲)"۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر (یعنی شریعت موسیٰ علیہ السلام میں) دو نمازیں فرض تھیں۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے کہ نمازِ عشاء ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کی خصوصیت ہے، چنانچہ امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت معاذ ابن جبل سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس نماز (عشاء) کو تاخیر سے پڑھا کرو کیونکہ تم کو اس نماز کے سبب پچھلی تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے اور تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی، (سنن ابوداؤد، ج ا، ص ۶۱)"۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پنجگانہ نمازوں میں ہر ایک نماز کسی نہ کسی اولوالعزم نبی نے پڑھی ہے، گویا ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت میں سب کو جمع کر دیا گیا ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ: "حضرت آدم علیہ السلام نے صبح کی نماز پڑھی، حضرت داؤد علیہ السلام نے ظہر کی نماز پڑھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے مغرب کی نماز پڑھی اور حضرت یونس علیہ السلام نے عشاء کی نماز پڑھی، (الاصابہ، ج ۴، ص ۳۶۴ بحوالہ علامہ حلبی رافعی شارح مسند شافعی)"۔ اس روایت کی رو سے امت محمدیہ سے پہلے عشاء کی نماز حضرت یونس علیہ السلام نے پڑھی ہے، لیکن گزشتہ روایت کی رو سے ان کی یا کسی اور نبی کی امت نے نہیں پڑھی۔

جہاں تک پانچ اوقات کی نماز کی فرضیت کا تعلق ہے، وہ تو شب معراج ہی کو فرض ہوئی ہے، لیکن فی نفسہٖ نماز نزول وحی کے ساتھ ہی فرض ہوگئی تھی۔ السیرۃ النبویہ لابن ہشام برحاشیہ روض الانف ج ا ص ۱۶۲، اور انسان العیون ج ا ص ۴۲۶ میں ہے کہ جبریل امین نے وضو کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا، پھر آپ نے جبریل علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح الزرقانی علی المواہب، المقصد الخامس فی المعراج والاسراء ۶/ ۲/ ۱۴۲ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل پر دو وقت کی نماز فرض تھی، دو رکعت صبح اور دو رکعت رات کی، اور بعض کے نزدیک دو رکعت زوال کی بھی تھیں، لیکن وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے، (فتاویٰ رضویہ ۵/ ۴۴ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)"۔

رہا یہ سوال کہ انبیاء سابقین کی نمازوں کا طریق ادا کیا تھا، یہ جاننا نہ ہماری ضرورت ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں اور نہ ہی قرآنِ مجید اور احادیثِ صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔

تائب کی امامت کا حکم

سوال: ایک شخص کچھ عرصہ پہلے گانے، ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھتا تھا اور اس نے یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا (ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی طرف صاف دل سے خالص توبہ کرو) کے مطابق توبہ کر لی، کیا ایسا شخص امامت کے قابل ہے، جبکہ اس میں اہلیت امامت کی تمام شرائط موجود ہیں، کیا اس پر کوئی حد شرعی قائم ہوگی۔

(شاہد جمیل، گلشن اقبال، کراچی)

جواب: موسیقی کے ساتھ فحش گانے، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھنا گناہ ہے۔ صورتِ مسئولہ میں جب اس شخص نے صدقِ دل سے توبہ کر لی ہے تو وہ امامت کے قابل ہے اور اس کی اقتداء میں نماز صحیح ہے۔ جب تک توبہ کے منافی اس سے فسق و فجور کا صدور نہ ہو تو اس کے ماضی کے کردار کے حوالے سے بدگمانی ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ

(الحجرات:۱۲)

"اے ایمان والو! بہت سے گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں"۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''بدگمانیوں سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)''۔ توبۃ النصوح اور توبہ صادق کی ظاہری علامت یہ ہے کہ بندے نے جس گناہ سے توبہ کی ہے، دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کریمی سے توبہ کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنے ذمۂ کرم پر لیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ
فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النسا:۱۷)

''وہ توبہ جس (کی قبولیت) کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے گناہ کر بیٹھیں، پھر جلدی سے توبہ کرلیں تو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت سے رجوع فرماتا ہے، اور اللہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے''۔

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابن ماجہ و سنن بیہقی)

سوال میں مذکور شخص پر کوئی حدِ شرعی عائد نہیں ہوتی۔ عامۃ المسلمین سے بھی گزارش ہے کہ اگرچہ شرعاً تصویر کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، لیکن موسیقی اور گانے بجانے کے آلات کے ساتھ فحش گانے سننا، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں اور ناچ گانے کے پروگرام دیکھنا مکروہِ تحریمی ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور کسی تھیٹر وغیرہ میں جاکر غیر محرم عورتوں کو براہِ راست بے حجاب اور نیم عریاں لباس میں دیکھنا بھی مکروہِ تحریمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بے شک شیطان انسان (کی رگ و پے) میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے جیسے (رگوں میں) خون رواں ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین)''۔ اور فرمان رسول ﷺ ہے: ''آنکھوں کا زنا (غیر محرمات کو بے حجاب) دیکھنا ہے، اور کانوں کا زنا (فحش باتیں) سننا ہے، اور زبان کا زنا (بے حیائی کی) باتیں کرنا ہے، اور ہاتھ کا زنا چھونا ہے اور پاؤں کا زنا (برائی کی طرف) قدم اٹھانا اور دل (گناہ کی) خواہش اور آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ (گناہ سے رک کر) اس کی تکذیب کرتی ہے یا (گناہ میں مبتلا ہوکر) اس کی تصدیق کرتی ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)''۔ یعنی مومن کو گناہ کے مبادیات اور محرکات سے بچنا چاہئے ورنہ گناہ میں مبتلا ہونے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔

امام کا صفیں درست کرنے کی ہدایت کرنا

سوال: سوال یہ ہے کہ بندہ نے اب تک جہاں بھی نماز جمعہ ادا کی ہے۔ ائمہ کرام یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ صفیں سیدھی کرلیں اور ساتھ کوئی اور جملہ بھی کہہ دیتے ہیں آیا اس کا کوئی شرعی جواز ہے؟ اگر ہے تو مفصل جواب دیں۔ مہربانی ہوگی۔ ہاں آیا امام صاحب نماز کی امامت پہ بھی یہ الفاظ دہرا سکتا ہے یا کہ نہیں؟ (ارشد علی، پنجاب)۔

جواب: رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز میں صفوں کی درستی پر بہت زور دیا ہے، تاکید فرمائی ہے اور صفوں میں خلا چھوڑنے اور صفیں ٹیڑھی بنانے پر وعید بھی فرمائی ہے، آپ کا ارشاد ہے: ''اللہ کے بندو! تمہیں لازماً صفیں سیدھی رکھنی چاہئیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بگاڑ دے گا (یا انہیں پھیر دے گا یا ان میں اختلاف پیدا فرمادے گا)''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

اور آپ نے ارشاد فرمایا: ''صفوں کو (سیدھا اور) برابر رکھو، کیونکہ صفوں کی درستی سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے''۔ (مشکوٰۃ)

''ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز کے وقت) ہمارے کندھوں کو چھو کر صفوں کو درست کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: صفیں برابر رکھو اور ان میں بگاڑ پیدا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بگاڑ (اور نفاق) پیدا ہوگا، تم میں جو زیادہ سمجھدار ہیں، وہ میرے قریب کھڑے ہوں، اور اس کے بعد دوسرے درجہ بدرجہ''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز کی اقامت کہی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: صفوں کو سیدھا کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوا کرو، کیونکہ میں (دوران نماز) اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے کہ سامنے دیکھتا ہوں''۔ (مشکوٰۃ) اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں متعدد روایات درج ہیں، جن کی رو سے آپ ﷺ صفوں کی درستی کے لئے یہ کلمات ارشاد فرماتے تھے: ''سَوُّوْا، اِسْتَوُوْا، اِعْتَدِلُوْا (یعنی صفوں کو برابر کرو، سیدھا کرو، ٹھیک کرو)''۔ اور آپ فرماتے تھے: ''صفوں کو سیدھا کرو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو (یعنی آگے پیچھے نہ کرو)، اور صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خلا نہ چھوڑو، کیونکہ اس میں شیطان گھس جاتا ہے (اور تمہارے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، بگاڑ پیدا کرتا ہے)''۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صفیں سیدھی رکھو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو، صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خالی جگہ نہ چھوڑو، (صفیں سیدھی کرنے کے لئے) تمہارا دینی بھائی ہاتھ بڑھائے تو اس کے ساتھ نرمی اختیار کرو، شیطان کے لئے بیچ میں کشادہ جگہ نہ چھوڑو، جو صف کو ملا کر رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے وابستہ رکھے گا اور جو صف کا سلسلہ توڑ دے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا رشتہ توڑ دے گا"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و نسائی)

ان احادیث مبارکہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صفوں کی درستگی کا کتنا اہتمام اور تاکید فرماتے تھے اور آپ نے صفوں کو برابر نہ رکھنے والوں کے لئے کتنی شدید وعیدیں فرمائیں۔ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلفاء راشدین وسلف صالحین میں یہ تاکید شدید اس لئے بھی تھی کہ مساجد ناپختہ تھیں، صفوں کی نشاندہی کے لئے لائنوں، دریوں، چٹائیوں اور قالینوں کا اہتمام نہیں تھا، لہٰذا صفوں کی درستی کے لئے انتہائی توجہ کی ضرورت تھی۔ آج کل ہمارے لئے بڑی آسانیاں ہیں، اگر کسی مسجد میں نمازی کم ہیں یا مسجد بالکل چھوٹی ہے اور امام سمجھتا ہے کہ صفیں درست بن رہی ہیں تو اگر زبانی تاکید نہ بھی کرے تو حرج نہیں ہے، لیکن اگر تاکیدِ صفوف کو سنت رسول اللہ ﷺ سمجھتے ہوئے زبانی بھی کہہ دے تو تعمیلِ سنت کا اجر ملے گا۔ مسجد بڑی ہو، نمازی زیادہ ہوں تو بہتر یہی ہے کہ امام تاکیداً صفیں درست کرائے، امام اگر ضرورت محسوس کرے تو اقامت مکمل ہونے کے بعد نمازیوں کو صفوں کی درستی کے لئے مزید وقت دے سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے تکبیر تحریمہ میں چند لمحے کی تاخیر بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اوّابین کے نوافل پڑھنے کا طریقہ

سوال: "اوّابین" کے نوافل پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا یہ نوافل نماز مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھے جاتے ہیں؟ اور کیا نفلی عبادات کے بعد دعا مانگنی چاہیے؟ (محمد سلیم، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: "اوّاب" کے لفظی معنی ہیں "توبہ کرنے والا"، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں "طلب مغفرت کے لئے رجوع کرنے والا۔" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ

غَفُوْرًا (بنی اسرائیل: ۲۵)

"تمہارا رب خوب جانتا ہے، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک ہوئے تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کو بہت بخشنے والا ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے والے (اوّابین) ہیں"۔

مغرب کی نماز کے بعد کم از کم چھ رکعات نوافل پڑھنا مستحب ہے، ان کو "اوّابین" کہتے ہیں، یہ نماز دو دو رکعت کرکے تین سلام کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، یعنی ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ مغرب کے فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ اوّابین کے نوافل کے ساتھ ملا کر پڑھ سکتے ہیں، ان نوافل میں مطلق نماز کی نیت کافی ہے، یعنی نیت میں اوّابین کا لفظ ذکر یا ذہن میں اس مفہوم کا استحضار (Presence) ضروری نہیں ہے اور سنت کی نیت سے بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ سنن زوائد میں سے ہیں۔ اوّابین کی کم از کم چھ رکعات ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد بیس رکعات ہے، (ترمذی ج ۱ ص ۵۸ باب ماجاء في فضل التطوع ست ركعات)۔ نفل نماز کے بعد دعا مانگی جا سکتی ہے، دعا مانگنا افضل ہے اور اس کے لئے کسی وقت کی تحدید نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ

"میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے"۔

حدیث شریف کی معروف کتاب "سنن ترمذی" میں ہے:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: مَن صلّٰی بعد المغرب ستَّ رَكَعاتٍ لم يتكلم فيما بينهُنَّ بِسُوْءٍ عُدِلْنَ لَهٗ بِعِبادةِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز مغرب کے بعد چھ رکعات (نفل) اس طرح پڑھے کہ ان کے درمیان کوئی بری بات نہیں کی تو وہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) بارہ سال کی (نفلی) عبادت کے برابر ہوں گے"۔ (رقم الحدیث: ۴۳۵)

اس حدیث کے تحت امام ابوعیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک روایت ہے کہ "جس نے مغرب کے بعد بیس رکعات نفل پڑھے، اللہ تعالیٰ اس

کے لئے جنت میں ایک گھر تعمیر فرمادے گا''۔ مغرب کے بعد کے چھ نوافل کی فضیلت کے بارے میں ''سنن ابن ماجہ'' میں دو مقامات پر الگ الگ عنوانات کے تحت یہ حدیث مذکور ہے (احادیث نمبر ۱۱۶۷، ۱۳۷۳) اور تحفۃ الاشراف میں حدیث نمبر ۱۵۴۱۲ کے تحت درج ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب وضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں۔

نماز میں سورت ملانا بھول گیا

سوال: ایک شخص نے چار رکعت نماز سنت کی نیت کی، سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانی بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، بعد میں یاد آیا کہ سورت ملانا رہ گئی ہے، کیا سجدۂ سہو سے نماز ہو جائے گی؟
(حافظ محمد ارشاد۔ امام و خطیب جامع مسجد اللہ والی۔ لائنز ایریا، صدر، کراچی)

جواب: اگر فرض کی پہلی دو رکعات اور باقی کسی بھی نماز (وتر، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، نفل) کی کسی بھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملانا بھول جائے اور رکوع میں چلا جائے تو رکوع میں یاد آنے پر بھی پلٹ کر نہ آئے بلکہ نماز مکمل کرے اور آخر میں سجدۂ سہو کرلے، نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، کیونکہ سورت کا ملانا واجب ہے اور ترک واجب کی تلافی سجدۂ سہو سے ہو جاتی ہے۔

نماز میں سہو کے مسائل

سوال: اگر کوئی نمازی بھول کر رکوع یا سجود میں قرأت کرلے تو کیا اس سے سجدۂ سہو لازم آئے گا؟ (آثار اللہ۔ قاری بختیار احمد۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب: یہ مسئلہ ہمارے اکابر فقہاء کرام میں مختلف فیہ ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

قال المقدسی: وکما لوقرأ القران ھنا اوفی الرکوع یلزمه السھو مع انه کلام اللّٰه تعالٰی وکما لو ذکر التشھد فی القیام مع انه توحید اللّٰه تعالٰی۔

''مقدسی نے کہا ہے کہ اسی طرح اگر یہاں (یعنی التحیات کے بعد) یا رکوع میں قرآن پڑھا تو سجدۂ سہو لازم ہوگا، حالانکہ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور اسی طرح اگر قیام میں تشہد (یعنی التحیات) پڑھی تو سجدۂ سہو لازم آئے گا، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار

ہے''۔ (فتاویٰ شامی، ج ۲ ص ۵۷۴ طبع جدید)

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق مؤلفہ علامہ فخر الدین زیلعی ج ۱ ص ۱۹۳ پر ہے:

وکذا لو قرأ ایة فی الرکوع اوالسجود اوالقومة اوالقعود فعلیه السھو لانه لیس بمواضع القراءة۔

''اور اسی طرح اگر رکوع یا سجود یا قومہ (رکوع سے اٹھنے کے بعد سجدے میں جانے سے پہلے جو ایک تسبیح کی مقدار رک کر قیام کرتے ہیں) یا قعود (یعنی التحیات) میں ایک آیت پڑھی تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہے، کیونکہ یہ مقامِ قرأت نہیں ہے''۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں ج ۱ ص ۵۲۱ پر لکھا ہے:

ولوقرأ التشھد فی الرکوع اوالسجود لا سھو علیه لانه ثناء وھما محله، بخلاف القراءة فیھما فان فیه السھو۔

''اگر نمازی نے رکوع و سجود میں التحیات پڑھی تو اس پر سجدۂ سہو نہیں ہے، کیونکہ یہ (التحیات) ثناء ہے اور رکوع و سجود ثناء پڑھنے کا محل ہے، اس کے برعکس اگر رکوع و سجود میں قرآن پڑھا تو اس پر سجدۂ سہو لازم آئے گا (کیونکہ رکوع و سجود محل قرأت نہیں ہیں)''۔

علامہ زین الدین ابن نجیم، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۲ ص ۹۷ پر لکھتے ہیں:

وقد اقتصر المصنف علی ھذہ الواجبات فی باب صفة الصلوٰة وبقی واجب اخر وھو عدم تاخیر الفرض والواجب وعدم تغییرھما وعلیه تفرع مسائل منھا وکذا لو قرأ آیة فی الرکوع اوالسجود والقومة فعلیه السھو کما فی الظھیریة وغیرھا وعلله فی المحیط بتاخیر رکن او واجب علیه۔

''اور مصنف نے ''باب صفۃ الصلوٰۃ'' میں انہی واجبات کے بیان پر اکتفاء کیا ہے اور ایک اور واجب کا بیان رہ گیا ہے اور وہ ہے: فرض اور واجب میں تاخیر نہ کرنا اور ان میں تبدیلی نہ کرنا اور اس پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اور اسی طرح اگر اس نے رکوع یا سجدہ یا قومہ (یعنی رکوع کے بعد سجدہ میں جانے سے پہلے ایک تسبیح کی مقدار جو قیام ہوتا ہے) کی حالت میں ایک آیت پڑھ لی تو اس پر سجدۂ سہو واجب

ہے، جیسا کہ ظہیریہ وغیرہ میں ہے، محیط میں اس سجدۂ سہو کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس قرأت سے رکن یا واجب میں تاخیر ہوجاتی ہے"۔

علامہ علاؤالدین بن مسعود کاسانی بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۹۹ پر لکھتے ہیں:

ولو قرأ القران فی رکوعہ او فی سجودہ او فی قیامہ، لا سہو علیہ، لانہ ثناء و ہذہ الارکان مواضع الثناء۔

"اور اگر اس (نمازی) نے اپنے رکوع یا سجود یا قومہ میں قرآن پڑھا، تو اس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہے، کیونکہ قرآن بھی اللہ کی ثناء ہے اور یہ ارکان (رکوع، سجود اور قومہ) بھی محل ثناء ہیں"۔

آپ نے اکابر فقہاء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائے، یہ سب ہمارے وہ عظیم اسلاف ہیں جن کی کتب سے نقل کرکے ہر مفتی فتویٰ دیتا ہے اور جتنے بھی اہل سنت و جماعت حنفی لوگ ہیں، بہ طیب خاطر ان پر عمل کرتے ہیں اور ان کو حجت مانتے ہیں، ان میں سے صرف علاؤالدین کاسانی، رکوع وسجود میں قرآن پڑھنے پر سجدۂ سہو کے عدم وجوب کے قائل ہیں اور ان کی دلیل بھی معقول ہے۔ لیکن چونکہ باقی تمام فقہاء کرام، جن کے حوالہ جات اوپر دیئے گئے ہیں، رکوع وسجود اور قومہ میں قرآن پڑھنے پر سجدۂ سہو کو واجب قرار دیتے ہیں، لہٰذا عامۃ المسلمین کو چاہئے کہ احتیاط پر عمل کریں اور ایسے موقع پر سجدۂ سہو کریں۔

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: فرض نماز میں جب امام قرأت شروع کردے تو ثناء نہیں پڑھنی چاہئے جبکہ آپ نے سوال وجواب کے کالم میں فرمایا ہے کہ اگر نمازی کو گمان یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء حالتِ قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو ثناء پڑھ لے، (عبداللہ......لانڈھی، کراچی)۔

جواب: میں نے جو کچھ تحریر کیا تھا، وہ قرآن مجید کی اس آیت ربانی میں جو ارشاد باری تعالیٰ ہے، وہ اس کی تعمیل ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(الاعراف: ۲۰۴)

"اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

فقہاء احناف نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ فَاسْتَمِعُوْا (یعنی توجہ سے سنو) پر عمل تب ہوگا جب امام جہری نماز (مغرب، عشاء اور فجر) میں اونچی آواز سے تلاوت کرتا ہے، اور جب امام سری نماز (یعنی ظہر وعصر) میں آہستہ آواز سے تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اَنْصِتُوْا (خاموش رہو) پر عمل کر رہا ہے، اور جب امام کو رکوع یا سجدے کی حالت میں پائے، تو فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۹۱ پر ہے:

"اور اگر مقتدی امام کو رکوع میں پائے یا سجدے کی حالت میں، تو سوچے، اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ اگر وہ ثناء پڑھے گا تو امام کو اس رکوع یا سجدے میں پالے گا، تو حالتِ قیام میں ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہوجائے، ورنہ (یعنی اگر اس کا غالب گمان یہ ہے کہ اس کے ثناء پڑھنے سے امام رکوع یا سجدے سے اٹھ جائے گا تو) ثناء وتعوذ (اعوذ باللہ) نہ پڑھے، اور اگر مقتدی امام کو قعدے میں پائے تو ثناء نہ پڑھے بلکہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد دوسری تکبیر (تکبیر انتقال) کہہ کر قعدے میں چلا جائے، (البحر الرائق میں "باب فی صفۃ الصلوٰۃ" کے تحت یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے)۔

اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال: اگر اذان کے کلمات میں غلطی ہوجائے یا کوئی کلمہ رہ جائے، مثلاً "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" تو اذان کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں، نیز اقامت میں اگر کلمہ "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ" رہ جائے تو اقامت کا اعادہ بھی ضروری ہے یا نہیں، اگر اسی اقامت سے نماز پڑھالی، آیا نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ وضاحت فرمایئے، (حافظ آثار اللہ، مانسہرہ)۔

جواب: اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کوئی کلمہ رہ جائے اور اذان یا اقامت کے دوران میں ہی یاد آگیا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے کوئی کلمہ چھوٹا ہے، پلٹ کر وہاں سے دوبارہ ترتیب کے مطابق سارے کلمات ادا کرکے اذان یا اقامت کو مکمل کرے۔ علامہ علاؤالدین بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں: "(ترجمہ) ان مسائل اذان واقامت میں سے ایک یہ ہے کہ کلمات اذان واقامت کو ترتیب کے مطابق پڑھے، یہاں تک اگر کسی کلمے کو دوسرے کلمے پر مقدم کرکے پڑھ لیا تو پھر ترتیب کے مطابق کلمات کو ملا کر پڑھے اور جو کلمہ بھول

کر پہلے پڑھ چکا تھا، اسے دوبارہ ترتیب کے مطابق اپنے مقام پر پڑھے''۔
(بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۴۳)

اذان یا اقامت کا کلمہ رہ جانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ درمیان میں سے کوئی کلمہ بھولے سے رہ گیا اور دوران اذان و اقامت یاد نہ آیا، بلکہ اذان و اقامت کے اختتام کے بعد خود یاد آیا یا کسی نے یاد دلایا تو اب اذان یا اقامت کا اعادہ ضروری نہیں ہے، (لیکن کرنا افضل ہے) کیونکہ اذان و اقامت کا مقصد نماز کا اعلان کرنا ہے اور وہ مقصد حاصل ہوگیا۔ اور اعادے کے بغیر بھی نماز کی صحت یا جواز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ علامہ شیخ نظام الدین لکھتے ہیں: ''اگر مؤذن اپنی اذان یا اقامت میں کسی کلمے کو خلاف ترتیب دوسرے کلمے پر مقدم کردے، جیسے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے پہلے پڑھ لے، تو بہتر صورت تو یہ ہے کہ جو کلمہ خلافِ ترتیب پہلے پڑھ لیا گیا ہے، اس کا اعتبار نہ کرے اور دوبارہ ترتیب کے مطابق وہاں سے پڑھے جہاں سے کوئی کلمہ رہ گیا ہے، اور اگر بھولے سے چھوڑے ہوئے کلمہ کا اعادہ کرکے ترتیب کے مطابق اذان کی تکمیل نہ کی، بلکہ ویسے ہی مکمل کرلی تو نماز جائز ہوگی''۔
(فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۵۶)

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: ''اور اذان کے دو کلمات کے درمیان فصل (یعنی سکتہ) نہ کرے بلکہ روانی سے پڑھے تاکہ وہ ایک مسلسل کلام معلوم ہو، اور اقامت کہتے وقت اپنی آواز کو اذان کے بہ نسبت ذرا پست رکھے، اور کلماتِ اذان و اقامت، جیسے کہ شریعت میں وارد ہوئے ہیں اسی ترتیب کے مطابق پڑھے، اگر بعض کلمات میں ترتیبِ شرعی کے خلاف تقدیم و تاخیر ہوگئی ہو، تو رعایتِ ترتیب کے لئے اعادہ سنت ہے''۔ (فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۱ ص ۲۴۸)

امام مقدار واجب تلاوت کرلے اور اس کے بعد اس سے غلطی ہوجائے تو مقتدی لقمہ دے سکتا ہے؟

سوال: امام نے بقدر واجب تلاوت کرلی اور اس کے بعد تلاوت جاری تھی کہ امام سے غلطی ہوگئی، مقتدی امام کو بتائے یا نہیں، اگر مقتدی نے بتایا تو اس کی نماز فاسد تو نہیں ہوگی، اسی طرح امام کے لقمہ لینے سے امام کی نماز بھی فاسد تو نہیں ہوگی؟ (زاہد اللہ۔ لانڈھی، کراچی)۔

جواب: اصولی طور پر تو مقتدی کو بلاضرورت لقمہ نہیں دینا چاہئے، ورنہ بلاضرورت لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد ہوجائے گی اور امام کے لقمہ لینے سے اس کی نماز بھی فاسد ہوجائے گی، لیکن قرأت کا مسئلہ اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا اگر امام سورۂ فاتحہ کے بعد قرأت مقدار واجب سے زیادہ بھی پڑھ لے (یعنی ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیات) تو غلطی پر مقتدی لقمہ دے دے اور امام اس کا لقمہ لے سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں ''سورۃ المؤمنون'' کی تلاوت کی اور ایک کلمہ درمیان میں رہ گیا، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا: تم میں ابی ابن کعب نہیں تھے جو بتادیتے، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے سمجھا: شاید یہ کلمہ منسوخ ہوگیا ہے، آپ نے فرمایا: اگر منسوخ ہوا ہوتا تو میں تمہیں بتادیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت مقدار واجب سے طویل بھی ہوا اور اس سے غلطی ہوجائے تو مقتدی کو بتادینا چاہئے اور امام کو لقمہ لے لینا چاہئے۔

نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فرض نماز کے بعد بعض لوگ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں، کیا یہ طریقہ کار درست ہے؟ کیا احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہ لوگ کیا پڑھتے ہیں؟
(سیّد محمد علی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)۔

جواب: علامہ محمد بن محمد جزری نے حصن الحصین میں طبرانی اور بزار کے حوالے سے مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے: ''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ لیتے اور نماز سے فارغ ہوجاتے تو اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر یہ دعا مانگتے تھے:

بِسْمِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنِّی الْهَمَّ وَالْحُزْنَ

''اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے، اے اللہ! (از راہ کرم) تو مجھ سے ہر قسم کے رنج والم اور غم کو دور فرما''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز فرض پڑھ کر فارغ ہوجاتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر یہ دعا فرماتے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اَللّٰهُمَّ اَذْهِبْ عَنِّى الْهَمَّ وَالْحُزْنَ

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان ورحیم ہے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اے اللہ (از راہِ کرم) مجھ سے ہر قسم کے رنج والم اور غم واندوہ کو دور فرما"۔

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال: ایک نمازی مسجد میں داخل ہوا تو جماعت کھڑی تھی، اور امام رکوع میں تھا، اب وہ کیا کرے؟ تکبیر تحریمہ کہہ کر اور ہاتھ باندھنے کے بعد رکوع میں جائے یا بغیر ہاتھ باندھے "اللہ اکبر" کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہوجائے؟ (محمد انصر۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: باہر سے آنے والا نمازی جب امام کو رکوع میں پائے تو سیدھا کھڑے ہوکر حالت قیام میں تکبیر تحریمہ کہے اور پھر تکبیر انتقال یعنی رکوع کے لئے اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے اور امام کے ساتھ شامل ہوجائے، ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں، اگر اسے غالب گمان یہ ہو کہ اس کے "سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ" (یعنی ثناء) پڑھنے سے امام رکوع سے اٹھ جائے گا تو وہ ثناء نہ پڑھے اور رکوع میں چلا جائے۔ اگر عجلت یا بے خیالی میں تکبیر تحریمہ کے بعد رکوع کی تکبیر کہنا بھول گیا تو بھی نماز ادا ہوجائے گی کیونکہ تکبیرِ انتقال سنت ہے اور نسیاناً ترکِ سنت سے سجدۂ سہو لازم نہیں آتا اور نماز صحیح طور پر ادا ہوجاتی ہے۔ البتہ اگر تکبیر تحریمہ حالتِ قیام میں نہ کہی، بلکہ اتنا جھکتے ہوئے کہی کہ ہاتھ پھیلائیں تو گھٹنوں تک پہنچ جائیں تو نماز ادا نہیں ہوگی، لہٰذا احتیاط ضروری ہے۔ اگر نمازی کا گمانِ غالب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد "سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ" (یعنی ثناء) حالتِ قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو پھر ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھ لے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہوجائے۔

غیر مسلم ملک میں نماز باجماعت، جمعہ اور روزے کا مسئلہ؟

سوال: بہت سے لوگوں کو روزگار کے لئے غیر مسلم ممالک جانا پڑتا ہے، وہاں پر نماز باجماعت پنجگانہ، جمعہ اور روزے کے لئے کیا کرے؟ (سید عشرت۔ بفرزون، نارتھ کراچی)۔

جواب: آج کل تقریباً ہر غیر مسلم ملک میں مساجد، اسلامک سینٹر، کمیونٹی سینٹر موجود ہیں، جہاں

سے بہت سے معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ قریب ترین مسجد کہاں ہے؟ حلال اشیاء خوراک اور حلال گوشت کہاں سے ملتا ہے، وغیرہ۔ جہاں آپ کی ملازمت یا روزگار ہے، اگر قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے تو تنہا نماز پڑھیں، اگر کسی ایک جگہ دو تین مسلمان بھائی کام کررہے ہیں تو آپس میں مل کر جماعت کرلیا کریں، دو ہوں تو ایک امام بن جائے اور ایک مقتدی۔ اکیلے ہیں یا بدقسمتی سے دوسرے ساتھی نماز نہیں پڑھتے تو آپ سے جماعت کی مسئولیت نہیں ہوگی۔ آپ کے قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے جہاں نماز جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے یا ہے مگر غیر مسلم ادارہ آپ کو چھٹی نہیں دیتا تو ظہر کی نماز پڑھ لیا کریں۔ روزے باقاعدہ رکھیں، صبح صادق اور غروب کے اوقات کسی قریب ترین اسلامک سینٹر سے معلوم کرلیں۔ غروب کا وقت تو ہر ملک میں اخبارات وغیرہ سے معلوم ہوجاتا ہے۔

ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھنا

سوال: میں کسی کے ہاں مہمان تھا، رات کو جنابت ہوگئی، غسل واجب ہوگیا، شرم کے بارے میزبانوں کو بتایا نہیں اور معمول کے مطابق وضو کرکے نماز پڑھ لی، اب کیا کروں؟
(اویس یار افغانی۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: مشہور مقولہ ہے کہ "شرع میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے" انسانی احوال و کیفیات کو سب جانتے ہیں، آپ کو اپنے میزبان کو بتادینا چاہئے تھا کہ مجھے غسل کرنا ہے، سب سے زیادہ حیا تو بندے کو رب سے کرنا چاہئے۔ حالتِ جنابت میں نماز پڑھ کر آپ نے گناہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کریں اور اس نماز کی قضا بھی پڑھیں۔

بڑی مسجد کی تعریف

سوال: آپ نے تفہیم المسائل میں لکھا ہے کہ بڑی مسجد میں نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں، بڑی مسجد کی تعریف کیا ہے؟ (ابوالمجاہد محمد عبدالرشید ہمایوں۔ گلستان جوہر، کراچی)۔

جواب: میں نے مسئلہ یہ تحریر کیا تھا کہ "مسجدِ صغیر" میں نمازی کہیں بھی کھڑا ہو، دیوارِ محراب تک اس کے آگے سے گزرنا سترہ کے بغیر جائز نہیں ہے، البتہ "مسجدِ کبیر" یا کھلے میدان میں ایک محدود فاصلے کے بعد نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حالتِ قیام میں آدابِ نماز کے

مطابق نمازی اپنے "مقامِ سجدہ" پر نظر جمائے رکھے تو آگے جتنی جگہ تک اس کی نظر پھیل سکتی ہے، وہاں تک نہیں گزر سکتے، اس کے آگے سے گزرنا جائز ہے۔

"مسجدِ کبیر" کی تعبیر کے بارے میں فقہاءِ کرام کے مختلف اقوال ہیں، مثلاً یہ کہ اس کا طول وعرض ۴۰ یا ۶۰ ذراع شرعی یعنی مروجہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے کم نہ ہو۔ ہم آسانی اور سہولت کے لئے کم از کم مقدار پر فتویٰ دے سکتے ہیں، یعنی یہ کہ مسجد کا طول وعرض ۲۰ میٹر سے زیادہ ہو تو نمازی کے آگے سے تین صف کے بعد سترہ کے بغیر بھی گزر سکتے ہیں اور جو صاحبان احتیاط کرنا چاہیں وہ ۳۰ میٹر طول وعرض کو معیار بنا سکتے ہیں۔

فاسق کی اذان

سوال: ہماری ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں کوئی مؤذن نہیں ہے۔ بعض اوقات امام کو دیر ہو جاتی ہے، کیا اس صورت میں داڑھی منڈا ہوا شخص اذان واقامت کہہ سکتا ہے؟

(عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)۔

جواب: شرعاً داڑھی منڈا فاسق معلن ہے، اور فاسق معلن کو مؤذن مقرر نہیں کرنا چاہئے لیکن جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے کہ یہ عام معمول کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ شاذ و نادر ہی ایسی صورت پیش آجاتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: "اور فاسق کا اذان دینا مکروہ ہے لیکن اگر دے دی گئی تو اعادہ نہیں کیا جائے گا، ذخیرہ میں یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے"۔

(ج ۱، ص ۵۴، مطبع رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "توفیق" سے مجھ پر جو بات آشکار ہوئی، وہ یہ ہے کہ شریعت میں اذان کا مقصودِ اصلی یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت داخل ہو چکا ہے، پھر یہ ہر علاقے میں اسلام کا شعار بن گیا تو اس اعتبار سے کہ دخولِ وقتِ نماز کی بابت اور اس ضمن میں مؤذن کے قول کے معتبر ہونے کے لئے چند شرائط ہیں، یعنی مسلمان، عاقل وبالغ اور عالم ہونا۔ اور اس سے پہلے "معین الاحکام" کے حوالے سے ہم بتا چکے ہیں کہ جب مؤذن مسلمان، مرد، عاقل وبالغ اور اوقاتِ نماز کا جاننے والا ہو تو اس کے اعلانِ دخولِ وقتِ نماز کے لئے اتنا ہی (یعنی اذان) کافی ہے اور اس کے قول پر اعتبار کیا جائے۔ آگے چل کر علامہ شامی،

مجنون، ناقص العقل نشے میں مدہوش، وغیرہ افراد کی اذان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے مقصدِ اذان تو حاصل ہو جائے گا لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان سب کی اذان کا اعادہ مستحب ہے۔ پھر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ بظاہر اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اذان کا اعادہ اس صورت میں مستحب ہے جبکہ اذان کے لئے باقاعدہ شرعی شرائط کا حامل مؤذن مقرر ہو، لیکن اگر ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود ہو جو اوقاتِ نماز کے جاننے والے ہوں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی فاسق یا کم عقل بچہ اذان دے تو ایسی اذان نہ تو مکروہ ہے اور نہ ہی اس کا اعادہ کیا جائے گا کیونکہ اذان کا مقصد حاصل ہو چکا"۔

(فتاویٰ شامی: ج ۲، ص ۵۸۔ ۵۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے فتاویٰ شامی کے حوالہ سے فاسق کی اذان کے اعادہ کو مستحب قرار دیا ہے"۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۲، ص ۳۸۸ مطبوعہ مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی)

قضاء نمازوں کے ہوتے ہوئے صلوٰۃ التسبیح پڑھنا

سوال: زید فرض نمازوں کے ساتھ قضاء نمازیں ادا کر رہا ہے تو کیا زید مہینے میں ایک بار "صلوٰۃ التسبیح" پڑھ سکتا ہے، (عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی)

جواب: صلوٰۃ التسبیح بڑی فضیلت والی نماز ہے، لہٰذا مہینے میں ایک بار تو کیا اگر کوئی مرد صالح اسے روز ایک بار پڑھے تو نہایت سعادت، اجر وثواب اور خیر وبرکت کی بات ہے۔ لیکن سوال میں آپ نے قضاء نماز کے ساتھ تقابل کر کے اسے پڑھنے کا مسئلہ دریافت فرمایا ہے، جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے پاس اتنا ہی وقت ہے کہ وقتی فرض نماز کو پڑھنے کے بعد یا تو اپنے ذمے واجب الادا قضاء نمازیں پڑھ لے یا صلوٰۃ التسبیح پڑھے، تو ایسی صورت میں نوافل پر قضاء نماز کو ترجیح دینی چاہئے۔ چند ہفتے قبل ہم اسی کالم میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے حوالے سے حضرت علی کا یہ قول نقل کر چکے ہیں جس کے ذمہ فرائض کی قضاء باقی ہو، اس کے سنت اور نوافل مقبول نہیں ہیں۔ اور سر پر قضاء نمازوں کا بوجھ لدا ہو اور کوئی شخص ان سے عہدہ برآ ہونے کے بجائے نوافل پڑھتا رہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص بارِ قرض تلے دبا ہو اور قرض ادا کرنے کے بجائے خیرات بانٹتا پھرے۔

''بکثرت قضا نمازیں باقی ہوں تو ان کی ادائیگی کے لئے سنن مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں'' اس مسئلے پر ایک فتویٰ اور اس کا جواب

سوال: عرض یہ ہے کہ آپ کی تفہیم المسائل جلد اول کے صفحہ نمبر ۱۱۷ پر ایک سائل نے آپ سے سوال کیا کہ کیا قضا نمازیں ادا کرنے کے لئے سنت مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: چھوڑ سکتے ہیں، میں نے بھی ایسا کرنا شروع کر دیا، مگر ایک صاحب نے کہا ایسا کرنا غلط ہے، پھر میں نے ایک دارالافتاء سے فتویٰ لیا؟ جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں، برائے مہربانی تفصیلی جواب عنایت فرمائیں، (عرفان اللہ قادری، کراچی)

جواب: پہلے وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے، جو عرفان اللہ قادری صاحب نے ''دارالافتاء اہلسنت'' سے حاصل کر کے ہمیں ارسال فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

صورتِ مستفسرہ میں زید اپنی قضا نمازوں کی ادائیگی کے لئے سنتِ مؤکدہ نہیں چھوڑ سکتا کہ سنت مؤکدہ کا ترک اساءت اور نادراً ترک پر عتاب اور ترک کی عادت پر استحقاق عذاب ہے، خاتم المحققین علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَالسُّنَنُ نَوْعَانِ، سُنَّةُ الْهُدٰى وَتَرْكُهَا يُوْجِبُ اِسَاءَةً وَكَرَاهِيَةً.

''اور سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک ''سنت الہدیٰ'' اور ان کا چھوڑنا گناہ اور کراہیت کا سبب بنتا ہے''۔ (ردالمحتار ج۱ ص ۲۱۸، دارالکتب العلمیہ)

علامہ علاؤالدین حصکفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَحُكْمُهَا مَا يُؤْجَرُ عَلٰى فِعْلِهٖ وَيُلَامُ عَلٰى تَرْكِهٖ

''اور ان کا حکم یہ ہے کہ کرنے پر ثواب ملے گا اور چھوڑنے پر ملامت کیا جائے گا''۔

(الدرالمختار معہ شامی ج۱ ص ۲۰۰، دارالکتب العلمیہ)

اس کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمہ تلویح کے حوالے سے فرماتے ہیں:

تَرْكُ السُّنَّةِ الْمُؤَكَّدَةِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْحَرَامِ يَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَةِ لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ: "مَنْ تَرَكَ سُنَّتِيْ لَمْ تَنَلْ شَفَاعَتِيْ" وَفِي التَّحْرِيْرِ: اَنَّ تَارِكَهَا يَسْتَوْجِبُ التَّضْلِيْلَ وَاللَّوْمَ اهـ وَالْمُرَادُ

اَلتَّرْكُ بِلَا عُذْرٍ عَلٰى سَبِيْلِ الْاِصْرَارِ كَمَا فِيْ "شَرْحِ التَّحْرِيْرِ" لِابْنِ اَمِيْرِ حَاجٍّ.

''سنت مؤکدہ کا چھوڑنا حرام کے قریب ہے اور ایسا شخص شفاعت سے محروم ہونے کا مستحق ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ''جس نے میری سنت کو چھوڑا، وہ میری شفاعت کو نہیں پائے گا'' اور ''تحریر'' میں ہے کہ تارکِ سنت گمراہ قرار دیئے جانے اور ملامت کا سزاوار ہے، مراد یہ ہے کہ جو سنت کو کسی عذر کے بغیر چھوڑے اور اس ترک پر اصرار کرے، جیسا کہ ابن امیر حاج کی ''شرح التحریر'' میں ہے''۔

(ردالمحتار ج۱ ص ۲۲۰، دارالکتب العلمیہ)

یہی علامہ شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قَوْلُهٗ (وَسَنَّ مُؤَكَّدًا) اَيْ اِسْتِنَانًا مُؤَكَّدًا بِمَعْنٰى اَنَّهٗ طَلَبَ طَلَبًا مُؤَكَّدًا زِيَادَةً عَلٰى بَقِيَّةِ النَّوَافِلِ وَلِهٰذَا كَانَتِ السُّنَّةُ مُؤَكَّدَةً قَرِيْبَةً مِّنَ الْوَاجِبِ فِيْ لُحُوْقِ الْاِثْمِ كَمَا فِي الْبَحْرِ.

''ان (علامہ حصکفی) کا قول (اور سنت قرار دیا گیا ہے تاکید کے ساتھ) یعنی اس کا سنت ہونا تاکیداً ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ باقی نوافل کے مقابلے میں (شارع نے) زیادہ تاکید کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ لہٰذا سنت مؤکدہ (بصورتِ ترک) گناہ کو لاحق ہونے میں واجب کے قریب ہے، جیسے کہ تحریر میں ہے''۔

مذکورہ بالا عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سنت مؤکدہ کی بہت تاکید آئی ہے، جو بلا عذر ایک بار بھی ترک کرے تو مستحقِ ملامت ہے، اور ترک کی عادت کرے تو فاسق مردود الشہادۃ، مستحقِ نار ہے، اور بعض ائمہ نے فرمایا کہ وہ گمراہ ٹھہرایا جائے گا اور گناہ گار ہے، اگرچہ اس کا گناہ واجب کے ترک سے کم ہے۔ تلویح میں ہے کہ اس کا ترک قریب حرام کے ہے۔ اس کا تارک اس بات کا مستحق ہے کہ معاذ اللہ شفاعت سے محروم ہو جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جو میری سنت کو ترک کرے گا اسے میری شفاعت نہ ملے گی، سنت مؤکدہ کو سنن الہدیٰ بھی کہتے ہیں۔

صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: قضاء نوافل سے اہم ہیں، یعنی جس وقت نفل پڑھتا، انہیں چھوڑ کر ان کے بدلے قضائیں پڑھے کہ بری الذمہ ہو جائے، البتہ تراویح اور

بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہ چھوڑے"۔ (بہارشریعت ص ۴۷ حصہ چہارم مکتبہ رضویہ)

کتبہ مفتی محمد فاروق العطاری المدنی

تصدیق وتصویب مفتی محمد ابوبکر صدیق العطاری،

دارالافتاء اہلسنت، جامع مسجد کنزالایمان

مورخہ: ۱۷رستمبر ۲۰۰۱ء

ہمارا جواب ایک خاص سیاق وسباق (Context) میں تھا کہ ایک خاتون کے ذمے چالیس سال کی قضاء نمازیں ہیں اور وہ خاتون وقتی فرض بھی بہ مشکل ادا کر پاتی ہیں، ہم نے ان کے تفصیلی سوال کو اختصار کے ساتھ لکھا تھا، اب سوال یہ درپیش تھا کہ وقتی فرض نماز کے علاوہ ان میں جتنی استطاعت ہے، اس میں اگر سنت مؤکدہ پڑھتی ہیں تو ماضی کی قضاء نمازیں رہ جاتی ہیں، اور اگر اس وقت میں ماضی کی قضاء نمازیں پڑھتی ہیں تو وقتی نماز کی "سننِ مؤکدہ" رہ جاتی ہیں تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ قضاء نماز پڑھنے کو ترجیح دے یا وقتی "سننِ مؤکدہ" کو؟۔ تو ہم نے لکھا تھا کہ ماضی کی قضاء نمازوں کو ترجیح دے۔ اس سے العیاذ باللہ! سنتوں کا استخفاف یا ان کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی نے ہماری تحریر سے یہ تاثر لیا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عفو ومغفرت کے طلب گار ہیں کہ ہم اپنا پورا مفہوم اپنے قارئین تک نہ پہنچا سکے۔ "سننِ مؤکدہ" کے فقہی احکام وہی ہیں جو مذکورہ بالا فتوے میں بیان کیے گئے ہیں۔ جہاں "سنت مؤکدہ" کے ترک کو "تضلیل اور ملامت" کا موجب قرار دیا گیا ہے وہ بلا عذر اور اصرار پر محمول ہے، علامہ شامی نے ابن الامیر حاج کی "شرح التحریر" کے حوالے سے یہی بات لکھی جس کا مذکورہ بالا فتویٰ میں حوالہ دیا گیا ہے۔

فقہ میں ایک اصول "اَلْاَهَمُّ فَالْاَهَمُّ" ہے، یعنی بعض اوقات ایک چیز اہم ہوتی ہے، لیکن جب اس کا اہم ترین چیز سے تعارض ہو جائے تو اہم ترین کے مقابلے میں اہم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَلَا يَجُوزُ تَرْكُهَا لِعَالِمٍ صَارَ مَرْجِعاً فِي الْفَتَاوٰى (بِخِلَافِ بَاقِي السُّنَنِ) فَلَهُ تَرْكُهَا لِحَاجَةِ النَّاسِ اِلٰى فَتْوَاهُ.

"اور فجر کی سنتوں کا ایسے عالم کے لئے بھی چھوڑنا جائز نہیں ہے جس سے عامۃ المسلمین

فتویٰ کے لئے رجوع کرتے ہوں، جبکہ ایسا "مرجع فی الفتاویٰ" باقی سننِ مؤکدہ کو چھوڑ سکتا ہے، کیونکہ لوگوں کو اس سے فتویٰ لینے کی ضرورت ہوتی ہے"۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(فَلَهُ تَرْكُهَا الخ) اَلظَّاهِرُ اَنَّ مَعْنَاهُ اَنَّهُ يَتْرُكُهَا وَقْتَ اِشْتِغَالِهِ بِالْاِفْتَاءِ لِاَجْلِ حَاجَةِ النَّاسِ الْمُجْتَمِعِيْنَ عَلَيْهِ وَيَنْبَغِيْ اَنْ يُّصَلِّيَهَا اِذَا فَرَغَ فِي الْوَقْتِ وَظَاهِرُ التَّفْرِقَةِ بَيْنَ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَغَيْرِهَا اَنَّهُ لَيْسَ لَهُ تَرْكُ الصَّلٰوةِ الْجَمَاعَةِ لِاَنَّهَا مِنَ الشَّعَائِرِ فَهِيَ اٰكَدُ مِنْ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَلِذَا يَتْرُكُهَا لَوْخَافَ فَوْتَ الْجَمَاعَةِ، وَاَفَادَ اَنَّهُ يَنْبَغِيْ اَنْ يَّكُوْنَ الْقَاضِيْ وَطَالِبُ الْعِلْمِ كَذٰلِكَ لَاسِيَّمَا الْمُدَرِّسُ، اَقُوْلُ: فِي الْمُدَرِّسِ نَظَرٌ، بِخِلَافِ الطَّالِبِ اِذَا خَافَ فَوْتَ الدَّرْسِ اَوْ بَعْضَهُ تَاَمَّلْ.

"(اس کے لئے سننِ مؤکدہ کا چھوڑنا جائز ہے) اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ جب فتویٰ دینے میں مشغول ہو تو سنت مؤکدہ کو چھوڑ دے، کیونکہ جو لوگ فتویٰ لینے کے لئے جمع ہیں، ان کی ضرورت ہے، ہاں جب فتویٰ دینے سے فارغ ہو جائے اور نماز کا وقت ہے تو سنتیں پڑھ لے، سنتِ فجر اور باقی سننِ مؤکدہ میں اس فرق سے عیاں ہے کہ اس کی خاطر جماعتِ نماز کو نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا، شعائرِ اسلام میں سے ہے اور اس کی تاکید سنتِ فجر سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا اگر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو سنتِ فجر کو چھوڑ دے، طیبی نے اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ہے کہ قاضی (اگر قضاء میں مشغول ہے) اور طالب علم (اگر استاذ سے سبق پڑھنے میں مشغول ہے) اور اسی طرح مدرس بھی سننِ مؤکدہ کو چھوڑ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مدرس کے لئے ترکِ سنت کی رخصت محلِ نظر ہے، بخلاف طالب علم کے کہ جب اس کا کل یا بعض سبق فوت ہونے کا اندیشہ ہو (تو اس کی رخصت قابل فہم ہے) اس باریکی پر غور کریں (یعنی طالب علم کے لئے تو مجبوری ہے، استاذ کے لئے مجبوری نہیں ہے)"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار ج ۲ ص ۳۹۵، داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ حصکفی اور علامہ شامی کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مفتی کے لئے فتویٰ دینا فرضِ کفایہ ہے۔ لہٰذا وہ سنتِ فجر کے سوا باقی "سننِ مؤکدہ" چھوڑ سکتا ہے، جبکہ وہ عامۃ المسلمین کے لئے مرجع فتاویٰ ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ البتہ فتوے کے بعد وقت ملے تو پڑھ لے۔

اسی طرح سنتِ فجر بھی، جن کی تاکید باقی ''سننِ مؤکدہ'' سے زیادہ ہے، اگر جماعتِ فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو چھوڑ دے، کیونکہ جماعت شعائرِ دین میں سے ہے اور سنتِ فجر سے اس کی تاکید زیادہ ہے۔ ''تخصص فی الدین'' اور ''تفقہ فی الدین'' بھی چونکہ فرض کفایہ ہے' اس لئے اگر طالب علم کے سبق اور سنتِ مؤکدہ میں تعارض ہو جائے تو وہ سنتیں چھوڑ سکتا ہے۔ اور قضاء نماز تو فرض عین ہے، اور اس کی تاکید جماعت اور سنتِ فجر سے زیادہ ہے، تو بصورتِ تعارض اسے ترجیح دی جائے گی۔ عام حالات میں تو سنتیں چھوڑنے کا وہی حکم ہے جو مذکورہ بالا فتویٰ میں بتایا گیا ہے، البتہ ''مردود الشہادۃ'' ہونے کا جو مفتی صاحب نے ذکر فرمایا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے کیونکہ قرآن نے صرف ''محدود فی القذف'' کو مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔

یہ امر بھی واضح ہو کہ سنن اپنی اصل کے اعتبار سے، خواہ مؤکدہ ہوں یا غیر مؤکدہ، نفلی عبادت ہیں۔ البتہ اہمیت اور حکم شرعی کے اعتبار سے نفل محض' سنتِ غیر مؤکدہ اور سنتِ مؤکدہ میں فرق ہے، تعارض کے وقت تدریج کا اعتبار ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''شیطان کا بڑا دھوکا ہے کہ آدمی کو نیکی کے پردے میں ہلاک کرتا ہے، نادان سمجھتا ہی نہیں، نیک کام کر رہا ہوں، اور نہ جانا کہ نفل بے فرض نرے دھوکے کی ٹٹی ہے، اس کے قبول کی امید تو مفقود اور اس کے ترک کا عذاب گردن پر موجود۔ اے عزیز! فرض خاص سلطانی قرض ہے اور نفل گویا تحفہ و نذرانہ۔ قرض نہ دیجئے اور بالائی بیکار تحفے بھیجئے وہ قابل قبول ہوں گے خصوصاً اس شہنشاہ غنی کی بارگاہ میں جو تمام جہان و جہانیاں سے بے نیاز ہے''۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۱۷۸، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)

اور آگے چل کر حدیث کا حوالہ دیتے ہیں:

لما حضر ابابكر الموت دعا عمر فقال اتق الله ياعمر واعلم ان له عملا بالنهار لايقبله بالليل وعملا بالليل لايقبله بالنهار واعلم انه لايقبل نافلة حتى تؤدى الفريضة الحديث.

''جب خلیفہ رسول اللہ ﷺ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نزع کا وقت ہوا امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: اے عمر! اللہ سے ڈرنا اور جان لو کہ اللہ

کے کچھ کام دن میں ہیں کہ انہیں رات میں کرو تو قبول نہ فرمائے گا اور کچھ کام رات میں کہ انہیں دن میں کرو تو مقبول نہ ہوں گے، اور خبردار رہو کہ کوئی نفل قبول نہیں ہوتا جب تک فرض ادا نہ کر لیا جائے، الحدیث

(حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۶، دار الکتاب العربی بیروت، الجامع الکبیر ج ۱۳ ص ۵۳، مسند ابوبکر صدیق رقم الحدیث: ۱۸۹)''۔

امام احمد رضا قادری مزید لکھتے ہیں:

''حضور پرنور سیدنا غوث اعظم مولائے اکرم حضرت شیخ محی الملۃ والدین ابو محمد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب مستطاب فتوح الغیب شریف میں کیا کیا جگر شگاف مثالیں ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمائی ہیں جو فرض چھوڑ کر نفل بجالائے، فرماتے ہیں: اس کی کہاوت ایسی ہے جیسے کسی شخص کو بادشاہ اپنی خدمت کے لئے بلائے، یہ وہاں تو حاضر نہ ہوا اور اس کے غلام کی خدمت گاری میں موجود ہے۔ پھر حضرت امیر المومنین مولی المسلمین سیدنا مولیٰ علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے اس کی مثال نقل فرمائی کہ جناب ارشاد فرماتے ہیں: ایسے شخص کا حال اس عورت کی طرح ہے جسے حمل رہا جب بچہ ہونے کے دن قریب آئے اسقاط ہو گیا اب وہ نہ حاملہ ہے نہ بچہ والی۔ یعنی جب پورے دنوں پر آ کر اسقاط ہو تو محنت تو پوری اٹھائی اور نتیجہ خاک نہیں کہ اگر بچہ ہوتا تو ثمرہ موجود تھا، حمل باقی رہتا تو آگے امید لگی تھی' اب نہ حمل نہ بچہ' نہ امید نہ ثمرہ اور تکلیف وہی جھیلی جو بچہ والی کو ہوتی۔ ایسے ہی اس نفل خیرات دینے والے کے پاس سے روپیہ تو اٹھا مگر جبکہ فرض چھوڑا یہ نفل بھی قبول نہ ہوا تو خرچ کا خرچ ہوا اور حاصل کچھ نہیں۔ اسی کتاب مبارک میں حضور مولیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ:

فَاِنِ اشْتَغَلَ بِالسُّنَنِ وَالنَّوَافِلِ قَبْلَ الْفَرَائِضِ لَمْ يُقْبَلْ مِنْهُ وَاُهِيْنَ۔

''اگر فرض چھوڑ کر سنت و نفل میں مشغول ہو گا یہ قبول نہ ہوں گے اور خوار کیا جائے گا''۔

(فتوح الغیب مع الشرح ص ۲۷۳)

یوں ہی شیخ محقق مولانا عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اس کی شرح میں فرمایا کہ:

ترک آنچہ لازم وضروری ست واہتمام بآنچہ نہ ضروری است از فائدہ عقل وخرد دور است چہ دفع ضرر اہم ست بر عاقل از جلب نفع بلکہ بحقیقت نفع دریں صورت منتفی است۔

"لازم اور ضروری چیز کا ترک اور جو ضروری نہیں اس کا اہتمام، عقل و خرد میں فائدہ سے دور ہے کیونکہ عاقل کے ہاں حصولِ نفع سے دفعِ ضرر اہم ہے بلکہ اس صورت میں نفع منتفی ہے"۔ (فتوح الغیب مع شرح عبدالحق الدہلوی ص ۲۷۳)

حضرت شیخ الشیوخ امام شہاب الملۃ والدین سہروردی قدس سرہ العزیز عوارف شریف کے باب الثامن والثلثین میں حضرت خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل فرماتے ہیں:

بَلَغَنَا اَنَّ اللّٰهَ لَايَقْبَلُ نَافِلَةً حَتّٰى يُؤَدِّىَ فَرِيْضَةً يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَثَلُكُمْ كَمَثَلِ الْعَبْدِ السُّوْءِ بَدَأَ بِالْهَدِيَّةِ قَبْلَ قَضَاءِ الدَّيْنِ۔

"ہمیں خبر پہنچی کہ اللہ عزوجل کوئی نفل قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ فرض ادا کیا جائے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہاوت تمہاری بد بندہ کی مانند ہے جو قرض ادا کرنے سے پہلے تحفہ پیش کرے، (عوارف المعارف ملحق باحیاء العلوم باب ۳۸ ص ۱۶۸، مکتبہ و مطبع المشہد الحسینی قاہرہ)"۔

خود حدیث میں ہے: حضور پر نور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

اربع فرضهن الله فی الاسلام فمن جاء بثلث لم يغنين عنه شيئاً حتى ياتى بهن جميعاً الصلوٰة والزكوٰة وصيام رمضان وحج البيت۔ رواه الامام احمد فی مسنده بسند حسن عن عمارة بن حزم رضی الله تعالى عنه۔

"چار چیزیں اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض کی ہیں جو ان میں سے تین ادا کرے وہ اسے کچھ کام نہ دیں جب تک پوری چاروں نہ بجا لائے نماز، زکوٰۃ، روزہ رمضان، حج کعبہ، (اسے امام احمد نے اپنی مسند میں سند حسن کے ساتھ حضرت عمارہ بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، (مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۰۱، دار الفکر بیروت، کنز العمال، ج ۱، ص ۳۰، مؤسسۃ الرسالہ بیروت)"۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

امرنا باقام الصلوٰة وايتاء الزكوة ومن لم يزك فلا صلوٰة له۔ رواه الطبرانی فی الكبير بسند صحيح۔

"ہمیں حکم دیا گیا کہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز قبول نہیں۔
اسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔
(مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۶۲، دار الفکر بیروت)

سبحان اللہ! جب زکوٰۃ نہ دینے والے کی نماز، روزہ، حج تک مقبول نہیں تو اس نفل خیرات نام کی کائنات سے کیا امید ہے بلکہ انہی سے اصبہانی کی روایت میں آیا کہ فرماتے ہیں:

من اقام الصلوٰة ولم يؤت الزكوٰة فليس بمسلم ينفعه۔

"جو نماز ادا کرے اور زکوٰۃ نہ دے وہ مسلمان نہیں کہ اسے اس کا عمل کام آئے"۔
(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۰ ص ۱۸۱-۱۷۹ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن)

فرض کی قضاء بھی فرض ہے اور امام احمد رضا قادری کے بقول جو فرض چھوڑ کر سنت اور نفل میں مشغول ہوگا، یہ قبول نہ ہوں گے اور ایسا شخص جو فرائض کو ترک کر کے سنت و نفل میں مشغول ہوگا، وہ رسوا ہوگا۔ اسلام کی تعلیمات اور فکر اعلیٰحضرت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے کہ اہلسنت بعض مخصوص راتوں اور مخصوص مواقع پر ساری ساری رات عبادت و قیام اور نعت و درود وسلام میں گزار دیتے ہیں، لیکن اپنی روزمرہ زندگی میں فرائض کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو ان کا حق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال کی نمازوں کا بار قضاء ان کے سر پر رہتا ہے اور لمحہ موت کب مقدر ہے، کوئی ایک پل کی گارنٹی نہیں دے سکتا، میں نے مسئلہ ایسے لوگوں پر فرض کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے لکھا تھا اور میری ناقص فہم کے مطابق اعلیٰحضرت کی فکر بھی یہی ہے۔ باقی صورت مسئولہ کے برعکس کہ کبھی کبھار کسی کی نماز رہ جائے، جبکہ وہ عادتاً نمازی ہو تو ایسے اشخاص کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اَلْاِشْتِغَالُ بِالْفَوَائِتِ اَوْلٰى وَاَهَمُّ مِنَ النَّوَافِلِ اِلَّا السُّنَنَ الْمَعْرُوْفَةَ۔

"سنن مؤکدہ کے علاوہ دیگر نوافل پڑھنے سے قضاء نمازوں کی ادائیگی میں مشغول ہونا اولیٰ اور اہم ہے"۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۱۲۵)

نماز کے لئے کپڑے اڑسنے، موڑنے اور سمیٹنے اور آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کے مسائل

سوال: بعض لوگ نماز پڑھنے کے لئے جب کھڑے ہوتے ہیں تو شلوار اور پاجامے کو نیفے سے

اڑس لیتے ہیں، بعض لوگ پینٹ کے پائچے کو تہبیں بنا کر موڑتے ہیں، بعض لوگ رکوع وسجود میں جاتے وقت کپڑوں کو سمیٹ لیتے ہیں، بعض کی آستینیں چڑھی ہوتی ہیں اور اسی حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور بعض لوگ بشرٹ پہن کر نماز پڑھتے ہیں، جن کی آستینیں ہاف کٹ ہوتی ہیں، کہنیوں تک یا کہنیوں سے اوپر تک، ان سب کا کیا حکم ہے۔

(مولانا سید نذیر احمد شاہ، خطیب جامع مسجد اسکاؤٹ کالونی)

جواب: حدیث پاک میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو سات (اعضاء) پر سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اور بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۱۰۰۱)۔ اس حدیث میں ''کفتِ ثوب'' سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پائچے کی تہبیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تہبیں بنا کر موڑنا یا جسے عرفِ عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ''تشمیر'' کہتے ہیں، اس پر بھی ''کفتِ ثوب'' کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں: ''اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔''

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ''شرح المنیہ'' سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ''القنیہ'' میں کہا ہے کہ: ''اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے''۔ اس کی مثال یوں ہے، جیسے اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائی، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کی اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو گیا، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول

دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ''اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجئے''۔

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ ''خلاصہ'' اور ''منیہ'' میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ''البحرالرائق'' میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ''کفتِ ثوب'' تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا ''آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟'' جواب دیا: ''ضرور مکروہ اور سخت وشدید مکروہ ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۳۱۱، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)۔ ''کفتِ ثوب'' کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہِ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہتِ تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہتِ تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیۃ البحرالرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کر دی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئتِ لباس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے، ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو۔''

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر ''کفتِ ثوب'' کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کر کے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ ''احکم الحاکمین'' کی بارگاہ میں حاضر ہو۔

اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے، عہدِ رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

امام کا مسجد میں ہوائی چپل پہن کر پھرنا

سوال: ہمارے محلے کی مسجد کے امام قاری صاحب گزشتہ ہفتہ سے مسجد میں ہوائی چپل پہن کر آ رہے ہیں۔ ایک دن کسی نمازی نے یہ سوچ کر سوال کر دیا کہ کہیں بھول کر چپل نہ پہن لی ہو، پوچھا "قاری صاحب! آپ نے بھول کر تو چپل نہیں پہنی"؟ اس پر قاری صاحب نے چار پانچ نمازیوں کی موجودگی میں جواب دیا کہ "یہ چپل پاک وصاف ہے، میں اسے پہن کر نماز بھی پڑھتا ہوں، بلکہ نماز پڑھا بھی سکتا ہوں"۔ اس جواب پر نمازیوں پر سکتہ طاری ہو گیا، سب نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی، لیکن اب یہ صورتحال فتنہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، از راہِ کرم اس مسئلے کی شرعی حیثیت بیان کر کے ہمیں مطمئن کریں؟ (آغا عبدالوحید خان، جہانگیر روڈ، کراچی)۔

جواب: صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان ہے "باب الصلوة فی النعال" اس باب کے تحت امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ ابو مسلمہ سعید بن زید ازدی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک سے پوچھا: "کیا نبی ﷺ جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا: "جی ہاں۔"

اس حدیث کے تحت علامہ بدر الدین ابو محمد محمود عینی متوفی ۸۵۵ھ نے جوتے پہن کر نماز پڑھنے یا جوتے کے اوپر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے اور ناپاک جوتے کے پاک ہونے کے مسائل اور اس سلسلے میں ائمہ کے اقوال بیان کئے ہیں، بحث کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ اس سے ایک مسئلہ یہ واضح ہوتا ہے کہ مسجد میں (پاک) جوتے پہن کر چلنا جائز ہے"۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری ج ۴ ص ۱۲۰۔۱۱۹ مطبوعہ بیروت)

لیکن چونکہ آج کل مساجد عہدِ نبوی ﷺ، اور عہدِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح کچی یا ریتلے فرش کی نہیں ہوتیں، بلکہ بہت صاف وشفاف پختہ فرش کی ہوتی ہیں، دریاں یا قالین بچھے ہوتے ہیں، اس لئے جوتے پہن کر ان پر چلنا پھرنا، خواہ وہ جوتے پاک ہی کیوں نہ ہوں، لوگوں کی نفاستِ طبع پر گراں گزرتا ہے اور اب جوتے پہن کر مساجد میں جانا یا چلنا پھرنا کہیں بھی معمول نہیں ہے، اس لئے امام صاحب کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے، یہ امر کوئی سنت ومستحب تو ہے نہیں کہ حصولِ ثواب کے لئے اس پر اصرار کیا جائے، زیادہ سے زیادہ یہ سنن زوائد میں سے ہے۔

چنانچہ شیخ نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ لکھتے ہیں:

"اور جوتے پہن کر مسجد میں داخل ہونا مکروہ ہے۔" فتاویٰ سراجیہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۲۱، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کئی صدیاں قبل بھی امتِ مسلمہ میں یہ مسئلہ معروف تھا کہ جوتے پہن کر مسجد میں نہیں جانا چاہئے اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی بات سے لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو جواز بلکہ بعض صورتوں میں افضلیت کے باوجود اس کا چھوڑ دینا بہتر ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے (حطیم کعبہ کی) دیواروں کی بابت پوچھا کہ کیا وہ بیت اللہ کا حصہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کیا تو انہیں بیت اللہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم (قریش) کے پاس (تعمیری فنڈ کی) کمی واقع ہو گئی تھی، (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا اس (بیت اللہ) کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم نے اسے بلند اس لئے رکھا تاکہ (ان کی اجارہ داری رہے اور) وہ جسے چاہیں بیت اللہ میں داخل ہونے دیں، اور اگر تمہاری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی اور ان میں زمانہ جاہلیت کے اثرات نہ ہوتے اور مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے ذہن اسے قبول نہیں کریں گے تو میں (حطیم کعبہ کی) دیواروں کو (عمارت) بیت اللہ میں شامل کر دیتا اور (بیت اللہ کے) دروازے کو سطح زمین سے ملا دیتا"۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۱۴۸۹، کتاب الحج)

امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول روایت کیا ہے: "لوگوں سے ان کے عرف کے مطابق بات کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (تمہاری بے تدبیری سے) اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے"۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ

(النحل: ۱۲۵)

"(لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلایئے

اوران سے بحث بھی کرنی ہوتو احسن طریقے سے کیجئے''۔

کسی امام یا مبلغِ دین کا کسی مسئلے کو جواز بنا کر مسلمانوں کی عقیدت کو مجروح کرنا حکمتِ دعوت وارشاد کے منافی ہے اور اپنے علمی زعم وافتخار میں مبتلا ہونے کی دلیل ہے۔ کسی مقدس ومتبرک مقام کی تعظیم کے لئے جوتے اتارنا قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ:۱۱۔۱۲)

''جب وہ (موسیٰ) آگ کے پاس آئے تو انہیں ندا کی گئی، اے موسیٰ! بیشک میں تیرا رب ہوں، تو (آپ) اپنے جوتے اتار دیں، یقیناً آپ وادیٔ مقدس طویٰ میں ہیں''۔

اس آیت کے تحت امام ابوعبداللہ محمد قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''(اس موقع پر) اللہ تعالیٰ سے کلام کے وقت عاجزی اور تواضع کے لئے جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا ہے اور سلف صالحین سے لے کر آج تک بیت اللہ کا طواف کرتے وقت تعظیماً جوتے اتار لئے جاتے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ وادیٔ مقدس کی تعظیم کے لئے یہ حکم ہوا، جیسا کہ حرم پاک کی تعظیم کے لئے جوتے پہن کر داخل نہیں ہوتے، اور آگے چل کر امام قرطبی ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت بشیر بن خصاصیہ جوتے پہن کر قبروں کے درمیان چل رہے تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا'' جب تم اس جگہ (یعنی قبرستان میں) ہوتو اپنے جوتے اتار لیا کرو''۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۱۱ ص ۱۷۳، مکتبہ الغزالی دمشق)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم وجوباً نہیں فرمایا بلکہ یہ استحباب کے درجے میں ہے، اور جب قبور اور اہل قبور کا اتنا ادب ہے تو مسجد کا ادب تو اس سے زیادہ ہونا چاہئے، کیونکہ حدیث پاک میں آیا ہے'' مسجدیں اللہ کا گھر ہیں (یعنی اس کی عبادت اور رحمت و برکت کے نزول کے مقدس مقامات ہیں)''۔

جمعہ کی سنتیں

سوال: جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے اور بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں اور ان کی ترتیب کیا ہے؟
(شوکت علی، نیو کراچی)

جواب: جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے چار سنتیں پڑھنی چاہئیں اور نماز جمعہ کے بعد چھ سنتیں، اس طرح کہ پہلے چار سنتیں پڑھ کر سلام پھیر دیں اور پھر دو سنتیں پڑھ کر سلام پھیریں۔

علامہ شمس الدین محمد بن احمد سرخسی المبسوط ج ۱ ص ۱۵۷ پر رقم طراز ہیں: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں میں اختلاف ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چار رکعت پڑھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا اسی پر عمل ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے وہ چار رکعت نماز پڑھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعت نماز پڑھتے تھے، پہلے چار رکعت، اس کے بعد دو رکعت، امام ابو یوسف کا اس پر عمل ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دو اور پھر چار رکعت نماز پڑھتے تھے، بعض علماء نے ظہر کے بعد کی سنتوں پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے تاکہ ایک فرض کے بعد اس کی مثل نفل پڑھنا لازم نہ آئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۲ میں ہے عطا کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے، پہلے دو رکعت پھر چار رکعت، جامع ترمذی ص ۱۰۱ پر ہے، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو رکعت پڑھی جائیں پھر چار، فقہاء احناف نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھی جائیں اور پھر دو، علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں فقہاء احناف کے حوالے سے یہی قول نقل کیا ہے، اس مسئلے کی پوری تفصیل شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ سعیدی صاحب کی ج ۲ ص ۴۴۵-۴۴۶ پر موجود ہے۔

مسافر قصر نماز کہاں سے شروع کرے؟

سوال: ایک شخص دیہات سے پندرہ دن سے کم کے ارادے سے سفر کرتا ہے۔ کیا قصر فوراً شروع ہوگی یا مقررہ فاصلہ طے کرنے کے بعد؟ (محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: اگر کوئی شخص اپنے شہر، قصبے یا گاؤں سے اتنی مسافت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے جو سفرِ

شرعی کہلاتا ہے اور جس سے قصر لازم ہے (یعنی ۹۸.۴۳۴۷ کلومیٹر یا ۶۱ میل ۴۶۰ گز)، تو جب وہ اپنی بستی کی حدود سے نکل کر جائے تو قصر شروع کر دے۔ شہروں اور قصبات کی حدود آج کل کارپوریشن اور میونسپلٹی یعنی بلدیاتی ادارے طے کرتے ہیں اور دیہاتوں کی حدود کو مقامی لوگ خود سمجھتے ہیں۔

قصر واجب ہے؟

سوال: جب کوئی آدمی جانتا ہو کہ قصر واجب ہے، مگر وہ پوری نماز پڑھے تو وہ کیسا ہے؟

(محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: احناف کے نزدیک حالتِ سفر میں قصر واجب ہے، لہٰذا قصر کو ترک کر کے پوری نماز پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔ درمختار میں ہے (یعنی) پوری نماز پڑھنا مسافر کے حق میں رخصت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والا گنہگار ہے۔

سفر میں سنتِ مؤکدہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال: کیا مسافر سنتِ مؤکدہ پڑھے یا نہ پڑھے، نیز کیا ایسا کوئی عذرِ شرعی ہے جس سے سنتِ مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟ (محمد الیاس، لانڈھی)

جواب: اگر مسافر دورانِ سفر اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے تو راستے میں وہ سنت مؤکدہ چھوڑ دے، اور اگر وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے اور حالتِ قرار و سکون میں ہے تو سنتِ مؤکدہ پڑھ لیا کرے اور پوری پڑھے، مگر فجر کی دو سنتیں ہر حال میں یعنی دورانِ سفر بھی پڑھے، کیونکہ فجر کی تاکید زیادہ آئی ہے۔ (فتاویٰ شامی طبع جدید، ج ۲، ص ۵۳۵)۔

فجر کی قضاء ظہر میں پڑھنا

سوال: کیا نماز فجر کی قضاء نماز ظہر کے بعد ایک ساتھ ادا کر سکتے ہیں؟

(محمد شاہد اعجاز۔ ناظم آباد، کراچی)

جواب: جی ہاں۔ بالکل پڑھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ صاحبِ ترتیب ہیں، شروع سے یا اب بن چکے ہیں، تو پہلے فجر کی قضاء پڑھیں، پھر ظہر کی ادا پڑھیں "صاحبِ ترتیب" وہ شخص ہے جس کی

کبھی چھ نمازیں مسلسل قضاء نہ ہوئی ہوں۔ اصل اور کامل صاحبِ ترتیب تو وہی کہلائے گا کہ جب سے بالغ ہوا ہے اور اس پر نمازیں فرض ہوئی ہیں اس نے کبھی چھ نمازیں تسلسل کے ساتھ قضاء نہیں کیں لیکن آج کل عملی تنزل کے دور میں فقہاء کرام اس کو بھی صاحبِ ترتیب شمار کرتے ہیں جو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں پچھلی نمازیں جو اس کے ذمے واجب الادا تھیں، ادا کر کے دوبارہ صاحبِ ترتیب بن گیا ہو اور اب اس پر مداومت و پابندی کر رہا ہو۔

دعا کے وقت ہاتھ کیسے رکھے جائیں

سوال: بعض لوگ دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مکمل ملا کر رکھتے ہیں، بعض ایک دو انگلیوں کی نوک ملا دیتے ہیں، بعض دونوں ہاتھوں کو الگ الگ رکھتے ہیں، صحیح طریقہ کیا ہے، سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کون سا طریقہ ہے، (مولانا علی عمران صدیقی...... اورنگی ٹاؤن)

جواب: اس مسئلے کی وضاحت سے پہلے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ شَيْءٍ مِنْ دُعَائِهٖ اِلَّا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ وَ اَنَّهٗ يَرْفَعُ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دعاء استسقاء (یعنی نزول بارش کی دعاء) کے سوا کسی اور دعاء میں اپنے ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے اور دعا استسقاء میں آپ ہاتھوں کو اتنا بلند فرماتے کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی نظر آتی"۔

(صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۴۰)

اس حدیث کی شرح میں امام نووی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعاء استسقاء کے سوا اور مواقع پر دعاء کے وقت اپنے ہاتھ نہیں اُٹھاتے تھے لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ "دعاء استسقاء" کے علاوہ اور بے شمار مواقع پر بھی دونوں ہاتھ اُٹھانا ثابت ہے اور میں نے "شرح المہذب" میں باب صفۃ الصلوٰۃ" کے آخر میں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی تقریباً تیس احادیث کو اس موضوع پر جمع کیا ہے، اور علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر "تبیان القرآن" (ج ۴، ص ۱۸۳۔۱۷۲) میں بیرون نماز ہاتھ اُٹھا کر دعاء کرنے کے موضوع پر چالیس احادیث مبارکہ مکمل حوالوں کے ساتھ درج کی

ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کی کیا تاویل کی جائے گی؟ تو اس کی تاویل یہ ہے کہ دیگر مواقع پر آپ دعاء میں ہاتھ اُٹھاتے تو تھے لیکن اس حد تک بلند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے' یا اس کی تاویل یہ کی جائے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے نہ دیکھا ہو لیکن اور صحابہ کرام نے دیکھا ہو کہ حضور ﷺ نے اکثر اوقات دعاء کے وقت ہاتھ اُٹھائے ہیں۔

اور قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں ایک قول اثبات کا ہو اور ایک نفی کا تو اثبات کو ترجیح دی جائے گی اور یہاں تو نفی کا قول کرنے والے ایک ہیں اور اثبات کا قول ایک جماعت کثیر کا ہے، (صحیح مسلم بشرح الامام ابوزکریا یحیٰ بن شرف النووی الدمشقی المتوفی ۶۷۶ھ، ج ۴، ص ۲۵۲۴ کتاب صلوٰۃ الاستسقاء)''۔

علامہ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

قَالَ النَّوَوِیُّ: قَالَ الْعُلَمَاءُ اَلسُّنَّۃُ فِیْ کُلِّ دُعَآءٍ لِرَفْعِ الْبَلَآءِ اَنْ یَّرْفَعَ یَدَیْہِ جَاعِلاً ظُھُوْرَ کَفَّیْہِ اِلَی السَّمَآءِ وَاِذَا دَعَا بِسُؤَالِ شَیْءٍ وَ تَحْصِیْلِہٖ اَنْ یَّجْعَلَ کَفَّیْہِ اِلَی السَّمَآءِ انتھٰی، وَقَالَ غَیْرُہٗ اَلْحِکْمَۃُ فِی الْاِشَارَۃِ لِظُھُوْرِ الْکَفَّیْنِ فِی الْاِسْتِسْقَاءِ دُوْنَ غَیْرِہٖ لِلتَّفَاؤُلِ بِتَقَلُّبِ الْحَالِ ظَھْرًا لِبَطْنٍ کَمَا قِیْلَ فِیْ تَحْوِیْلِ الرِّدَاءِ اَوْھُوَ اِشَارَۃٌ اِلٰی صِفَۃِ الْمَسْئُوْلِ وَ ھُوَ نُزُوْلُ السَّحَابِ اِلَی الْاَرْضِ۔

''امام نووی نے کہا ہے: علماء کہتے ہیں کہ دعاء میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جو دعاء کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے کی جائے اس میں دونوں ہاتھ بلند کیے جائیں اور ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف رکھی جائے، اور جب کسی نیک مقصد کے حصول کی دعاء کی جائے تب بھی ہاتھ اُٹھائے جائیں اور ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھا جائے، اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ دعاء استسقاء میں بطور خاص ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ہتھیلی کی جگہ پشت کو (اوپر کرکے) تبدیلیٔ حال سے نیک فال لینا ہے جیسا کہ اس موقع پر چادر کو پلٹ کر اوپر کا حصہ نیچے کیا جاتا ہے، یا اس طریقے سے جو چیز مانگی جارہی ہے اس کی ہیئت کی طرف اشارہ مقصود ہے (یعنی اے اللہ! جس طرح میری ہتھیلیوں کا رخ زمین کی طرف ہے اسی طرح تو اپنی قدرت سے) زمین پر

بارش نازل فرما، (فتح الباری ج ۳، ص ۲۱۲، مکتبہ دارالفکر، کتاب الاستسقاء)''۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء میں بالعموم ہاتھوں کو بلند کرنا سنت ہے۔ نماز استسقاء یا دعاء دفعِ شر میں ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف بھی کرسکتے ہیں، حصول خیر و برکت اور دیگر مواقع پر ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھنا چاہیے۔ دعاء استسقاء میں بھی دونوں اعتبارات ہو سکتے ہیں۔ ایک دفع شر کا یعنی قحط اور خشک سالی کا دور ہونا اور ایک حصول منفعت کا یعنی باران رحمت کا نزول اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ دعاء دفعِ شر میں ہتھیلیوں کی پشت کو جو آسمان کی طرف کرتے ہیں، یہ تبدیلی حال کے لیے نیک فال کے طور پر ہے، ہاتھ اتنے زیادہ بلند کرنا کہ بغلیں نظر آئیں، یہ بھی مستحب ہے۔ باقی چونکہ الفاظ حدیث میں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی کہیں ممانعت وارد نہیں ہوئی اس لیے دعا کے وقت ہاتھوں کو ملا کر (خواہ کسی بھی انداز سے ہوں) بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہاتھوں کو کھلا رکھنا سنت سے زیادہ قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

نماز میں کوئی سورت دوبارہ پڑھنا

سوال: نماز میں کوئی بھی سورت دوبارہ پڑھ لی جائے، یعنی بھول کر تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟
(محمد شاہد اعجاز، کراچی)

جواب: نماز صحیح طور پر ادا ہوجائے گی۔

سوال: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یاد نہ آرہی ہو تو کیا نماز توڑ کر دوبارہ پڑھیں؟

جواب: نماز مکمل کرکے سجدۂ سہو کرلیں، نماز صحیح ادا ہوجائے گی۔

مسبوق اپنی بقیہ نماز کس طرح ادا کرے؟

سوال: ایک شخص نے امام کی اقتداء کی اور آخری قعدے میں امام کے ساتھ آکر شامل ہوا، اب امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پڑھے، الٹی ترتیب سے یا سیدھی ترتیب سے؟ (م-الف-ع، کراچی)

جواب: جس مقتدی کی نماز کی ابتدائی ایک رکعت یا اس سے زائد نماز رہ گئی ہو اور وہ دوران نماز امام کے ساتھ آکر شامل ہوا، اسے فقہی اصطلاح میں مسبوق کہتے ہیں۔ آپ نے جو صورت سوال میں بیان کی ہے، اس کی رو سے وہ اپنی نماز صحیح ترتیب کے ساتھ ابتدا سے پڑھے گا، یعنی

ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کی کیا تاویل کی جائے گی؟ تو اس کی تاویل یہ ہے کہ دیگر مواقع پر آپ دعاء میں ہاتھ اُٹھاتے تو تھے لیکن اس حد تک بلند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے یا اس کی تاویل یہ کی جائے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے نہ دیکھا ہو لیکن اور صحابہ کرام نے دیکھا ہو کہ حضور ﷺ نے اکثر اوقات دعاء کے وقت ہاتھ اُٹھائے ہیں۔

اور قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں ایک قول اثبات کا ہو اور ایک نفی کا تو اثبات کو ترجیح دی جائے گی اور یہاں تو نفی کا قول کرنے والے ایک ہیں اور اثبات کا قول ایک جماعت کثیر کا ہے، (صحیح مسلم بشرح الامام ابوزکریا یحیٰی بن شرف النووی الدمشقی المتوفی ۶۷۶ھ، ج ۴،ص ۲۵۲۴ کتاب صلوٰۃ الاستقاء)''۔

علامہ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

قَالَ النَّوَوِيُّ: قَالَ الْعُلَمَاءُ اَلسُّنَّةُ فِيْ كُلِّ دُعَآءٍ لِرَفْعِ الْبَلَآءِ اَنْ يَّـرْفَعَ يَدَيْهِ جَاعِلًا ظُهُوْرَ كَفَّـيْهِ اِلَى السَّمَآءِ وَاِذَا دَعَا بِسُؤْالِ شَيْءٍ وَ تَحْصِيْلِهٖ اَنْ يَّجْعَلَ كَفَّيْهِ اِلَى السَّمَآءِ انتهى، وَقَالَ غَيْرُهٗ اَلْحِكْمَةُ فِي الْاِشَارَةِ لِظُهُوْرِ الْكَفَّيْنِ فِي الْاِسْتِسْقَاءِ دُوْنَ غَيْرِهٖ لِلتَّفَاؤُلِ بِتَقَلُّبِ الْحَالِ ظَهْرًا لِبَطْنٍ كَمَا قِيْلَ فِيْ تَحْوِيْلِ الرِّدَآءِ اَوْهُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى صِفَةِ الْمَسْئُوْلِ وَ هُوَ نُزُوْلُ السَّحَابِ اِلَى الْاَرْضِ۔

''امام نووی نے کہا ہے: علماء کہتے ہیں کہ دعاء میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جو دعاء کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے کی جائے اس میں دونوں ہاتھ بلند کیے جائیں اور ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف رکھی جائے، اور جب کسی نیک مقصد کے حصول کی دعاء کی جائے تب بھی ہاتھ اُٹھائے جائیں اور ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھا جائے، اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ دعاء استقاء میں بطور خاص ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ہتھیلی کی جگہ پشت کو (اوپر کرکے) تبدیلیٔ حال سے نیک فال لینا ہے جیسا کہ اس موقع پر چادر کو پلٹ کر اوپر کا حصہ نیچے کیا جاتا ہے، یا اس طریقے سے جو چیز مانگی جارہی ہے اس کی ہیئت کی طرف اشارہ مقصود ہے (یعنی اے اللہ! جس طرح میری ہتھیلیوں کا رخ زمین کی طرف ہے اسی طرح تو اپنی قدرت سے) زمین پر

بارش نازل فرما، (فتح الباری ج ۳،ص ۲۱۲، مکتبہ دارالفکر، کتاب الاستقاء)''۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء میں بالعموم ہاتھوں کو بلند کرنا سنت ہے۔ نماز استقاء یا دعاء دفع شر میں ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف بھی کر سکتے ہیں، حصول خیر و برکت اور دیگر مواقع پر ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھنا چاہئے۔ دعاء استقاء میں بھی دونوں اعتبارات ہو سکتے ہیں۔ ایک دفع شر کا یعنی قحط اور خشک سالی کا دور ہونا اور ایک حصول منفعت کا یعنی باران رحمت کا نزول اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ دعاء دفع شر میں ہتھیلیوں کی پشت کو جو آسمان کی طرف کرتے ہیں، یہ تبدیلی حال کے لیے نیک فال کے طور پر ہے، ہاتھ اتنے زیادہ بلند کرنا کہ بغلیں نظر آئیں، یہ بھی مستحب ہے۔ باقی چونکہ الفاظ حدیث میں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی کہیں ممانعت وارد نہیں ہوئی اس لیے دعا کے وقت ہاتھوں کو ملا کر (خواہ کسی بھی انداز سے ہوں) بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہاتھوں کو کھلا رکھنا سنت سے زیادہ قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

نماز میں کوئی سورت دوبارہ پڑھنا

سوال: نماز میں کوئی بھی سورت دوبارہ پڑھ لی جائے، یعنی بھول کر تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟

(محمد شاہد اعجاز، کراچی)

جواب: نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

سوال: نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یاد نہ آرہی ہو تو کیا نماز توڑ کر دوبارہ پڑھیں؟

جواب: نماز مکمل کر کے سجدۂ سہو کرلیں، نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

مسبوق اپنی بقیہ نماز کس طرح ادا کرے؟

سوال: ایک شخص نے امام کی اقتداء کی اور آخری قعدے میں امام کے ساتھ آکر شامل ہوا، اب امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پڑھے، الٹی ترتیب سے یا سیدھی ترتیب سے؟ (م-الف-ع، کراچی)

جواب: جس مقتدی کی نماز کی ابتدائی ایک رکعت یا اس سے زائد نماز رہ گئی ہو اور وہ دوران نماز امام کے ساتھ آکر شامل ہوا، اسے فقہی اصطلاح میں مسبوق کہتے ہیں۔ آپ نے جو صورت سوال میں بیان کی ہے، اس کی رو سے وہ اپنی نماز صحیح ترتیب کے ساتھ ابتدا سے پڑھے گا، یعنی

کھڑے ہو کر ثناء پڑھے پھر اعوذ باللہ، پھر بسم اللہ اور پھر حسب ترتیب پہلی دو رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورت ملائے گا اور آخری دو رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھے گا اور اس طرح اپنی نماز مکمل کرے گا۔ اگر چار رکعت والی نماز میں درمیان والے قعدے میں یا تیسری رکعت میں حالت قیام میں یا رکوع میں امام کے ساتھ ملا ہے تو وہ بعد میں اٹھ کر اپنی ابتدائی دو رکعت پڑھے جس میں ثناء (سبحانک اللّٰھم) اور تعوذ وتسمیہ (اعوذُ باللّٰہ، بسم اللّٰہ) کے بعد سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملائی جاتی ہے۔ اگر چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ ملا ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ مع سورت کے ساتھ پڑھے گا اور اس طرح اس کی اپنی دو رکعت ہو جائیں گی۔ اس کے بعد درمیانی قعدہ کرے گا، پھر اٹھ کر ایک رکعت فاتحہ مع سورت پڑھے گا اور آخری رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔ اگر وہ دوسری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہوا تو آخر میں اٹھ کر ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ سورت کے ساتھ پڑھ کر نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے گا۔

نوافل تہجد کی جگہ قضاء پڑھنا

سوال: ایک شخص کے ذمے قضاء نمازیں ہیں، لیکن اب وہ باقاعدہ تہجد گزار بھی ہے، تو اگر وہ نوافل تہجد کی جگہ قضاء نمازیں پڑھتا رہے تو کیا اسے تہجد کا ثواب ملے گا؟

(بہار احمد مشتاق۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: جب تک کسی کے ذمے قضاء نمازیں رہتی ہوں، اسے نوافل پر فرائض و واجبات کی قضاء کو ترجیح دینی چاہیے، کیونکہ زندگی کی گارنٹی کسی کے پاس نہیں ہے کہ کل آنے والا دن اسے نصیب ہوگا یا نہیں۔ نوافل کا اجر وثواب اور برکات اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن نوافل نہ پڑھنے پر آخرت میں مسئولیت نہیں ہوگی، جبکہ فرائض و واجبات کی آخرت میں جواب دہی لازمی ہے۔ لہٰذا تہجد کے نوافل کی جگہ وہ قضاء نمازیں پڑھنی چاہئیں جو کسی کے ذمے باقی ہیں۔ امام احمد رضا خان قادری نے فتاویٰ رضویہ میں متعدد حوالہ جات کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طویل وصیت نقل کی ہے جو انہوں نے عالم نزع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کی، اس طویل وصیت کے آخر میں فرمایا ”جان لو! جب تک فرائض ادا نہ کر دیے جائیں، نوافل قبول نہیں ہوں گے۔“

اسی طرح انہوں نے فتوح الغیب مؤلفہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اگر کوئی شخص فرائض کو چھوڑ کر سنت ونفل میں مشغول ہوگا تو یہ (بارگاہِ الٰہی میں) قبول نہیں ہوں گے اور وہ خوار ہوگا۔“ اسی طرح انہوں نے عوارف المعارف کے حوالے سے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ”ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جب تک فرائض ادا نہ کیے جائیں، اللہ تعالیٰ نوافل کو بھی قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہ تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو قرض تو ادا نہیں کرتا اور تحفے بانٹتا پھرتا ہے۔“ باقی جو شخص رات کے پچھلے پہر اپنی راحت ونیند کو قربان کر کے اٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، خواہ وہ گزشتہ فرائض کی قضاء ہی کیوں نہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے ”قیام الیل“ اور ”تہجد“ کا ثواب عطا فرمائے لیکن یہ کوئی ضابطہ شرعیہ نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اپنے بندوں پر برسنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

وضو اور نماز کے باطل ہونے کا غلط مسئلہ

سوال: ایک معروف ہفت روزہ جریدہ (اخبار جہاں) کی ۱۶ تا ۲۲ اپریل ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں ”کتاب وسنت کی روشنی میں“ کے عنوان کے تحت ایک سائل نے پوچھا کہ: وضو میں لوگ جب سر کا مسح کرنے لگتے ہیں تو ہاتھ بھگو کر پہلے اسے چومتے ہیں اور پھر سر کا مسح کرتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح مسح نہیں ہوتا جو وضو کے فرائض میں سے ہے اور جب ایک فرض چھوٹ گیا تو وضو نہ ہوا اور بغیر وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، اس طرح نماز نہیں ہوگی' کیا مفتی صاحب کا یہ جواب درست ہے؟

(عنایت اللہ۔ آرام باغ، کراچی)

جواب: مفتی صاحب کا یہ جواب درست نہیں ہے۔ اگرچہ ہاتھ تر کرنے کے بعد سر کا مسح کرنے سے پہلے ہاتھوں کا چومنا ثابت نہیں ہے لیکن اگر کسی نے لاعلمی کی بناء پر ایسا کر لیا تو سر کا مسح شرعاً صحیح ہو جائے گا اور چونکہ کوئی فرض ترک نہیں ہوا اس لئے وضو بھی صحیح ادا ہو گیا اور اس وضو سے نماز بھی صحیح ادا ہو جائے گی۔

سفر کی قضاء حضر میں اور حضر کی قضاء سفر میں

سوال: دورانِ سفر نمازیں رہ گئی ہوں اور واپس گھر آ کر ان کی قضاء پڑھنا چاہے تو قصر پڑھے یعنی چار فرض کی جگہ دو یا پوری پڑھے گا؟ (بہار احمد مشتاق، کراچی)

جواب: قضاء میں حالتِ ادا کا اعتبار نہیں بلکہ حالتِ قضاء کا اعتبار ہے۔ لہٰذا سفر کی قضاء گھر پر آ کر پڑھی جائے تو قصر ہی پڑھے گا اور گھر پر اقامت کے دوران قضاء شدہ نمازیں سفر میں پڑھنا چاہے تو ان کی قضاء پوری پڑھے گا۔

کیا توبہ کے بعد بھی قضائے عمری پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: سورۂ توبہ آیت ۱۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اگر یہ لوگ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔" اگر کاہلی اور سستی کی وجہ سے کسی شخص کی پندرہ بیس سال کی نمازیں قضاء ہوگئی ہوں لیکن اب وہ شخص صدقِ دل سے توبہ کر کے گزشتہ تیس سال سے باقاعدگی کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہا ہے، تو کیا صدقِ دل سے توبہ کے بعد بھی قضاءِ عمری پڑھنا ضروری ہے؟ (بہار احمد مشتاق۔ گلشن مصطفیٰ۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: یہ آیت یہود، منافقین اور کفارِ مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اگر وہ صدقِ دل سے کفر و نفاق سے توبہ کر کے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور اسلام پر مکمل طریقے سے کاربند ہیں تو وہ اسلامی برادری کے رکن بن چکے ہیں اور انہیں وہی تحفظات حاصل ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہیں، ان کے تاریک، گمراہ کن اور مسلمانوں سے بغض و عناد پر مبنی ماضی کے پیشِ نظر ان کے ساتھ نہ کوئی امتیازی سلوک کیا جائے گا اور نہ ہی انتقامی کارروائی کی جائے گی کیونکہ "اسلام ماضی کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔" چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا "اور اگر یہ لوگ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو، بلاشبہ ان کی قسموں کو کوئی اعتبار نہیں، تاکہ وہ کفر سے باز آ جائیں۔" اس کے برعکس مسلمان جب ماضی کے گناہوں سے صدقِ دل سے توبہ کرے گا تو توبہ کی صحت کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے جن گناہوں کی تلافی کی جو صورتیں مقرر کر رکھی ہیں، ان پر بھی عمل کرے۔ مثلاً قسم کھا کر توڑ دی ہے تو اس کا کفارہ ادا کرے، کسی کا حق غصب کیا ہے تو اسے واپس کرے، زکوٰۃ ادا

نہیں کی تو ماضی کی تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے اور جو نمازیں قضاء ہو چکی ہیں تو ان کی قضاء پڑھے اور اپنی تقصیرِ قضاء پر اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے۔

صلوٰۃ التسبیح باجماعت پڑھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہار شائع کرنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں مسئلہ ہذا کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں"۔ (الطاف حسین۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: صورتِ مسئولہ میں صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہارات شائع کرنا "تداعی" ہے، اور نوافل باجماعت بالتداعی اگر دائماً یعنی ہمیشہ ہو تو فقہاء نے اسے مکروہ لکھا ہے اور اگر دائماً نہ ہو بلکہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ہوں تو یہ بہت سے علماء متقدمین سے ثابت ہے جن میں حضرت لقمان بن عامر، خالد بن معدان اور امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شامل ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز "فتاویٰ رضویہ" میں لکھتے ہیں "بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتداعی ثابت ہے اور عوام فعلِ خیر سے منع نہ کئے جائیں گے اور نہ نوافل سے، علمائے ملت و حکمائے ملت نے ایسی ممانعت سے منع کیا ہے۔" آگے ایک اور مقام پر "حدیقہ ندیہ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اور اس قبیل سے "صلوٰۃ الرغائب" اور "صلوٰۃ لیلۃ القدر" وغیرہ باجماعت ادائیگی کو منع کرنا ہے اگرچہ علماء نے اس کی کراہت صراحت فرمائی ہے لیکن عوام کی دلچسپی کم تر ہونے کی وجہ سے اس کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ نفل نماز باجماعت کے جواز پر علمائے متاخرین کی تصانیف موجود ہیں اور عوام کو نماز کی طرف راغب کرنا متنفر کرنے سے بہتر ہے"۔

نمازِ عید کا خطبہ سننا

سوال: نمازِ عید کے بعد جو دو خطبے دیئے جاتے ہیں، ان کے سننے کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ خطبہ سننے کے بجائے اٹھ کر چلے جاتے ہیں (عبداللہ۔ گلشن اقبال، کراچی)۔

جواب: نمازِ عید کے بعد دو خطبے پڑھنا اور ان کا سننا رسول اللہ ﷺ کی سنتِ مقدسہ ہے اور

اتنی عظیم برکتوں اور سعادتوں کے دن اجر وثواب کے طلبگاروں کو نماز کے بعد باادب بیٹھ کر خطبہ سننا چاہئے۔

تارک الصلوٰۃ کا حکم

سوال: جو لوگ نمازِ جمعہ ادا نہیں کرتے اور پانچ وقت کی نمازیں نہیں پڑھتے، ان کے لئے کیا حکم ہے؟ (محمد شاہد اعجاز، کراچی)

جواب: اس سلسلے میں چند آیات اور احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝

(المدثر: ۴۲ تا ۴۷)

"(قیامت کے دن اہل جنت، جہنمیوں سے پوچھیں گے) تمہیں کیا چیز جہنم میں لے جانے کا باعث بنی؟" وہ (جواباً) کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ بیہودہ لوگوں کے ساتھ بیہودہ مشغلوں میں گم رہتے تھے۔ اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا"۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرہ: ۴۵-۴۶)

"اور (اللہ کی) مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعے سے اور بیشک نماز ضرور دشوار محسوس ہوتی ہے، مگر (رب کی طرف) جھکنے والوں پر شاق نہیں ہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (الماعون: ۴-۵)

"پس افسوس (اور خرابی) ہے ان نمازیوں کیلئے جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں"۔

۱- حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بندے اور کفر کے درمیان (حدِ فاصل) ترکِ نماز ہے"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

۲- عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ جس عمل کے ترک کو کفر (کے قریب تر) سمجھتے تھے وہ نماز ہے۔" (مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی)

۳- حضرت ابو جعد ضمری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جس نے سستی اور کاہلی کی بنا پر مسلسل تین جمعے چھوڑ دیئے، اللہ تعالیٰ (سزا کے طور پر) اس کے دل پر مہر لگا دے گا (یعنی وہ اپنی اس سرکشی کی پاداش میں قبولِ حق کی استعداد سے محروم ہو جائے گا)۔

(مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داوٗد، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابن ماجہ)

۴- حضرت عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آ جائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر (شقاوت کی) مہر لگا دے گا اور وہ غافلوں میں سے ہو جائیں گے"۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)

ایک دکاندار یا کاروبار سے وابستہ مختلف افراد کا باری باری مختلف مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھنا

سوال: ایک دکان میں ہم کئی افراد کام کرتے ہیں، مساجد میں نمازِ جمعہ کے اوقات مختلف ہوتے ہیں کہیں ایک بجے کہیں ڈیڑھ بجے، کہیں دو بجے اور کہیں ڈھائی بجے کیا ایسا کرنا جائز ہے کہ ہم دکان بند نہ کریں اور باری باری ایک ایک کر کے مختلف مساجد میں نمازِ جمعہ پڑھ لیں، اس طرح سب کی نماز بھی ادا ہو جاتی ہے اور کاروبار بھی چلتا رہتا ہے دکان بالکل بند نہیں کرنی پڑتی اور کیا نمازِ جمعہ کی دعاءِ ثانی کے بعد دوبارہ کاروبار شروع کر سکتے ہیں؟ (خرم عبداللہ، کراچی)

جواب: ضابطے کی رو سے تو آپ کا یہ عمل درست ہوگا اور یہ فریضۂ جمعہ سے عہدہ برآ ہونے اور کاروبار کو بدستور جاری رکھنے کا ایک حیلہ ہوگا اس کی ضرورت غیر مسلم ممالک میں پڑ سکتی ہے جہاں نمازِ جمعہ کے لئے باضابطہ کاروبار بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، وہاں رخصت کی حد تک تو یہ حیلہ درست ہوگا البتہ عزیمت کے خلاف ہوگا کیونکہ آپ میں سے ہر ایک نے اللہ تعالیٰ کے حکم "سعی الی ذکر اللہ" پر تو باری باری عمل کیا لیکن "اور ہر قسم کا لین دین چھوڑ دو" کے حکمِ الٰہی پر کلی عمل نہیں کیا بلکہ بالواسطہ طور پر آپ کا کاروبار جاری رہا یہ اس حیلہ سے مشابہ ہے جو بنی اسرائیل نے "یوم السبت" (ہفتے کے دن) مچھلی کے شکار کی ممانعت سے بچنے کے لئے اختیار کیا تھا کہ یا تو گھروں

میں تالاب بنالئے اوران میں مچھلی لاکرڈال دیتے اور ہفتے کے روز انہیں پکڑ کر کھانے لگے اور یا دریاؤں سے گھروں تک نالیاں کھود دیں جن کے ذریعے مچھلیاں خود بخود گھروں کے تالابوں تک آجاتیں اور پکڑ کر کھالیتے یہاں بھی صورت یہ بنی کہ کاروبار بھی جاری رہا اور جمعہ کا ثواب بھی کمالیا یعنی ''ہم خرما وہم ثواب''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:۱۰)

''پس جب نمازِ جمعہ ادا کر چکو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو''۔

وہی کاروبار جو نمازِ جمعہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے حرام تھا اب فریضہ جمعہ کی ادائیگی کے بعد اللہ کا فضل قرار پایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے، تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے۔

نوافل بیٹھ کر پڑھنا

سوال: بعض لوگ تندرست وتوانا ہوتے ہوئے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ کیا دونوں صورتوں (یعنی کھڑے ہوکر نماز پڑھنے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے) میں ثواب یکساں ہے۔ بعض لوگ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اس لئے ان نوافل کا بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟

(انور شمیم اعوان۔ قیوم آباد، کراچی)

جواب: جو شخص نماز میں قیام پر قادر ہے، اس کے لئے فرض نماز بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اگر بلاعذر بیٹھ کر پڑھے گا تو نماز ادا نہیں ہوگی۔ درمختار میں ہے جو نمازیں فرض کے ساتھ ملحق ہیں (یعنی حکما) ان کا بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے جیسے نوافل کی نذر مانی ہو تو واجب ہوجاتے ہیں، اور صحیح ترین قول کے مطابق فجر کی دو سنتوں کا بھی یہی حکم ہے کہ بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بعض فقہا فجر کی سنتوں کے وجوب کے قائل ہیں، لیکن جو فقہا فجر کی ان دو رکعت کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ وہ بھی جانب وجوب کی رعایت کرتے ہوئے اسی بات کے قائل ہیں کہ فجر کی سنتیں بلاعذر بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہیں بعض فقہا سنتِ فجر پر قیاس کرتے ہوئے نمازِ تراویح

بھی بلاعذر بیٹھ کر پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن علامہ قاضی خان نے کہا ہے کہ چونکہ نمازِ تراویح کی تاکید سنتِ فجر سے کم ہے، اس لئے قول صحیح یہ ہے کہ نمازِ تراویح بلاعذر بھی بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اسی طرح باقی سنتیں اور نوافل بھی بلاعذر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں سوائے سنت فجر کے کہ ان کی تاکید دیگر سنتوں کے بہ نسبت زیادہ آئی ہے، لہٰذا یہ واجب کے قریب ہیں اور ان کا بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، لیکن بلاعذر بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہوکر پڑھنے والے کے مقابلے میں آدھا ثواب ملے گا، البتہ اگر فرض یا واجب یا سنت یا نفل کوئی بھی نماز عذر کی بناء پر بیٹھ کر پڑھی تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی، انشاء اللہ العزیز۔

عشاء کی نماز میں وتر کے بعد کے دو نوافل کا حکم بھی وہی ہے، جو دوسرے نوافل کا ہے یعنی بلاعذر بیٹھ کر پڑھنا جائز تو ہے لیکن ثواب میں کمی ہوگی۔ جو لوگ عشاء کے وتر کے بعد دو رکعت نفل اس لئے بیٹھ کر پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ایسا کرنا ثابت ہے اور اسے زیادہ باعث ثواب سمجھتے ہیں تو ان کی یہ سوچ اور یہ طرزِ عمل درست نہیں ہے، علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شارح صحیح مسلم اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عشاء کے وتروں کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا آپ کی خصوصیت ہے اور اس سے آپ کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی تھی، دوسرے لوگوں کا اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، ایک دن میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا میں نے ہاتھ آپ کے سر اقدس پر رکھا، آپ نے فرمایا، اے عبداللہ بن عمر! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! مجھے بتایا گیا کہ آپ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، حالانکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا، ہاں لیکن میں تم جیسا کب ہوں۔ (رقم الحدیث: ۱۶۱۲)''

سورۂ فاتحہ کی آیت کا چھوٹ جانا؟

سوال: اگر امام سے نماز میں دوران قرأت سورۂ فاتحہ کی کوئی آیت بھولے سے رہ جائے تو کیا نماز صحیح ادا ہوجائے گی، (مستقیم۔ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی)۔

جواب: سورۂ فاتحہ مکمل نماز میں پڑھنا واجب ہے، لہٰذا کوئی ایک کلمہ بھی پڑھنے سے رہ جائے تو سجدۂ سہو لازم آئے گا اور اگر نماز کے اندر سجدۂ سہو نہ کیا تو نماز کا اعادہ لازم آئے گا۔

نماز باجماعت میں دعاء قنوت کا رہ جانا

سوال: باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر کسی سے دعاء قنوت رہ جائے تو کیا اکیلے سجدۂ سہو کرسکتا ہے، (زیتون میمن۔ کلفٹن)۔

جواب: باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر امام دعاء قنوت پڑھنا بھول جائے اور تکبیر کہتے ہوئے سیدھا رکوع میں چلا جائے تو امام اور اس کی متابعت میں سب مقتدی بھی سجدۂ سہو ادا کریں گے اور نماز صحیح طور پر ادا ہوجائے گی۔ اگر امام کی اقتداء کے دوران صرف مقتدی دعاء قنوت پڑھنا بھول جائے تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہے، نہ وہ جماعت کے اندر ادا کرے گا اور نہ اکیلے، انشاء اللہ جماعت کی برکت سے اس کی نماز صحیح ادا ہوجائے گی۔

بیت اللہ کی طرف سجدہ کرنے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے پر صیہونیوں کا اعتراض

سوال: عرض یہ ہے کہ آج کل صیہونی قوتوں خصوصاً ہندوؤں کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ مسلمان دوسروں کو تو بت پرستی سے روکتے ہیں، پتھر کے خداؤں کی پوجا کرنے سے منع کرتے ہیں، مگر خود پتھر کی ایک عمارت (خانہ کعبہ) کو سجدہ کرتے ہیں، اس طرح تو مسلمان خود بھی بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ)، ایک اور شوشہ یہ بھی چھوڑا جارہا ہے کہ بتوں کو بوسہ دینے کی مخالفت کرنے والے مسلمان خود ایک پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اور بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ) نیز اس طرح کے کئی اور فضول، بکواس اور گھٹیا حربے استعمال کرکے مسلمان قوم کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جارہی ہے گو کہ ہم لوگ ان لغو باتوں پر دھیان نہیں دیتے اور اپنی طرف سے ان کافروں کو منہ توڑ جواب دیتے ہیں مگر دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے علمی جواب ضروری ہے۔

(محمد احسن سمیع۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی)

جواب: مشرک بتوں کو سجدہ کرتے ہیں اور بت ہی ان کے معبود اور مسجود ہوتے ہیں، جبکہ مسلمان بیت اللہ کو سجدہ نہیں کرتے۔ کعبہ مسلمانوں کا معبود اور مسجود نہیں ہے نہ ہی مسلمانوں کا یہ

عقیدہ ہے کہ بیت اللہ یا خانہ کعبہ ایسا مقام یا جگہ ہے جہاں معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ قیام پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ زمان و مکان کے اندر محدود یا مقید ہونا یہ عالمِ اجسام اور مادی دنیا کی صفات ہیں، اللہ کی ذات اس سے بلندتر ہے، چنانچہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھیں تو قرآن نے منکرین کے اعتراضات کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ (البقرہ:۱۴۲)

"اب بیوقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو ان کے سابقہ قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا؟ (اے رسول!) آپ فرمادیجئے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں"۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ (البقرہ:۱۱۵)

"اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، تو جہاں کہیں تم (قبلے کی طرف) منہ کرو، وہیں اللہ (کی رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے"۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ ۚ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ ۚ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۚ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ:۱۷۷)

"(اصل) نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق و مغرب کی جانب پھیر لو، بلکہ (اصل) نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ، قیامت کے دن، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود رشتے داروں، یتیموں، ناداروں، مسافروں، سائلین (اور قرض میں پھنسے ہوئے یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی) گلوخلاصی کے لئے (اللہ کی رضا کی خاطر) مال دے اور نماز قائم کرے زکوٰۃ دے، اور اپنے کئے

ہوئے عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور حالتِ تکلیف و سختی میں کافروں سے لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ثابت ہوئے اور (درحقیقت) یہی لوگ متقی ہیں"۔

تو کعبہ ہمارا مسجود نہیں بلکہ جہتِ سجدہ ہے۔ ہم کعبے کو نہیں، بلکہ جانبِ کعبہ سجدہ کرتے ہیں، عبادت کعبہ کی نہیں کرتے بلکہ ربِ کعبہ کی کرتے ہیں، اگر سجدہ کعبے کو ہوتا تو صرف اس کے سامنے ہی ہوتا جیسے بت پرست مشرک بت کے سامنے جھک کر اسے سجدہ کرتے ہیں، سینکڑوں ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے، جبکہ درمیان میں ہزاروں رکاوٹیں اور حجابات حائل ہوتے ہیں کعبے کو سجدہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے ہر نمازی کا ایسے زاویے پر کھڑا ہونا کہ نوے درجے کا خطِ مستقیم بنتے ہوئے کعبہ عین اس کی پیشانی کے سامنے واقع ہورہا ہو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین امر ضرور ہے، اس لئے فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ نمازی اپنی طرف سے پوری ذہنی و فکری کوشش صرف کرکے یا کسی صاحبِ علم سے پوچھ کر قبلے کا تعین کرکے نماز پڑھ لے، اس کو اصطلاحِ فقہ میں "تحری" کہتے ہیں۔ اگر انتہائی کوشش کے باوجود فی الواقع اس کا رخ قبلے سے ہٹ گیا ہو اور یہ انحراف ۴۵ درجے تک ہوجائے تب بھی نماز صحیح ادا ہوجائے گی۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس میں باری تعالیٰ کی کیا حکمت ہے کہ بیت اللہ کی جانب رخ کرکے عبادت کا حکم فرمایا جبکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم تو ہر جہت اور جگہ کو محیط ہے۔ تو اس کی حکمت جو میری ناقص عقل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا مرکزِ عبادت اور جہتِ نماز بناکر ایک بے مثال وحدت قائم فرمادی، اور خانہ کعبہ کو اپنی برکات اور انوار و تجلیات کا مرکز و محور بنادیا تاکہ وہ اس کی برکات سے فیض یاب ہوسکیں اور اسے مسلمانوں کا شعار اور امتیازی نشان بنادیا، چنانچہ حدیث پاک میں ہے: "حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ہماری طرح نماز پڑھے اور (نماز میں) ہمارے قبلے کی جانب رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، تو وہ شخص مسلم ہے، پس اللہ تعالیٰ کے (عطا کردہ) عہدِ امان کو نہ توڑو (یعنی اس کی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو پامال نہ کرو)، (مشکوٰۃ، بحوالہ صحیح بخاری)"۔

حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی بابت یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے: "عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے، بخدا

میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو (اپنی ذات سے) نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۲۹۶۵)"۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنت سے حجرِ اسود کو اتارا گیا تو یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کردیا۔ تو حجرِ اسود کو، حصولِ خیر و برکت کے لئے اور سنتِ رسول ﷺ کی اتباع میں بوسہ دیا جاتا ہے۔ محض بوسہ دینا کسی بھی مذہب میں عبادت نہیں ہے۔ کبھی تعظیم و توقیر کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے حجرِ اسود کو کبھی حصولِ برکت کے لئے بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگوں اور والدین کی دست بوسی اور قدم بوسی اور آثارِ صالحین کو بوسہ دینا۔ کبھی اظہارِ شفقت و محبت کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ حجرِ اسود اپنی ذات سے فیض رساں ہے، ذاتی کمالات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں، مخلوق میں جو بھی کمال ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور تخلیق سے ہے۔

مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو
دانستہ بم سے اڑانے والوں کا شرعی حکم

سوال: اہلِ سنت کی ایک جامع مسجد پر بعض دوسرے مکتبۂ فکر کے لوگ قبضہ کرنا چاہتے تھے اس ناپاک مہم میں ناکامی کے بعد انہوں نے مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو بم سے اڑادیا۔ ازراہِ کرم شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ایسے لوگوں کا جو مسجد کو شہید کردیں اور اس پر ناپاک قبضہ جمانے کی سازشیں کریں کیا حکم ہے؟ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات میل جول، شادی بیاہ کی کیا حیثیت ہوگی۔ یہ واضح رہے کہ مذکورہ جامع مسجد علاقہ کی واحد جامع مسجد ہے۔

(قاری محمد سیف اللہ۔ نیریاں شریف آزاد کشمیر)

جواب: سورۃ التوبہ آیات ۱۷–۱۸ میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا

مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ(التوبہ:۱۷-۱۸)

"مشرکوں کا یہ وتیرہ ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالانکہ وہ خود اپنی ذات پر کفر کے گواہ ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے عمل ضائع ہو گئے اور ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوئے تو وہ لوگ اس کے قریب ہیں کہ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں"۔

اور سورۃ البقرہ آیت:۱۱۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا

"اور اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کے مقدس نام کے ذکر سے روکا اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کی"۔

"عمارۃ المسجد" سے مراد مسجدیں تعمیر بھی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اقامتِ صلوٰۃ کے ذریعے انہیں آباد بھی کرنا ہے اور قرآن نے بتایا کہ یہ مومنین صادقین کا شعار ہے نہ کہ مشرکین و کفار کا، اور قرآن نے یہ بھی بتایا کہ مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکنے والے اور انہیں ویران کرنے والے شقی اور ظالم ترین لوگ ہیں۔

مساجد کو ویران کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

۱) یہ کہ مسجد کی عمارت تو قائم و دائم رہے لیکن ذاکرین اور نمازیوں کو اس میں ذکر و عبادت سے روک دیا جائے، جیسے مشرکین مکہ کا وتیرہ تھا اور بیعتِ رضوان کے موقع پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ میں آنے، عمرہ ادا کرنے اور عبادت و ذکرِ الٰہی سے روک دیا تھا۔

۲) امام قرطبی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک صورت یہ بیان کی ہے کہ بدنیتی سے کسی مسجد کے متصل یا قریب ترین دوسری مسجد محض اس لئے بنائی جائے کہ وہ مسجد ویران اور غیر آباد ہو جائے اور ذاکرین، مصلّیان سے خالی ہو جائے جیسے "منافقینِ مدینہ" نے مسجد ضرار بنائی تھی۔

۳) یہ کہ سرے سے مسجد کو خدانخواستہ شہید کر دیا جائے اور مسمار کر دیا جائے، یہ ظالم ترین اور شقی القلب لوگوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ جیسے نصاریٰ نے بخت نصر بابلی مشرک کے ساتھ مل کر یہود کی عداوت میں "بیت المقدس" کو مسمار کرایا تھا اور اسے مردار خانے اور کوڑے اور گندگی کے ڈھیر

میں تبدیل کر دیا تھا۔ العیاذ باللہ! اسی طرح ماضی قریب میں ہندوستان میں ہندوؤں نے بابری مسجد کو شہید کیا، کشمیر میں درگاہ حضرت بل کو شہید کیا، یہود نے بیت المقدس کو آگ لگانے کی مذموم کوشش کی اور اب حال ہی میں استفتاء میں درج صورتحال کے مطابق آزاد کشمیر کے علاقہ ڈنہ پونچھی میرخان میں مسجد کو بم سے اڑا دیا۔

ایک اسلامی مملکت میں ایسے واقعات کا رونما ہونا انتہائی سنگین، اندوہناک اور المناک حادثہ ہے، یہ شعائر اللہ کی صریح توہین ہے، اور اگر متعلقہ حکومت نے ایسے لوگوں کی نشاندہی کر کے انہیں گرفتار کر کے قرار واقعی سزا نہ دی تو وہ بھی عنداللہ مسئول ہوں گے۔ یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن کی وعید اس پر شاہد ہے چونکہ ان لوگوں نے "علی رؤس الاشہاد" یعنی علانیہ طور پر یہ جرم قبیح کیا ہے اس لئے جن لوگوں نے مسلمانوں کی مسجد کو شہید کیا ہے ان پر ضروری ہے کہ توبہ کریں اور توبہ کی شرط یہ ہے کہ:

(۱) اظہارِ ندامت کیا جائے۔

(۲) آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزمِ مصمم کیا جائے۔

(۳) جو کچھ کیا ہے اس کا تدارک اور تلافی کی جائے، اس لئے ان لوگوں کی توبہ اس وقت صحیح ہوگی جب یہ لوگ اس مسجد کو پہلے کی طرح بنا دیں ورنہ صرف زبانی اظہارِ ندامت سے ان کی توبہ نہیں ہوگی اور جب تک یہ لوگ درج بالا شرائط کے مطابق توبہ نہ کریں مسلمان ان سے میل جول اور کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود:۱۱۳)

"اور تم ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تم کو بھی آگ جلائے گی"۔

یعنی قرآن نے توان کو ظالم کہا ہے اور دعائے قنوت میں ہے:

"جو تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے ترکِ تعلق کرتے ہیں"۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جب انہوں نے گناہ سمجھ کر یہ قبیح کام کیا اور اگر اس کو جائز اور حلال سمجھ کر کیا ہے تو پھر ان کا ایمان جاتا رہا اور وہ مرتد ہو گئے اور ان کا نکاح باطل ہو گیا اور ان پر اس قبیح فعل سے براءت کا اظہار کر کے تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح لازم ہے۔

قرآن اور تلاوتِ قرآن کے آداب

سوال: آج تقریباً ہر اخبار، رسالے اور کتاب میں آیاتِ قرآنی درج ہوتی ہیں، ماشاء اللہ تعلیم القرآن اور حفظ القرآن کا ذوق بھی فروغ پا رہا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا ادب اٹھتا جارہا ہے، اس لئے وہ روحانیت اور برکت پیدا نہیں ہوتی جو تعظیمِ قرآن کا تقاضا ہے، ازراہِ کرم اپنے کالم میں قرآن اور تلاوتِ قرآن کے آداب پر روشنی ڈالیں، شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔(مولانا علی عمران صدیقی۔اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: قرآن، کلام ربانی اور انسانیت کے لئے تاابد صحیفۂ ہدایت ہے۔لیکن یہ محض ایک قانون کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ کتابِ الٰہی انتہائی مقدس و محترم ہے۔اسی لئے اللہ جل شانہٗ نے تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن کو بھی ایک مستقل فریضۂ نبوت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۲)

"اللہ وہ ہے جس نے اُمّی لوگوں کے درمیان انہی میں سے ایک عظیم رسول کو مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور ان (کے قلوب) کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے"۔

اور فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (المزمل:۴)

"اور قرآن کو ٹھہراؤ کے ساتھ پڑھئے"۔

اس لئے تلاوتِ قرآن ایک مستقل سعادت و عبادت ہے۔جب کوئی مومن قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ کرے تو اپنے منہ کو ہر قسم کی بدبو (پان، نسوار، تمباکو، لہسن و پیاز وغیرہ کے اثرات) سے پاک کرکے کسی پاک وصاف جگہ باوضو، باادب قبلہ رو بیٹھ کر تلاوت کرے، ہو سکے تو خوشبو بھی استعمال کرے، اگرچہ بے وضو تلاوت کرنا جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔اگر تنہا ہو تو اونچی آواز سے تلاوت کرے، لیکن اگر مسجد میں اور لوگ بھی ہوں جو نماز، تلاوت اور اوراد و اذکار میں

مشغول ہوں یا گھر پر دنیوی کام کاج میں مشغول ہوں تو پھر آہستہ پڑھے، اجتماعی قرآن خوانی ہو رہی ہو تو بھی آہستہ پڑھیں۔تلاوتِ قرآن کے دوران ادھر ادھر نہ دیکھے بلکہ مصحف شریف پر نظر رکھے، کیونکہ قرآن کو دیکھنا بھی عبادت ہے، یہی وجہ ہے کہ دیکھ کر پڑھنے کا اجر زبانی پڑھنے سے زیادہ ہے، بے وضو قرآن کو چھونا نہیں چاہئے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (الواقعہ:۷۹)

"اس کو پاکیزہ افراد ہی چھوتے ہیں"۔

حائض و نفاس والی عورت اور جنبی مرد (یعنی جن پر غسل واجب ہے یا جو ابھی پاک نہیں ہوئے) کے لئے قرآن پاک کو چھونا اور پڑھنا منع ہے، حائض عورت اگر معلّمہ ہے تو چھوئے بغیر قرآن کے کلمات کو روانی کے بجائے الگ الگ کرکے بچوں کو پڑھائے۔حائض اور جنبی قرآن کی کوئی آیت بطور دعا پڑھ سکتے ہیں، جیسے شکر کے موقع پر کوئی کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اسی طرح ان کے لئے کلماتِ تسبیح تہلیل، تحمید، تکبیر اور درود شریف پڑھنا جائز ہے۔استنجا خانے، اٹیچڈ باتھ روم اور کسی بھی بے توقیر جگہ پر قرآن پڑھنا خلافِ ادب ہے۔تلاوت شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔اگر کوئی عورت مستحاضہ ہے (یعنی اس کا خون جاری رہتا ہے) یا کسی کو پیشاب کے قطرے ٹپکتے رہنے یا دائمی نکسیر یا کسی زخم سے خون یا پیپ رستے رہنے یا مسلسل غلبۂ ریاح کی شکایت ہے تو ایسے لوگ شرعاً معذور ہیں، یہ لوگ ایک نماز کے وقت کے لئے جب وضو کریں تو دوسری نماز کا وقت داخل ہونے تک ان شکایات کے جاری رہنے کے باوجود مسلسل نماز پڑھ سکتے ہیں اور تلاوت کرسکتے ہیں۔

قصداً قرآن کی توہین کفر ہے، لیکن اگر غیر ارادی طور پر غلطی سے یا بے خیالی میں قرآن مجید گر جائے تو اس کا کوئی مالی کفارہ نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اللہ معاف فرمانے والا ہے۔قرآن کی طرف پاؤں کرکے بیٹھنا یا سونا خلافِ ادب ہے لیکن اگر قرآن قدموں کی جانب کسی الماری میں بند ہے یا بالائی طاق پر ہے تو کوئی جرم نہیں ہے۔قرآن کو ترتیبِ مصحف کے مطابق پڑھنا چاہئے، خلافِ ترتیب پڑھنا منع ہے، لیکن اگر نماز میں بھول کر پڑھ لیں تو سجدۂ سہو نہیں ہے۔قرآن مجید کی تلاوت کرنا سنت و مستحب ہے، البتہ اگر تلاوت ہو رہی ہو تو اس کا سننا واجب ہے۔اگر متعدد کتب ہوں تو سب سے اوپر قرآن مجید، پھر تفسیر، پھر حدیث، پھر سیرت و فقہ

اور دوسری کتب نیچے رکھیں۔

نماز کے اندر قرأت میں غلطی کا مسئلہ

سوال: ایک امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے، انہوں نے ''سورة القارعه'' کی قرأت شروع کی، جب فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ تک پہنچے تو اس کے بعد کی دو آیات بھول گئے اور ان سے آگے والی آیت فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ پڑھ لی۔ امام صاحب نے نماز مکمل کر کے سلام پھیر دیا، اور سجدہ سہو نہیں کیا۔ کیا نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی، (محمد آصف۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: جی ہاں نماز صحیح طور پر ادا ہوگئی، کیونکہ مقدار واجب قرأت ادا ہوگئی، نہ کوئی اعراب کی غلطی ہوئی اور نہ ہی قرأت میں ایسے لفظوں کا اضافہ ہوا، جو قرآن کا حصہ نہ تھے۔ بس درمیان سے دو آیتیں رہ گئیں، باقی جو کچھ پڑھا وہ قرآن ہی ہے۔ فقہاء کرام نے قرأت میں ایسی غلطی، جس کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، کا ضابطہ یہ بیان کیا ہے کہ بھولنے کے بجائے اگر وہ دانستہ طور پر اس طرح پڑھے تو کفر لازم آجائے۔

فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 81 پر قراءت کی چند فاحش غلطیوں کا بطور مثال ذکر کرنے کے بعد لکھا:

وما اشبه ذالک مما له لو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلوته في قول المتقدمين۔

''اور ان جیسی غلطیاں کہ اگر وہ قصداً اس طرح پڑھتا تو اس کی تکفیر لازم آتی، اگر ان کو غلطی سے پڑھ لے تو متقدمین فقہاء کرام کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی''۔

آگے چل کر لکھا: ''اور متقدمین کا فسادِ نماز (اور اعادۂ نماز) کے بارے میں یہ قول زیادہ احتیاط پر مبنی ہے''۔ یہی فقہی ضابطہ ''فتاویٰ شامی''، ''فتاویٰ خانیہ'' اور دیگر کتبِ فقہ میں بھی مذکور ہے۔ اس کے برعکس متاخرین فقہاء کرام نے کہا کہ چونکہ عام مسلمانوں سے اعراب کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، وہ اعراب یا الفاظ کی ایسی غلطیوں پر اکثر مطلع بھی نہیں ہوتے، اور اگر اعراب کی غلطیوں پر مطلع ہو جائیں تو معنیٰ کے فاسد ہونے کا انہیں علم نہیں ہوتا اس لیے عمومِ بلویٰ (یعنی لوگوں کے کثرت سے اس میں مبتلا ہونے) کی وجہ سے نماز ادا ہو جاتی ہے۔ تاہم جب نماز کے

فاسد ہونے کی وجہ معلوم ہو جائے تو احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کا دہرانا ہی بہتر ہے۔

مستحب پر دوام

سوال: بعض لوگ عبادات میں مستحبات پر اتنا التزام کرتے ہیں، اتنا زور دیتے ہیں اور اتنا اہتمام و دوام کرتے ہیں کہ لگتا ہے انہیں فرض یا واجب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ کیا ان لوگوں کا یہ رویہ اور طرزِ عمل درست ہے، (سید عمران علی، بلدیہ ٹاؤن، کراچی)۔

جواب: ہر معقول شخص اپنے لباس، وضع قطع، رہن سہن، اکل و شرب اور بود و باش میں ترتیب، تزئین اور تحسین کو پسند کرتا ہے اور یہ فطرتِ سلیم کا تقاضا بھی ہے، بشرطیکہ یہ وجوہِ تحسین و تزئین شریعت کے دائرے میں ہوں اور اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول ﷺ کی مقررہ حدود کے اندر ہوں۔ اسی طرح عبادات اور اعمالِ دینیہ میں بھی بعض امور وجوہِ تحسین میں شمار ہوتے ہیں، انہیں آداب و مستحبات کہا جاتا ہے اور ان کا درجہ فرائض، واجبات اور سنن کے بعد آتا ہے۔ ان کے اہتمام سے عبادت کی اعلیٰ معیار پر تکمیل ہوتی ہے اور اس میں روحانی اور معنوی حسن پیدا ہوتا ہے، مثلاً آپ نماز پڑھیں تو حالتِ قیام میں نگاہیں مقام سجدہ پر مرکوز رکھیں، لباس اور بدن کے ساتھ نہ کھیلیں، اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کا تصور طاری کریں تاکہ دل میں خشیتِ الٰہی پیدا ہو اور ذہن نماز سے کسی اور چیز کی طرف منتقل ہی نہ ہو۔ نماز کے انتظار میں باادب صف بستہ ہو کر بیٹھیں اور جب اقامت کہی جائے تو ''حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح'' پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر بھوک کی شدید خواہش یا پیشاب کی حاجت ستا رہی ہے تو ان حاجات کی تکمیل کر کے نماز شروع کریں، بشرطیکہ وقت میں گنجائش ہو تاکہ نماز میں یکسوئی نصیب ہو، وغیرہ۔

مستحب کے معنی ہیں ''پسندیدہ بات''، ''دل پسند چیز''، ایک روایت میں آیا ہے کہ: ''(صحیح العقیدہ و سلیم الفطرت) مسلمان جس چیز کو پسندیدہ اور اچھی سمجھیں، اسے اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتا ہے۔'' اعمالِ حسنہ میں دوام و ہمیشگی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، حدیث پاک میں ہے: ''جن اعمال کو دوام اور پابندی کے ساتھ کیا جائے، وہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، خواہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔'' لہٰذا اگر کوئی شخص یا افراد عبادات و اعمال اور اطوارِ حیات میں آداب و مستحبات کا اہتمام و التزام کرتے ہیں اور انہیں ہمیشہ پابندی کے ساتھ کرتے ہیں، تو یہ روش ایسی ہے، جس کی تحسین

(Appreciation) کی جانی چاہئے تاکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب ہو، نہ کہ اسے نشانہ بنایا جائے، بشرطیکہ کوئی اسے فرض وواجب سمجھ کر نہ کررہا ہو۔

البتہ اگر کوئی شخص ''آداب و مستحبات'' میں کسی امرِ مستحب پر اپنے کسی عذر، مصروفیت یا مجبوری کی بناء پر عمل نہیں کرتا، تو ترکِ مستحب پر اسے ملامت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ترکِ مستحب پر ملامت کرنا، اسے فرض یا واجب قرار دینے کے مترادف ہے اور یہ ہمارا منصب نہیں، شارع کا منصب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ کوئی شخص کسی امر مستحب کو حقیر سمجھ کر نہ چھوڑے، یہ روش قلبی شقاوت کا مظہر ہوگی، کم ہمتی سے چھوڑنا الگ بات ہے۔ بہرکیف اسلام ایک متوازن اور معتدل دین ہے، ہمیں افراط وتفریط کو چھوڑ کر اعتدال وتوازن پر کاربند رہنا چاہئے، یہی عادت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

مسجد نبوی ﷺ میں چالیس نمازوں کی فضیلت

سوال: ایک حدیث نبوی کا مفہوم مشہور ہے کہ جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کیں، اس پر میری شفاعت واجب ہے، اس حدیث کا حوالہ بیان فرمائیں''۔

(عبدالحئی انصاری، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک سے مندرجہ ذیل حدیث بیان فرمائی ہے:

عن انس بن مالک عن النبی ﷺ انه قال من صلی فی مسجدی اربعین صلوٰة لا یفوته صلوٰة کتبت له براءة من النار ونجاة من العذاب و بریٔ من النفاق.

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں (اس تسلسل کے ساتھ) پڑھیں کہ اس کی ایک بھی نماز فوت نہ ہوئی ہو، تو اس کے لیے جہنم سے آزادی، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت (کا پروانہ) لکھ دیا جائے گا''۔ (مسند امام احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۱۵۵)

اس حدیث مبارک کی رو سے مسجد نبوی میں چالیس نمازیں مسلسل پڑھنے کا بڑا اجر ہے اور

اس کے لیے نار جہنم سے براءت، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت کی ضمانت ہے۔

اور چالیس کے عدد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض برکات ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من رجل مسلم یموت فیقوم علی جنازته اربعون رجلا لا یشرکون بالله شیأ الا شفعهم الله فیه.

''جب کوئی مسلمان وفات پا جائے اور اس کی نماز جنازہ میں ایسے چالیس افراد شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس (میت) کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرمالے گا''۔

(صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، باب المشی بالجنازۃ والصلوٰۃ علیہا)

امام یحیٰی بن شرف الدین نووی نے ''اربعین النوویہ'' میں حضرات علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے کئی طریقوں سے مختلف قسم کی روایات میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من حفظ علیٰ امتی اربعین حدیثا من امر دینها بعثه الله یوم القیٰمة فی زمرة الفقهاء و العلماء، و فی روایة "بعثه الله فقیها عالماً" و فی روایة ابی الدرداء: و کنت له یوم القیمة شافعا و شهیداً، و فی روایة ابن مسعود: قیل لهٗ ادخل من ای ابواب الجنة شئت.

''جو میری امت کے لیے اس کے دینی امور سے متعلق چالیس حدیثیں یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقہاء وعلماء کی جماعت میں اُٹھائے گا، ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اسے فقیہ عالم اٹھائے گا، ابوالدرداء کی روایت میں ہے: میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہ ہوں گا اور ابن مسعود کی روایت میں ہے: اس سے کہا جائے گا تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جاؤ، وغیرہ''۔

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معتبر ہوتی ہیں۔

سلام پڑھنے کی منت

سوال: زید نے منت مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں ایک لاکھ مرتبہ سلام پڑھوں گا، اب

کام ہو جانے کے بعد زید نے پڑھا کہ "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" صرف اتنا پڑھ کر زید اپنی منت سے بری ہو جائے گا یا نہیں۔ جیسے زید کہے کہ میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہتا ہوں، تو یہ تین مرتبہ ہوگا یا ایک مرتبہ۔ (محمد علی قادری، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: شرعاً کسی بندۂ مومن کا ایک ایسی عبادتِ مقصودہ (جیسے نماز، صدقہ وغیرہ) کو اپنے اوپر لازم کرنا، جسے شارع نے اس پر بطور (فرض یا واجب) لازم نہیں کیا، نذر کہلاتا ہے۔ نذر کی مشروعیت اور اس کا لزوم قرآن وسنت سے ثابت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جس چیز یا بات کی نذر مانی جارہی ہے اس کی جنس سے کوئی عبادت شارع کی طرف سے فرض یا واجب ہو، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ شرعاً اگرچہ نذر کا پورا کرنا واجب ہے لیکن نذر ماننا پسندیدہ اور مستحسن بات نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے:

عَنْ ابی ھریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال: لا تنَذِروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئاً و انما یستخرج بہ من البخیل۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"نذر مت مانا کرو، کیونکہ نذر تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، یہ صرف بخیل سے مال نکالنے کا ذریعہ ہے"۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث ۴۱۲۸)

اس حدیث مبارک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شرعاً نذر ماننا منع ہے اور معصیت ہے بلکہ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، مثلاً

(ا) یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا معاملہ کرنا بندگی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک سے یہ کہے کہ اے اللہ! اگر میرا یہ کام بن گیا تو اتنے نوافل پڑھوں گا یا اتنا صدقہ دوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ خدانخواستہ کام نہ بنا تو میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔ یہ اندازِ فکر مقامِ بندگی کو زیب نہیں دیتا بلکہ کمالِ بندگی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے جو عملِ خیر اپنے رب کے حضور نذرانۂ بندگی کے طور پر پیش کر سکتا ہے، کر لے اور پھر اس عملِ خیر کے صدقے، وسیلے اور برکت سے اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ سے دعاء مانگے۔ یہ طرزِ عمل نذر ماننے کے بہ نسبت اعلیٰ و اولیٰ ہے۔

(ب) یہ کہ یہ اعتقاد نہ رکھے کہ نذر اللہ کی تقدیر کو بدل دے گی، بلکہ اسے بھی "تقدیرِ معلق" کے طور

پر تابعِ تقدیر سمجھے اور جس طرح دنیا میں ظاہری طور پر ہم نتائج کی نسبت اسباب کی طرف کرتے ہیں کیونکہ یہ عالمِ اسباب ہے، مثلاً فلاں طبیب یا فلاں دوا سے مجھے شفاء ملی، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب تو ایک ظاہری وسیلہ ہیں ورنہ معاملات و امور کے وجود میں آنے میں مؤثر بالذات اللہ کی مشیت ہے، یہی عقیدہ نذر کے بارے میں بھی ہونا چاہئے۔

(ج) یہ کہ یہ نذر ماننے کے بعد اس کے پورا نہ کرنے میں سستی اور غفلت وکوتاہی پر وعید ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر سلام چونکہ تشہد (یعنی نماز میں التحیات) کا جزء لازم ہونے کی بنا پر واجب ہے اور فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ آیتِ درود (سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۶) کی رو سے کم از کم ایک بار زندگی میں صلوٰۃ وسلام پڑھنا فرض ہے، لہٰذا اس کی نذر ماننا بھی جائز ہے اور اس کی تعمیل واجب ہے۔

لیکن "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" پڑھنے سے صرف ایک بار سلام شمار ہوگا۔ ایک لاکھ بار نہیں، جیسے کوئی یہ کہے کہ "سبحان اللہ مائۃ مرۃ" (یعنی سو بار سبحان اللہ) تو ایک بار سبحان اللہ کہنے کا ثواب ملے گا۔ علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

ولو نذران یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کل یوم کذا لزمہ و قیل لا۔

"اور اگر کسی نے نذر مانی کہ وہ ہر روز نبی ﷺ پر اتنی بار درود پڑھے گا (یعنی تعداد معین کی)، تو اس پر اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے اور ایک قول یہ ہے کہ لازم نہیں"۔

یعنی قولِ مختار یہی ہے کہ درود وسلام کی نذر کا پورا کرنا لازم ہے اور عدمِ لزوم کا قول ضعیف اور غیر مختار ہے، تاہم اس کی توجیہ میں علامہ ابن عابدین شامی، حموی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(و قیل لا) لعل وجھہ اشتراط کون الفرض قطعیاً۔

"یعنی اسی نذر کے پورا کرنے کا عدمِ لزوم ان کے نزدیک ہوگا جن کے نزدیک نذر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادت فرض قطعی ہو، (لیکن مختار یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ فرض یا واجب ہو)"۔

(ردالمحتار علی الدرالمختار، جلد ۵ صفحہ ۴۱۶، طبع جدید)

نماز باجماعت کی صف بندی میں بچوں کا مقام

سوال: آپ کے اس مفید اور علمی صفحے کے ذریعے میں آپ کی توجہ دو اہم مسائل کی طرف

دلانا چاہتا ہوں۔ پہلا یہ کہ آج کل کی بزرگ نسل کو اپنی نئی نسل یا پود سے یوں تو بہت ساری شکایات ہیں لیکن بڑی شکایت یہ ہے کہ نئی نسل اپنے دین سے بیگانہ ہے اور مساجد ویران رہتی ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کی وجوہات جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی ہے وہ یہ کہ ہم بڑوں کا رویہ اس معاملے میں ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور پر جمعے کے دن بچے سب سے پہلے نہا دھو کر تیار ہو کر مسجد میں آجاتے ہیں بڑے لوگ عام طور پر وقت کے وقت پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جماعت کھڑی ہونے کے وقت امام صاحب خاص طور پر یہ اعلان کردیتے ہیں کہ تمام بچے پچھلی صف میں چلے جائیں تو عام طور پر ہمارے جیسے چھوٹے علاقے کی چھوٹی مسجد کی آخری صف دراصل مسجد کے باہر ہوتی ہے، اس اعلان پر لوگ فوری طور پر عمل کرتے ہیں اور گرمی ہو یا سردی بچوں کو اگلی صفوں سے نکال کر پیچھے کردیتے ہیں۔

جس کی وجہ سے وہ بچے جو بڑی خوشی خوشی نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ عام نمازوں میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے جو کہ بڑے نمازیوں کی صف چھوڑ کر ان سے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں بعد میں آنے والے بڑے ان کو نیت بندھی حالت میں کھسکاتے ہوئے پیچھے پہنچا دیتے ہیں جس سے میرے خیال میں ان کے دل و دماغ پر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ بڑے نمازی وقت سے پہلے خاص طور پر جمعے کے دن پہنچنے کی کوشش کریں اور جب جماعت کھڑی ہو تو چھوٹے بچوں کو صفوں کے دائیں بائیں کھڑا کیا جائے نہ کہ سب سے پیچھے یا مسجد سے باہر۔ آپ مجھے اور دوسرے قارئین کو یہ بتلائیے کہ ہمارا مذہب ہمارا دین جو کہ آسانیاں پہنچانے والا اور انتہا پسندی سے روکنے والا مذہب ہے وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے"۔

(ایس۔ این اقبال، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: عام کتب فقہ میں نماز کی صفوں کی ترتیب اس طرح درج ہے:

ویصف الرجال ثم الصبیان ثم النساء لقوله علیه السلام لیلینی منکم اولو الاحلام والنهی۔

"اور پہلے مردوں کی صفیں ہوں پھر بچوں کی اور پھر عورتوں کی' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا

فرمان ہے: (جماعت میں) میرے قریب بالغ اور عقلمند ہونے چاہئیں"۔

(ہدایہ اولین صفحہ ۱۰۳)

درمختار میں ہے:

(الرجال) ظاهره یعم العبید (ثم الصبیان) ظاهره تعددهم، فلو واحدا دخل الصف.

"(نماز کی صفوں کی ترتیب میں پہلے) مرد ہوں گے، بظاہر یہ غلاموں کو بھی شامل ہے، پھر بچے، بظاہر یہ اس صورت میں ہے کہ ان کی تعداد زیادہ ہو، اور اگر ایک ہی بچہ ہو تو (مردوں کی) صف میں شامل ہو جائے گا"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"البحر الرائق میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: اور اسی طرح اگر مقتدی صرف ایک مرد اور ایک بچہ ہوں تو وہ دونوں امام کے پیچھے اکٹھے صف بنا کے کھڑے ہوں گے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت ہے کہ میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے تھیں، اور ایک بچے کا مسئلہ ایک عورت کے مسئلے سے مختلف ہے، کیونکہ عورتیں ایک ہوں یا زیادہ حدیث مذکور کی بناء پر بہرصورت پیچھے الگ صف میں کھڑی ہوں گی"۔

(ردالمحتار جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۷۰۔۲۶۹۔ داراحیاء التراث العربی بیروت)

حدیث پاک کی روشنی میں پہلی صف میں امام کے پیچھے وسط صف میں ایسے عاقل و بالغ اور متشرع افراد ہونے چاہئیں جو کسی ہنگامی صورت میں امام کی نیابت کرسکیں۔ باقی ترجیحی ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں ہوں اور پھر بچوں کی، لیکن مذکورہ بالا فقہی عبارت سے ظاہر ہے کہ بوقت ضرورت جب کہ اگلی صفیں نامکمل ہوں تو بچے بڑوں کے ساتھ کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اگر اگلی صفیں نامکمل تھیں اور بچے درمیان میں آ کر شامل ہوگئے تو بعد میں انہیں نکال کر پیچھے بھیجنا مروت کے خلاف ہے۔

آج کل عام طور پر مشاہدے میں آیا ہے کہ بچوں کو بالکل الگ تھلگ کر کے آخری صف میں کھڑا کردیا جائے تو وہ دوران نماز شرارتیں کرتے ہیں اور اس طرح سارے نمازیوں کی یکسوئی اور حضور قلبی میں خلل واقع ہوتا ہے، اگر انہیں بڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے تو زیادہ باادب ہو کر

پڑھتے ہیں اور بڑوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ اور جب بچے نیت باندھ کر آگے کی صف میں کھڑے ہو جائیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے کرنا آدابِ نماز کے منافی ہے اور اگر اس کا سینہ قبلے سے پھر گیا یا وہ چل کر پیچھے آیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ لیکن یہاں ایسے بچے مراد ہیں جو باشعور ہوں، نماز اور مسجد کے آداب کو سمجھتے ہوں۔

بعض لوگ ایسے کم عمر اور ناسمجھ شرارتی بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آتے ہیں، جو مسجد میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہیں، نمازیوں کے آگے سے بے دھڑک گزرتے ہیں، شور مچاتے ہیں، کبھی جماعت کے دوران رونے لگ جاتے ہیں، کبھی پیشاب بھی کر لیتے ہیں اور آج کل مساجد میں بالعموم قالینیں بچھی ہوتی ہیں، جن کو پاک کرنا کافی دشوار ہوتا ہے، تو ایسے بچوں کو مسجد میں لانا ہی شرعاً منع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدکم صبیانکم و مجانینکم و بیعکم وشرائکم و رفعَ اصواتکم وسلَّ سیوفکم واقامة حدودکم و جمروھا فی الجمع واجعلوا علی ابوابھا المطاھرة۔

"اپنی مسجدوں کو (ناسمجھ) بچوں، پاگلوں، لین دین کے معاملات، شور و شغب، لڑائی جھگڑے اور (مساجد کے اندر) حدودِ شرعی کے قیام سے بچا کر رکھو، اور جمعہ کے دن انہیں کسی خوشبودار چیز کی دھونی دو اور ان کے دروازوں پر (پانی کے) ایسے برتن رکھ دیا کرو (جن کے ذریعے صفائی کی جا سکے"۔ (ابن ماجہ رقم الحدیث ۳/۷۵۰)

درمختار میں ہے:

ویحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجیسھم، والا فیکرہ۔

"اور بچوں اور فاتر العقل لوگوں کا مسجد میں داخل کرنا حرام ہے کیونکہ اکثر وہ ناپاک ہوتے ہیں، اور اگر ناپاک نہ ہوں تو مکروہِ تنزیہی ہے"۔

(فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۳۷۱، داراحیاء التراث العربی)

یہاں حرام سے مراد مکروہِ تحریمی ہے۔ ہمیں بچوں کے معاملے میں افراط و تفریط سے بچنا چاہئے، ناسمجھ اور شعورِ آدابِ مسجد سے عاری کم عمر بچوں کو مسجد میں لے کر نہیں آنا چاہئے اور باشعور و باادب بچوں کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرنی چاہئے، اگر یہ صفوں کے درمیان پہلے سے موجود

ہیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے نہیں کرنا چاہئے، یہ مروت اور بزرگانہ شفقت کے خلاف ہے، وہ بڑوں کے درمیان کھڑے ہوں گے تو باادب رہیں گے اور بڑوں سے سیکھیں گے۔

صلوٰةِ قصر کا مسئلہ

سوال: کیا فرماتے ہیں علماءِ دین اس بارے میں کہ:

ہم لوگ کراچی کے مستقل رہائش پذیر ہیں۔ روزگار کے سلسلے میں تقریباً ۱۰۰ میل کی مسافت پر دیوان فاروق موٹرز کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ہماری چھٹی کا سیٹ اپ کچھ اس طرح ہے کہ ہم پیر کی صبح کراچی سے آتے ہیں اور ہفتہ کی دوپہر واپس کراچی آ جاتے ہیں۔ کراچی میں ہمارا قیام تقریباً ایک روز کا ہوتا ہے، باقی چھ دن ہم مستقل طور پر دیوان سٹی میں ہی رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم دیوان موٹر کمپنی میں مستقل ملازم ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال سے جاری ہے۔

آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ہم پر نماز قصر فرض ہے یا پوری نماز فرض ہے؟

دوسرا یہ کہ ہم کراچی میں قصر ادا کریں یا دیوان سٹی میں یا دونوں جگہ مکمل نماز ادا کریں؟

اکثر علماء سے ہم نے یہ مسئلہ معلوم کیا ہے، کچھ کی رائے میں ہم مسافر ہیں کچھ کی رائے میں مقیم۔ واضح کیا جائے کہ ہم مسافر ہیں یا مقیم؟

ملازمت مستقل ہے اور کمپنی کی طرف سے اتوار کی چھٹی ہوتی ہے، ہم لوگ گھر چلے آتے ہیں پھر پیر کو واپس چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اتوار کو بھی کام کے لئے روک لیتے ہیں؟

(سائل: محمد شاہد اعوان ہزاروی اینڈ دیوان سٹی ورکرز، سجاول۔ ضلع ٹھٹھہ)۔

جواب: کراچی تو آپ لوگوں کا وطنِ اصلی ہے، لہٰذا آپ جب بھی کراچی میں ہوں گے، پوری نماز پڑھیں گے، خواہ کراچی میں آپ کا قیام کم وقت کے لئے ہو یا زیادہ وقت کے لئے۔ باقی دیوان سٹی (یعنی دیوان فاروق موٹر کمپنی) کراچی سے سو میل کی مسافت پر ہے، اور کم از کم مسافتِ سفر، جس پر نماز میں قصر کرنا واجب ہے، ۶۱ میل ۲ فرلانگ ۲۰ گز یا ۹۸ء۷۳۴ کلومیٹر ہے، لہٰذا دیوان سٹی کے لئے جب آپ سفر کریں گے تو قصر پڑھیں گے، اور جب تک کسی مقام پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصے کے لئے قیام کی نیت نہ کرے، شرعاً مسافر ہی رہے گا، مقیم نہیں ہوگا۔ چونکہ آپ لوگ ہفتے میں چھ دن دیوان سٹی میں قیام کرتے ہیں، لہٰذا اس عرصے میں

آپ مسافر ہی رہتے ہیں اور آپ کو نماز قصر ہی پڑھنی ہوگی، کبھی کبھی مالکان کی طرف سے اتوار کو روکے جانے سے سفر کا شرعی حکم تبدیل نہیں ہوگا۔

احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"نوکری ملازمت ہے اس میں قصد استدامت ہوتا ہے تو جو جہاں نوکر ہوکر رہنا اختیار کرے مقیم ہوجائے گا۔ اگرچہ بالخصوص پندرہ دن کی نیت نہ ہو **لان نية الاستدامة فوق ذلك** (کیونکہ استدامت نیت سے فوقیت رکھتی ہے)

ہاں اگر مدتِ سفر سے یہاں نوکر ہوکر آیا اور معلوم ہے کہ پندرہ دن ٹھہرنا ہوگا تو البتہ مقیم نہ ہوگا، جب اس دوسری جگہ سے فارغ ہوکر آئے گا اور یہاں ملازمانہ قیام کرے گا اس وقت سے مقیم ہوگا۔

كما قال في ردالمحتار في واقعة عيسى بن ابان رحمه الله تعالى ان نية الاقامة لم تعمل عملها الا بعد رجوعه لوجود خمسة عشر يوما بلانية خروج في اثنائها بخلاف ماقبل خروجه الى عرفات لانه لما كان عازما على الخروج قبل تمام نصف شهر لايصير مقيما۔

جیسا کہ ردالمحتار میں شیخ عیسیٰ بن ابان رحمہ اللہ تعالیٰ کے واقعہ میں ہے کہ نیت اقامت مؤثر نہیں مگر رجوع کے بعد، کیونکہ پندرہ دنوں کی نیت ہے اور اس میں نکلنے کی نیت بھی نہیں بخلاف عرفات کی طرف نکلنے سے پہلے کے کیونکہ جب نصف ماہ کے اتمام سے پہلے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ مقیم نہیں ہوگا۔

اور جبکہ ایک جگہ نوکر ہوکر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو تو صرف احتمال قاطع اقامت نہ ہوگا ورنہ کوئی وطن اقامت نہ ہوسکے اور اپنے وطن سے مدت سفر پر جو لاکھوں آدمی نوکر ہوتے اور برسوں وہاں رہتے ہیں کبھی مقیم نہ ہوں کہ بدلی یا کسی کام پر بھیجے جانے کا احتمال ہر وقت ہے، (فتاویٰ رضویہ، ج ۸ ص ۲۶۵ ۔ ۲۶۳ رضا فاؤنڈیشن۔ لاہور)۔

امام احمد قادری نے لکھا کہ "نوکری ملازمت ہے، اس میں قصد استدامت (لمبے عرصے کیلئے ٹھہرنا) ہوتا ہے، تو جہاں نوکر ہوکر رہنا اختیار کرے، مقیم ہوجائے گا، اگرچہ بالخصوص پندرہ دن کی نیت نہ ہو، کیونکہ کسی جگہ لمبے عرصے تک رہنے کی نیت بالخصوص پندرہ دن قیام کی نیت سے فوقیت رکھتی ہے۔" اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کسی مقام پر ملازم ہوکر ٹھہر جاتا ہے

تو بظاہر اس کا لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کی نیت محض پندرہ دن قیام کی نیت سے زیادہ مؤثر ہے۔

لیکن سائل کے استفتاء میں صورت حال مختلف ہے، انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ اختتامِ ہفتہ وہ کراچی واپس آجائیں گے، یہاں ابتداءً ہی استدامت (لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے) کی نیت نہیں ہے، لہٰذا یہ لوگ شروع ہی سے مسافر ہیں اور قصر پڑھیں گے، ان کے بقول صرف یہ احتمال ہے کہ کبھی مالکان اتوار کے لئے بھی کام پر روک لیتے ہیں، تو امام احمد رضا قادری نے لکھا کہ: "اور جب کہ ایک جگہ نوکر ہوکر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو، صرف احتمال قاطعِ اقامت نہ ہوگا"۔ یعنی جب کسی جگہ ملازمت اختیار کرلی ہے اور بظاہر لمبے عرصے رہنے کا ارادہ ہے تو صرف اس احتمال سے حکم اقامت ختم نہیں ہوگا کہ پندرہ دن کے اندر وہاں سے جا بھی سکتے ہیں۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جب پہلے سے معلوم ہے کہ اختتام ہفتہ کراچی جانا ہے تو شروع ہی سے مسافر ہے اور قصر پڑھے گا، اور محض یہ احتمال کہ کارخانے کے مالکان اتوار کو روک بھی لیتے ہیں، اس سے حکم سفر وقصر اور عدمِ اقامت ختم نہیں ہوگا اور یہ لوگ "دیوان سٹی" میں قصر ہی پڑھیں گے۔

سنتوں کی قضا

سوال: اگر عذر یا کوتاہی کی بناء پر کسی وقت کی نماز رہ جائے تو اس وقت کی قضا پڑھتے وقت سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی یا نہیں، اور اگر کسی کی فجر کی نماز قضا ہوجائے تو صرف فرض کی قضا پڑھے یا سنتوں کی بھی، (فیصل ندیم احمد قادری، شاہ فیصل کالونی)۔

جواب: سنتوں کی قضا لازم نہیں ہے، اگر خدانخواستہ مثلاً کسی شخص کی ظہر یا عصر یا مغرب کی نماز رہ گئی ہے تو وہ اب صرف فرض کی قضا کرے گا، سنتوں کی نہیں۔ تاہم فجر کی دو سنتیں باقی اوقات کی سنتوں کے مقابلے میں زیادہ مؤکد ہیں، اس لئے بعض نے انہیں واجب کے قریب قرار دیا ہے۔ لہٰذا اگر کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسی دن زوال سے پہلے قضا پڑھ لیتا ہے تو فرض اور سنت فجر دونوں کی قضا کرے، لیکن اگر تنگیٔ وقت یا جماعت چلے جانے کے خوف سے فرض پڑھ لئے تھے اور سنتیں رہ گئی تھیں تو اب صرف سنتوں کی قضا نہیں کرے گا۔

درمختار میں ہے:

(وتقضیٰ) اذا فاتت معہ، بخلاف البواقی۔

"اور فجر کی سنتوں کی قضا پڑھی جائے گی جبکہ فرضوں کے ساتھ فوت ہو جائیں، بخلاف باقی سنتوں کے (کہ ان کی قضا لازم نہیں ہے)"

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وتقضیٰ) ای الی قبیل الزوال، قولہ "معہ" تنازعہ "تقضیٰ وفاتت" فلا تقضیٰ الامعہ حیث فات وقتہا، واما اذا فاتت وحدھا فلا تقضیٰ، ولا تقضیٰ قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولو تبعا علی الصحیح۔

"یعنی اگر فجر کی قضا زوال سے پہلے پہلے پڑھی جائے تو سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی، "تقضیٰ" اور "فاتت" دونوں افعال کا "معہ" کے ساتھ تعلق ہے۔ یعنی فجر کی سنتوں کی قضا نہیں ہے، مگر جبکہ (اسی دن زوال سے پہلے) فرضوں کے ساتھ پڑھے جائیں تو قضا ہے، کیونکہ ان کا وقت فوت ہو چکا ہے، لیکن اگر تنگیٔ وقت یا جماعت کے چھوٹ جانے کے خوف سے فجر کے فرض پڑھ لیے گیے ہوں اور) صرف سنتیں رہ گئی ہوں تو ان کی قضا نہیں ہے، نہ طلوع سے پہلے اور نہ ہی زوال کے بعد، تو صحیح قول کے مطابق (زوال کے بعد) فرضوں کی متابعت میں بھی سنتوں کی قضا نہیں ہے، (ردالمحتار، جلد ۲، ص ۹۵ ۳ داراحیاء التراث العربی)"۔ (بقیہ جواب صفحہ 415 پر)

مرضِ ریاح میں نماز کی ادائیگی

سوال: ریح خارج ہونے کے سبب اگر وضو زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے تو نماز کیسے پڑھیں؟

(لئیق، جیکب لائن۔ کراچی)

جواب: اگر یہ شکایت کبھی کبھار پیدا ہو تو ہر بار تازہ وضو کر کے نماز پڑھیں، نماز کے دوران ہو جائے تو فوراً نماز چھوڑ کر چلے جائیں اور تازہ وضو کر کے اسی پر بنا کر کے نماز مکمل کرلیں یا از سرِ نو پڑھ لیں۔ لیکن غلبۂ ریاح یا کثرتِ ریاح کا عارضہ اتنا شدید ہو کہ ایک وقت کی نماز پڑھنا بھی دشوار ہو جائے اور ایسا مسلسل یا بار بار ہوتا ہو تو یہ ایک بیماری ہے اور ایسا شخص شرعاً معذور ہے۔ اسے چاہئے کہ ایک فرض نماز کے وقت کے لئے تازہ وضو کر لے اور اس وضو سے اس وقت کے

اندر جتنی فرض یا نفل نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے اور تلاوت بھی کر سکتا ہے، خواہ ریح خارج ہوتی رہے، بس نئے وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا پڑے گا، یہی حکم اس کا ہے جسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا زخم سے خون یا پیپ رستی ہو۔

قرآن کی تلاوت کے دوران 'ن' آجائے تو کس طرح پڑھیں

سوال: قرآن مجید کی تلاوت کے دوران بعض جگہ چھوٹا سا "ن" لکھا ہوتا ہے، اسے کس طرح پڑھا جائے، جیسے سورہ "ھُمَزَۃ" میں وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝ الَّذِي۔

(مسز سرور مظہر۔ ڈیفنس فیز II)

جواب: اگر "ھُمَزَۃ" پر وقف کریں تو "اَلَّذِی" پڑھیں گے، اور اگر ملا کر پڑھیں وقف نہ کریں تو "ن" پڑھیں گے، یعنی لُّمَزَةِنِ الَّذِي۔

عورتوں کی جماعت

سوال: اگر عورتیں مل کر جماعت کا اہتمام کریں اور ایک عورت ان کی امامت کرے، تو کیا اس طرح خواتین کا باجماعت تراویح پڑھنا جائز ہے؟

(نسیم ناصر، گلشن اقبال۔ عبدالرؤف، کلفٹن۔ سلطانہ بیگم، کلفٹن۔ محمد طیب، ناظم آباد)

جواب: مردوں کے لئے عورت کا امام بننا بالاجماع باطل ہے۔ عورت کا عورتوں کی امامت کرنے کے بارے میں یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک جائز نہیں ہے، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے، فقہ حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں عورت کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے۔ سنن ابی داؤد، سنن کبریٰ بیہقی اور المستدرک للحاکم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر پر امامت کی اجازت دی تھی اور ان کے لئے ایک بوڑھے شخص کو مؤذن مقرر کیا تھا۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ چلو شہیدہ کے پاس جائیں اور ان کی زیارت کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور عہدِ خلافت فاروقی میں ان کے مُدبَّر (جسے مالک یہ کہہ دے کہ تو میری موت کے بعد آزاد ہے) غلام اور باندی نے انہیں شہید کردیا۔ فقہاءِ احناف میں سے علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ احادیث کی توجیہ بھی کی ہے۔

ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کے لئے عورت کی امامت زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہے۔ تاہم اگر کہیں ایسا ہو کہ عورتیں عورت کو امام بنالیں تو امام بننے والی خاتون صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

سجدۂ تلاوت بھول جائیں تو؟

سوال: سجدۂ تلاوت بھول جائیں تو کس طرح اور کب ادا کیا جائے۔

(فیروز سلطانہ۔ناظم آباد)

جواب: اگر نماز کے اندر بھول گئے ہیں اور بروقت ادا نہیں کیا تو نماز کے اندر یاد آنے پر ادا کردیں اور سجدۂ سہو بھی کریں، اگر نماز کے اندر یاد نہیں آیا اور نماز سے فارغ ہوگئے تو نماز ادا ہوگئی اور نماز کے اندر بھولے ہوئے سجدۂ سہو کی قضا خارج نماز نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں۔ اگر خارج نماز تلاوت کے دوران آیت آ گئی اور بروقت سجدہ ادا نہیں کیا تو بعد میں یاد آنے پر ادا کرلیں، مکروہ اوقات کے علاوہ۔

ایک جگہ پنج وقتہ نماز ادا کی جارہی تھی، اب قریب مسجد بن گئی تو؟

سوال: ایک جگہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جاتی رہی ہے، قریب مستقل مسجد بن گئی ہے، تو اب سابقہ جگہ کا کیا حکم ہے؟ (محمد حسن۔لیمارکیٹ)

جواب: اگر وہ باقاعدہ مسجد نہیں بنائی گئی تھی بلکہ محض جائے نماز کے طور پر استعمال کی جارہی تھی تو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد یہ جگہ کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، اور اگر بانی نے اسے باقاعدہ مسجد بنایا تھا اور اسے اس جگہ پر مالکانہ تصرف کا حق حاصل تھا، تو اب وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، اس کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی، بشرطیکہ جائز طور پر اسے مسجد کیلئے وقف کیا گیا ہو۔

نماز میں قصر، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت کے مسائل

سوال: میں اپنے شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد میں مقیم ہوں اور ہم دونوں ڈاکٹر ہیں اور گورنمنٹ سروس میں ہیں، میرے شوہر کے والدین لاہور کی ایک مضافاتی بستی میں مقیم ہیں اور میرے شوہر کی ولادت اور انٹر تک تعلیم بھی وہیں پر ہوئی ہے، اب ہم دونوں میاں بیوی نے ایبٹ آباد کو ذہنی، فکری اور عملی طور پر مستقل وطن کے طور پر اختیار کرلیا ہے، لیکن ابھی تک ہمارا وہاں پر کوئی

مکان یا غیر منقولہ جائیداد یعنی پلاٹ وغیرہ نہیں ہے، ہم اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب عطا ہوں گے تو اپنا مکان بھی بنالیں گے، تاہم، ہم دونوں میاں بیوی نے لاہور کو اپنا وطنِ اصلی ہونے کے تصور کو ترک کردیا ہے، بلکہ یہ کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب مہیا ہونے اور حالات سازگار ہونے پر میرے سسرال والے سب کے سب مانسہرہ ہزارہ منتقل ہوجائیں گے۔ میرے والدین پشاور میں مستقل طور پر مقیم ہیں، والد صاحب کا مقام پیدائش اور آبائی گھر، والدہ صاحبہ (یعنی میری دادی) وغیرہ مانسہرہ کے ایک گاؤں میں مقیم ہیں، کبھی میں چھٹی پر والدین کے ہاں پشاور چلی جاتی ہوں، کبھی والد صاحب کے آبائی گاؤں جاتی ہوں اور کبھی ہم سسرال سے ملنے لاہور چلے جاتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں فقہی احکام اور نماز قصر کے اعتبار سے ایبٹ آباد ہمارا ''وطنِ اصلی'' قرار پائے گا یا ''وطنِ اقامت''؟۔ ہم کبھی مختصر قیام کے لئے اپنے شوہر کے والدین کے ہاں لاہور جائیں جو کہ میرے شوہر کی جائے پیدائش اور بدستور آبائی گھر ہے، یا ہم میرے آبائی گھر پشاور جائیں، جو کہ میرے شوہر کا سسرالی گھر بھی ہے، یا کبھی ہم مانسہرہ میں میرے والد صاحب کے آبائی گھر جائیں تو ہمارے لئے یہ تینوں مقامات ''وطنِ اصلی'' کے حکم میں ہوں گے اور ہم ان مقامات پر مدتِ قیام سے قطعِ نظر پوری نماز پڑھیں گے یا اب یہ ''وطنِ اصلی'' نہیں رہے اور پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر نماز پڑھیں گے۔ اور کیا ایبٹ آباد ہمارا وطنِ اصلی ہے یا وطنِ اقامت؟۔ بعض علماء کرام سے سنا ہے کہ مقام پیدائش یا جہاں والدین مستقل طور پر سکونت پذیر ہوں، ہمیشہ ''وطنِ اصلی'' ہی کے حکم میں رہتے ہیں، اسی طرح جب کوئی شخص سسرال میں جائے گا، تو اس کا حکم ''وطنِ اصلی'' کا ہے اور وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا، اور جہاں ملازمت کی غرض سے مقیم ہے، وہ ''وطنِ اقامت'' قرار پائے گا اور قصر یا پوری نماز پڑھنے کے لئے مدتِ قیام کا اعتبار ہوگا، (ڈاکٹر روبینہ شاہین۔ایبٹ آباد)

جواب: آپ کا سوال یقیناً کافی پیچیدہ ہے، میرے خیال میں ''وطنِ اصلی'' اور ''وطنِ اقامت'' کی فقہی تعریفات کے اطلاق میں بعض حضرات کو مغالطہ ہوجاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے میں نمازِ قصر کے مسئلے پر ''اوطان'' (یعنی وطنِ اصلی و اقامت) کی فقہی تعریفات مستند ''کتبِ فتاویٰ'' سے نقل کروں گا اور آخر میں آپ کے سوالات کے جوابات عرض کروں گا۔

علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) ھو موطن ولادته اوتاھله اوتوطنه۔

"کسی شخص کا وطنِ اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاھلی و وطن الفطرة عن القھستانی، قوله: (اوتاھله) ای تزوجه۔

"وطنِ اصلی" کو "وطنِ اصلی" اور وطنِ اھلی" اور "وطن الفطرة" بھی کہا جاتا ہے، اور تاھل کے معنی ہیں: شادی کرنا"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں: "شرح المنیہ" میں ہے: اور اگر کسی شخص نے کسی شہر میں شادی کر لی اور اس نے وہاں اقامت کی نیت نہیں کی، تو ایک قول یہ ہے کہ وہ مقیم نہیں بنے گا اور ایک قول یہ ہے کہ مقیم بن جائے گا، اور یہ قول زیادہ مناسب ہے، اور اگر اس کی دو شہروں میں دو بیویاں ہوں، تو وہ ان میں سے جس شہر میں بھی داخل ہو، (داخل ہوتے ہی) مقیم ہو جائے گا، اور اگر کسی ایک مقام پر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے تو اب وہ اس کا وطنِ اصلی نہیں رہے گا، خواہ وہاں پر اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بھی ہو، کیونکہ اعتبار مکان کا نہیں بیوی بچوں کا ہے، جیسے اگر وہ کسی مقام پر شادی کر کے رہنے لگتا ہے، حالانکہ وہاں اس کا مکان وغیرہ نہیں ہے، تو بھی وہ اس کا وطنِ اصلی ہی کہلائے گا، ایک قول یہ ہے کہ بیوی کی وفات کے بعد بھی وہاں اس کا وطنِ اصلی ہی رہے گا، اور توطن (یعنی کسی مقام کو بطور وطن اختیار کرنے) کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص وہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لے اور وہاں سے اس کا کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو، اگرچہ وہاں اس نے شادی نہ کی ہو۔ اگر کسی ایسے مقام پر اس کے والدین مقیم ہیں جو اس کی جائے ولادت نہیں ہے اور وہ بالغ ہے (یعنی اب حکماً ماں باپ کے تابع نہیں ہے) اور اس نے وہاں شادی بھی نہیں کی، تو وہ اس کا وطن نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہاں وہ مستقل رہنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اپنے پہلے وطنِ اصلی کو خیر باد کہہ دے، یہ مسئلہ "شرح المنیہ" سے ماخوذ ہے۔

(ردالمحتار، ج ۲ ص ۵۳۶، ۵۳۵، طبع جدید)

فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۴۳ پر ہے:

عبارة عامة المشائخ ان الاوطان ثلثة، وطن اصلی وھو مولدالرجل اوالبلد الذی تأھل به و وطن سفر و قدسمی وطن اقامة و ھوالبلد الذی ینوی المسافر الاقامة فیه خمسة عشر یوما او اکثر و وطن سکنی وھو البلد الذی ینوی الاقامة فیه دون خمسة عشر یوما، و عبارة عامة المحققین من مشائخنا ان الوطن وطنان، وطن اصلی و وطن اقامة ولم یعتبروا وطن السکنی وطنا وھو الصحیح ھکذا فی الکفایة۔

عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطنِ اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطنِ سفر اور اسے وطنِ اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطنِ سکنیٰ ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی دو ہی قسمیں ہیں، وطنِ اصلی اور وطنِ اقامت، اور وہ "وطنِ سکنیٰ" کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے"۔

علامہ زین الدین ابن نجیم البحرالرائق ج ۲ ص ۱۳۶ پر لکھتے ہیں:

والوطن الاصلی ھو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذھا دارا او توطن بھا مع اھله و ولده ولیس من قصده الارتحال عنھا بل التعیش بھا

"اور وطنِ اصلی، انسان کا وہ وطن ہے، جسے اس نے اپنا گھر بنا لیا ہو یا وہ وہاں پر اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ رہ رہا ہو اور اس کا وہاں سے منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو بلکہ (مستقل طور پر) وہاں رہنے کا ارادہ ہو"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: وطنِ اصلی اپنی مثل (یعنی وطنِ اصلی) سے ہی باطل ہوتا ہے، نہ کہ کسی

اور سے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ کسی مقام کو بطور وطنِ (اصلی) اختیار کرلے اور اس کے بیوی بچے وہاں منتقل ہو جائیں، تو اب پہلا وطن، وطنِ اصلی نہیں رہے گا، یہاں تک کہ اگر پھر کبھی وہاں جائے تو مسافر کی حیثیت سے نماز پڑھے گا، یہ جو ہم نے پہلے وطنِ اصلی سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہونے کی قید لگائی ہے، اس لئے کہ اگر اس سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل نہیں ہوا، لیکن اس نے کسی اور مقام پر بھی شادی کر کے وہاں اپنے اہل کے ساتھ قیام اختیار کر لیا ہے، تو اس صورت میں پہلا اور دوسرا دونوں کا حکم وطنِ اصلی کا ہی ہوگا اور دونوں مقام پر پوری نماز پڑھے گا، آگے چل کر لکھتے ہیں: ''محیط میں کہا اگر کسی شخص کی ایک بیوی بصرہ میں ہیں اور دوسری کوفہ میں، اور بصرہ میں بیوی کا انتقال ہوگیا، حالانکہ ابھی وہاں اس کا مکان زمین وغیرہ باقی ہے، تو ایک قول یہ ہے کہ اب بصرہ وطنِ اصلی نہیں رہے گا، کیونکہ وہ وہاں اپنے بیوی بچوں کے سبب وطنِ اصلی کے حکم میں تھا نہ کہ غیر منقولہ جائیداد کی وجہ سے، آپ غور تو کریں، اگر وہ کسی مقام پر بیوی بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرتا ہے، حالانکہ وہاں اس کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، تو وہ اس کا وطنِ اصلی بن جائے گا''۔

ان مستند ''کتبِ فقہ و فتاویٰ'' کے حوالہ جات اور تفصیلی عبارات نقل کرنے کے بعد جو مفہوم اور خلاصہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ''توطن'' یعنی کسی مقام کو وطنِ اصلی کے طور پر اختیار کرنے کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے کہ وہاں اس شخص کے زیرِ ملکیت مکان یا غیر منقولہ جائیداد ضرور ہو، کیونکہ ان چیزوں کا حصول مالی وسعت پر موقوف ہے، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ مقام اس کی جائے پیدائش ہو، بلکہ اپنی نیت، عمل اور ارادے سے کسی مقام پر مستقل طور پر قیام کرنے سے وہ مقام ''وطنِ اصلی'' بن جاتا ہے اور اسی کو ''کتب فقہ و فتاویٰ'' میں ''توطن'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جائے ولادت کا ہمیشہ ''وطنِ اصلی'' رہنا ضروری نہیں ہے، خواہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں وہاں پر مقیم ہوں، یا والدین کا انتقال ہو چکا ہو لیکن وہاں اس کی مملوکہ یا موروثی جائیداد و غیر منقولہ (یعنی زمین و مکانات) ہو۔ عاقل و بالغ ہونے کے بعد جب کسی نے اپنے مولد یا موروثی مقام کے علاوہ کسی دوسرے مقام کو مستقل وطن کے طور پر اختیار کر کے وہاں اقامت اختیار کر لی اور اپنی نیت اور ارادے میں اور عملاً بھی پہلے ''وطنِ اصلی'' کو ترک کر دیا تو اب یہ دوسرا وطن ہی وطنِ اصلی ہے، پہلا وطن، وطنِ اصلی نہیں رہا، ''البحر الرائق'' کی عبارت سے

یہی مترشح ہوتا ہے۔ فتاویٰ دار العلوم دیوبند مکمل و مدلّل (جلد چہارم) میں سوالات نمبر ۲۱۹۸ اور ۲۱۹۹ کے جوابات میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اسی طرح ''تأہل'' کے معنی محض شادی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس مقام پر اہل و عیال کے ساتھ رہنے کے ہیں، لہٰذا اگر اس نے اپنے سسرالی گھر یا مقام کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش کے لئے اختیار کر لیا ہے تو وہ ''وطنِ اصلی'' کے حکم میں ہوگا اور وہ وہاں جب بھی جائے گا، خواہ ایک دن کے لئے سہی، پوری نماز پڑھے گا، لیکن جب کوئی شخص اپنے سسرالی گھر یا مقام پر اپنے بچوں کے ساتھ مقیم نہیں ہے تو محض خسر کا گھر ہونا، وطنِ اصلی کے حکم میں نہیں ہے، فتاویٰ دار العلوم دیوبند مدلّل و مکمل (جلد چہارم) میں سوال نمبر ۲۲۵۴ کے جواب میں یہی موقف اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم اس مقام پر یہ لکھا ہے کہ اگر کسی مقام پر نماز کامل یا قصر پڑھنے میں اشتباہ ہو جائے تو احتیاطاً پوری پڑھ لے، جبکہ فتاویٰ شامی میں اس طرح کے اشتباہ کے موقع پر فرمایا ہے:

لانه اجتمع فی هذه الصلوٰة ما یوجب الاربع وما یمنع فرجحنا ما یوجب الاربع احتیاطاً۔

''کیونکہ اس نماز میں ایسے دو اسباب یا دو صورتیں جمع ہوگئی ہیں جن میں سے ایک تکمیلِ نماز کو واجب کرتی ہے اور دوسری اس کیلئے مانع ہے، تو ہم نے احتیاطاً اس صورت کو ترجیح دی ہے جو (قصر کے بجائے) تکمیلِ نماز کو واجب کرتی ہے''۔

(فتاویٰ شامی، باب صلوٰۃ المسافر تحت قولہ قاصداً، ج۱، ص ۷۳۳)

لہٰذا میری رائے میں چونکہ آپ لوگوں نے ایبٹ آباد کو وطنِ اصلی کے طور پر نیت و ارادے اور عمل سے اختیار کر لیا ہے، لہٰذا اب وہ آپ کا ''وطنِ اصلی'' ہے اور آپ وہاں ہر صورت میں پوری نماز پڑھیں گے۔ اور آپ کے شوہر نے اپنے آبائی مقام لاہور کی وطنیت کو مستقل طور پر ترک کر لیا ہے اور وہ اب عاقل و بالغ ہیں اور ماں باپ کے تابع نہیں ہیں، تو آپ کے والدین اور آپ کے شوہر کے خسر کا مستقل قیام تو ضرور ہے لیکن آپ کے شوہر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں مستقل طور پر مقیم نہیں ہیں، لہٰذا وہاں آپ لوگ پندرہ دن سے کم مدتِ اقامت کی صورت میں قصر پڑھیں گے۔ اسی طرح آپ کے والد کا آبائی مقام بھی آپ کا ''وطنِ اصلی'' نہیں رہا۔

میری گزارش ہے کہ اگر یہ سطور اہلِ فتویٰ علماء کی نظر سے گزریں اور وہ ان کا مطالعہ کرنے کی

زحمت گوارا فرمائیں تو میرے اس موقف سے اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں میں اپنی آراء اور دلائل سے مطلع فرمائیں، غلطی پر آگاہ ہونے کی صورت میں میں اپنے موقف سے رجوع کرنے میں ادنیٰ تامل بھی نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے حق کی حقانیت پر آگاہی نصیب فرمائے اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور باطل کے بطلان پر آگاہی عطا فرمائے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے اور رائے اور فکر میں کجی سے محفوظ فرمائے۔

☆☆☆..........☆☆☆..........☆☆☆

کتاب الجنائز

اپنے یا احباب کیلئے زندگی میں قبر تیار کرنا

سوال: کیا کوئی شخص اپنے یا اپنے احباب کے لئے زندگی ہی میں قبر تیار کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت یا ممانعت تو نہیں ہے؟ (حنیف۔کورنگی)

جواب: جی ہاں زندگی میں قبر تیار کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ''جس نے اپنے لئے زندگی ہی میں قبر کھودی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسے اس پر اجر ملے گا''۔ ممکن ہے اجر کی حکمت یہ ہو کہ اسے موت کی یاد آتی رہے گی۔ باقی اس کا اسی قبر میں دفن ہونا یا کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے، اور قرآن مجید میں ہے:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان: ۳۴)

''کسی کو خبر نہیں کہ اس کی موت کس زمین پر آئے گی۔

تدفین کے بعد میت کا قبر سے نکالنا

سوال: کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کن وجوہات کی وجہ سے آپ میت کو قبر سے نکال کے دوسرے قبرستان میں دفنا سکتے ہیں۔ ہمارا واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عزیز ڈھائی مہینے پہلے لندن کے قبرستان میں دفنائے گئے اور ہم نے ان کو وہاں سے نکالنا ہے۔

(۱) مسلمانوں کے ساتھ عیسائی بھی دفن ہیں۔ ہمارے علم میں یہ نہیں تھا۔

(۲) قبرستان کے یہودی مالک وہاں پہ خصوصی دھیان نہیں دیتے اور وہ جگہ ویران لگتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں کا مالک یہودی ہے۔

(۳) ہماری گزارش کرنے کے باوجود یہودی مالک اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور نعوذ باللہ ہمارے عزیز کی قبر کے پاس ہم نے ان کی ناپاکی دیکھی تھی۔

(۴) ہم نے یہودیوں کے ساتھ کوئی بھی کاغذات پہ دستخط نہیں کیے اور وہ اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں لازمی قبر پکی کرنی ہے اور اگر ہم ایک مسلمان بھائی کی قبر کو پکی کرنے کا حکم دیتے ہیں تو یہودیوں کو اس بات کے بھی پیسے چاہئے۔

(۵) اگر کل کوئی ہمارے عزیز کی قبر کے پتھر کو توڑ دے تو وہ اس کی ذمہ داری نہیں اُٹھائیں گے اور

الٹا ہم سے پیسے مانگیں گے۔

(۶) تقریباً کوئی ایک سال پہلے اس قبرستان میں رات کے وقت وہاں کچھ لوگوں نے نعوذ باللہ قبروں کے پتھروں کو توڑ دیا تھا۔ کل رات بھی انہوں نے قبرستان کے گیٹ کو تالا نہیں لگایا۔

(۷) مرحوم کے چار چھوٹے بچے ہیں جو اپنے والد صاحب کے لیے قبرستان جا کر دعا مانگنے گئے۔ ان بچوں کے لیے وہ ماحول اور یہودی لوگ ٹھیک نہیں۔

(۸) ہم نے میت کو دفناتے وقت امانت نہیں کی تھی۔ (محمد کلیم......انگلینڈ)

جواب: صورت مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد بغیر ضرورتِ شرعیہ کے قبر سے نکالنا حرام ہے۔

شرعی ضرورت سے مراد وہ امور ہیں جن کی ادائیگی کا تعلق حقوق العباد سے ہو۔ جیسے بغیر اجازت کے کسی کی زمین میں میت کو دفن کر دیا گیا ہو یا دفن کرتے وقت کسی کی کوئی قیمتی چیز قبر میں گر گئی ہو تو ان صورتوں میں قبر کو کھولنا جائز ہے۔

(فتاویٰ شامی، جلد ۳ ص ۱۳۲، بدائع الصنائع، جلد ۲ ص ۳۵۷، شرح صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۸۱۰)

سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں کسی بھی صورت کو ''شرعی ضرورت'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ:

(۱) مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا دفن ہونا۔ (۲) مالک قبرستان کا یہودی ہونا

(۳) اُس کا اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دینا اور کتوں کا ناپاکی پھیلانا

(۴) مالکان کے ساتھ کاغذات پر دستخط کا نہ کرنا۔ (۵) کسی کا قبروں کے پتھروں کو توڑنا

(۶) مرحوم کی اولاد کا قبر پر جا کر دعا نہ مانگ سکنا۔ (۷) میت کو دفناتے وقت امانت نہ کرنا۔

ان میں سے کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر قبر کو کھولنے اور اس سے مردے کو نکالنے کی اجازت دی جا سکے۔

میت کو کسی جگہ امانتاً دفن کرنے کے بعد بھی قبر سے نکالنا حرام ہے، (فتاویٰ رضویہ، جلد ۴/۱۱۶)۔

نیز قبر پر جا کر دعا مانگنا ضروری نہیں ہے، گھر سے بھی دعاء، ایصال ثواب اور فاتحہ وغیرہ کی جا سکتی ہے۔ نیز قبر کو پختہ کرنے کی بھی شرعاً ممانعت ہے۔

نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ باندھے ہوئے پھیرے یا ہاتھ چھوڑ کر

سوال: اکثر دیکھا گیا ہے کہ نمازِ جنازہ کے اختتام پر بعض لوگ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے ہوئے دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں اور پھر دونوں ہاتھ کھولتے ہیں جبکہ بعض لوگ دائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے دایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے بایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں، اور اس کے برعکس بعض لوگ نمازِ جنازہ کی چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں ہاتھ کھول دیتے ہیں اور پھر دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں، ان میں سے کون سا طریقہ درست ہے، دلیل کے ساتھ جواب دیجئے، (مولانا منور احمد۔ ملیر......محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال)

جواب: امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز سے یہی سوال ان الفاظ میں دریافت کیا گیا کہ: ''نماز جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑنے کے بعد پھیرنا چاہئے یا قبل ہاتھ چھوڑنے کے، افضل کیا ہے؟''، تو آپ نے جواب دیا: ''ہاتھ باندھنا سنت اس قیام کی ہے جس کے لیے قرار ہو، کما فی الدر المختار وغیرہ من الاسفار (یعنی درمختار وغیرہ کتابوں میں ہے)، سلام وقتِ خروج ہے، اس وقت ہاتھ باندھنے کی طرف کوئی داعی نہیں، تو ظاہر یہی ہے کہ تکبیرِ چہارم کے بعد ہاتھ چھوڑ دیا جائے۔'' اس کے بعد اس مسئلے کے بارے میں ان سے ''بہارِ شریعت'' کے حوالے سے سوال کیا گیا تو جواب کے آخری حصے میں آپ لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نہ قیام ذی قرار ہے نہ اس میں کوئی ذکر مسنون، تو ہاتھ باندھے رہنے کی کوئی وجہ نہیں، تکبیر رابع (چوتھی) کے بعد خروج عن الصلوٰۃ کا وقت ہے اور خروج کے لیے اعتماد کسی مذہب میں نہیں،

(فتاویٰ رضویہ جلد نہم صفحہ ۱۹۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور)۔

امام احمد رضا قادری کے بیان کیے ہوئے اصول کی تائید درمختار اور ردالمحتار کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

(ولیس بین تکبیراته ذکر مسنون) ولذا یرسل یدیه: ای فی اثناء التکبیرات ویضعهما بعد الثالثة کما فی "شرح المنیة" لان الوضع سنة قیام طویل فیه ذکر مسنون.

''اور عیدین کی زائد تکبیروں کے درمیان ذکر مسنون نہیں ہے، لہٰذا اپنے دونوں ہاتھوں کو

چھوڑ دے، یعنی عیدین کی زائد تکبیرات کے درمیان دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دے اور (پہلی رکعت میں) تیسری تکبیر کے بعد باندھ لے، جیسا کہ "شرح المنیہ" میں ہے، کیونکہ ہاتھ باندھنا اس طویل قیام کی سنت ہے جس میں کوئی مسنون ذکر ہو"۔

(فتاویٰ شامی، جلد ۳، صفحہ ۵۴-۵۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، لبنان)

یہاں تو اصول بیان ہوا، خلاصۃ الفتاویٰ مع مجموعۃ الفتاویٰ مؤلفہ امام طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی ۵۴۲ھ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۵ پر صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ درج ہے، ملاحظہ کیجئے۔

ولایعقد بعد تکبیر الرابع لانه لا یبقیٰ ذکر مسنون حتی یعقد فالصحیح انه یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین هکذا فی الذخیرة.

"اور (نماز جنازہ کی) چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے، کیونکہ اب کوئی ذکر مسنون باقی نہیں رہا کہ بدستور ہاتھ باندھے رکھے، پس صحیح یہی ہے کہ (نماز جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد) دونوں ہاتھ کھول دے اور دونوں جانب سلام پھیرے، "ذخیرہ" میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے"۔

متعدد جنازے ایک ساتھ کیسے پڑھے جائیں؟

سوال: اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہوں، جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل ہوں۔ تو کیا ان کی نمازِ جنازہ ایک ساتھ پڑھی جاسکتی ہے؟ اگر پڑھی جاسکتی ہے تو ان کے لئے کون سی دعا پڑھی جائے گی؟ (غلام مرشد۔سندھوئی، آزاد کشمیر)

جواب: علامہ ابن عابدین شامی، فتاویٰ شامی (ردالمحتار ج ۳ ص ۱۱۹-۱۱۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ) میں لکھتے ہیں: "اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہو جائیں تو ہر ایک کی نمازِ جنازہ اکٹھے پڑھنے کی بجائے الگ الگ پڑھنا افضل ہے، اور الگ الگ پڑھنے کی صورت میں ان کے ظاہری حالات کے اعتبار سے جو افضل ہو اس کی نماز پہلے پڑھی جائے اور پھر اسی طرح حسبِ درجہ بدرجہ سب کی پڑھی جائے۔ لیکن اگر سب اموات کی نمازِ جنازہ بیک وقت پڑھنا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے، اگر متعدد جنازے بیک وقت ایک ساتھ پڑھنے کا ارادہ ہو تو اموات کو جنازہ پڑھنے کے

لئے رکھنے کی دو صورتیں ہیں:

۱) یہ کہ اموات کو شمالاً جنوباً ایک لمبی صف میں رکھ دیں اور امام اس میت کے سامنے کھڑا ہو، جو ان سے تقویٰ کے اعتبار سے سب سے افضل ہے اور ظاہر ہے کہ امام اور مقتدی تمام موجود اموات کا جنازہ پڑھنے کی نیت کریں گے۔

۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جنازے شرقاً غرباً امام کے سامنے ایک لائن میں رکھ دیے جائیں اور امام کے سب سے قریب وہ میت ہو جو سب سے افضل ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ اموات کے جنازے رکھے جائیں، یہ صورت نسبتاً بہتر ہے، اسی طرح متعدد اموات ہونے کی صورت میں امام کے قریب پہلے بالغ مردوں کے جنازے ہوں، پھر بچوں کے، پھر خنثیٰ کے (اگر کوئی ہو)، پھر بالغہ عورت اور پھر قریب البلوغ لڑکیوں کے۔ یہی صورت مسئلہ علامہ زین العابدین ابن نجیم نے البحرالرائق میں ج ۲ ص ۱۸۷، پر، علامہ احمد بن محمد الطحطاوی نے حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۵۹۲ پر اور شیخ حسن بن عمار نے نورالایضاح میں ص ۱۲۵ پر تحریر کی ہے۔ علامہ طحطاوی نے مزید یہ مسئلہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نمازِ جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد جو بالغ میت کی دعا ہے وہ ویسے بھی صیغہ جمع کے ساتھ ہے، لہٰذا اگر اموات ایک سے زائد ہوں تو سب ہی کو یہ دعا شامل ہو جاتی ہے، البتہ اگر متعدد اموات میں چھوٹے بچے بھی ہوں تو بالغ کی دعا کے بعد بچے یا بچی والی دعا بھی پڑھ لینی چاہئے، اگر بچے دو ہوں تو ضمیر "ہ" یا "ھا" کے بجائے "ھما" اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو جمع کی ضمیر "ھم" پڑھ لیں لیکن اگر صرف بالغ ہی کی دعا پڑھ کر سلام پھیر دیا، تب بھی سب کا جنازہ صحیح ادا ہو جائے گا۔

دعاء بعد الجنازہ

سوال: ہمارے علاقے میں بعض لوگ عوام کو علی الاعلان یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ آپ لوگ نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر جو دعاءِ مغفرت کرتے ہیں اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اگر ہے تو ہمیں ثبوت پیش کریں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، نیز جو لوگ علی الاعلان اسے ناجائز کہہ کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے، (مولانا نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)۔

جواب: اس سوال کا براہ راست جواب سننے سے پہلے ایک دو اصولی باتیں سمجھ لیجیے۔ اسلام اور دنیا کے ہر نظامِ قانون اور اصولِ قانون کا ایک بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ اشیاء و امور میں اصل اباحت (یعنی جائز ہونا) ہے، لہٰذا کہیں بھی قوانین کی تشکیل میں مباحات (جائز امور) کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر شعبے کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر امور جائز ہیں، مثلاً جن خواتین سے نکاح شرعاً حرام ہے، قرآن نے ان کو سورۃ النسآء آیات ۲۲ تا ۲۵ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پھر فرمایا:

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ (النساء: ۲۴)

"اور ان (مذکورہ محرمات) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے"۔

اسی طرح قرآن نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں ماکولات میں سے محرمات (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیر اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے) کا ذکر فرمایا، احادیث میں اس پر درندے، شکاری پرندے اور گدھے کا اضافہ فرمایا گیا، بعض دیگر جانوروں کو قیاس واجتہاد کے ذریعے فقہاء امت نے مکروہ تحریمی قرار دیا، ان کے علاوہ دیگر لاتعداد جانور جو حلال ہیں، کتاب وسنت اور ائمۂ مجتہدین نے ان کا تفصیل سے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنا عملاً ممکن ہے، ہماری عملی زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ جس سڑک پر دائیں یا بائیں مڑنا منع ہو، یا جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا منع ہو ٹریفک کا عملہ وہاں مخصوص ممانعت کا نشان لگا دیتا ہے، باقی جس جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع نہیں ہے، وہاں کوئی مخصوص نشان نہیں لگایا جاتا، ممانعت کا نشان نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانے کی عام اجازت ہے بعینہٖ یہی اصول احکامِ شریعت کا ہے، حدیث شریف میں ہے:

عن سلمان قال: سئل رسول اللہ ﷺ عن اشیاء فقال: الحلال ما احل اللہ فی کتابہ والحرام ما حرمہ اللہ فی کتابہ وما سکت عنہ فھو مما قد عفیٰ عنہ فلا تتکلفوا۔

"حضرت سلمان سے روایت ہے کہ بعض اشیاء (کی حلت وحرمت) کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (شرعی حکم) دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دے دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی

کتاب میں حرام قرار دے دیا ہے اور جس کے بارے میں (کتاب وسنت میں) سکوت فرمایا گیا تو وہ معاف ہے۔ (یعنی جائز وحلال ہے) لہٰذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو"۔ (سنن ابن ماجہ، ص ۲۴۹، سنن ترمذی، ص ۲۱۹)

اس حدیث سے کتبِ تفاسیر وفقہ میں اس مفہوم پر استدلال کیا گیا ہے۔

سنن بیہقی صفحہ ۱۲، جلد نمبر ۱۰، پر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع ہے:

وما سکت عنہ فھو عافیۃ فاقبلوا من اللہ العافیۃ فان اللہ لم یکن نسیاً ثم قرأ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا۔

"جس چیز (کی حرمت کے بیان) سے قرآن نے سکوت کیا وہ معاف ہے (یعنی جائز ہے) تو اللہ کی طرف سے معافی (یا جواز کی رعایت) کو (خوش دلی سے) قبول کرو کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپ نے (سورہ مریم کی آیت نمبر ۶۴) تلاوت فرمائی (جس کا معنی یہ ہے کہ) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں"۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

المختار ان الاصل عند الجمھور من الحنفیۃ والشافعیۃ الاباحۃ۔

"قول مختار یہ ہے کہ جمہور حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک (امور واشیاء میں) اصل اباحت (جائز ہونا) ہے"۔ (جلد ۱، صفحہ ۹۸)

لہٰذا اگر کوئی شخص، کسی خاص موقع ومقام کے لیے یا علی الاطلاق کسی چیز کی حرمت یا کراہت کا مدعی ہے تو بارِ ثبوت اس پر ہے کہ وہ عدمِ جواز کی شرعی دلیل پیش کرے، نہ کہ فریقِ مخالف (قائل جواز) سے دلیل طلب کرے۔

دوسرا اصولی مسئلہ یہ کہ فی نفسہٖ دعا اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست وکراہت کے علاوہ دعا کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی ہے نہ کسی خاص لب ولہجے اور زبان کی، یہ الگ بات ہے کہ مسنون دعاؤں کی برکات زیادہ ہیں۔ بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو اتنی مرغوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں فرمایا:

اَکثِرِ الدُّعَآء

"کثرت سے دعا کیا کرو"۔ (المستدرک، کتاب الدعاء ج ۱ ص ۵۲۹)

الدعاء مخ العبادة۔

دعاء عبادت کا مغز ہے،(مشکوٰۃ،کتاب الدعوات)''۔

لا یرد القدر الا الدعاء۔

دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے''۔(مشکوٰۃ،کتاب الدعوات)

سَلُوا اللّٰہ من فضلہٖ فان اللّٰہ یحب ان یسال۔

''اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ کوئی اس سے سوال کرے''۔(مشکوٰۃ،کتاب الدعوات)

اور وفات یافتہ اہلِ ایمان کے لیے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ

''اور جو ان کے بعد آئے وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان دینی بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بہت مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔(الحشر:۱۰)

اس آیت کا سیاق وسباق (مورد) تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اپنے اسلاف و سابقین اہلِ ایمان کے لیے دعاء مغفرت کو اہلِ ایمان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اب اس دعاء مغفرت کے لیے کسی وقتِ خاص کا تعین نہیں ہے، کسی شخص کی زندگی میں بھی اس کے لیے دعاء مغفرت کی جا سکتی ہے، موت کے بعد نمازِ جنازہ سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے اور بعد میں بھی کی جا سکتی ہے بطورِ خاص بعد نمازِ جنازہ ممانعت کی کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے۔ مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:''متعدد حضرات نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ بلاشبہ دعاء میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے''۔(شرح الصدور صفحہ ۱۳۷)

رہا یہ سوال کہ آیا دعا بعد نمازِ جنازہ کے لیے کوئی دلیل مثبت بھی ہے؟ تو حدیث شریف میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے:

اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء۔

''جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو''(سنن ابی داؤد طبع مجیدی ۲/۱۰۰، سنن بیہقی طبع حیدرآباد ۴/۴۰، سنن ابن ماجہ اصح المطابع ص ۱۰۹)

اس حدیث میں نمازِ جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد دعا کا ذکر ہے کیونکہ اصولِ فقہ میں یہ طے ہے کہ ''ف'' ''تعقیب علی الفور'' کے لیے آتی ہے، یہ اس کے حقیقی معنی ہیں اور کسی عقلی، عادی یا شرعی دلیل کے بغیر حقیقی معنی سے عدول جائز نہیں ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔

امام علاؤالدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی لکھتے ہیں:

ولنا: ما روی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی جنازۃ فلما فرغ، جاء عمر و معه قوم، فأراد ان یصلی ثانیاً فقال له النبی صلی اللہ علیہ وسلم: الصلوٰۃ علی الجنازۃ لاتعاد" ولکن اُدعُ للمیت واستغفر له و هذا نص فی الباب، وروی ان ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهم فاتتهما صلوۃ علی الجنازۃ فلما حضرا ما زادا علی الاستغفار له وروی عن عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنه: انه فاتته الصلاۃ علی جنازۃ عمر رضی اللہ عنه، فلما حضر قال: ان سبقتمونی بالجنازۃ فلا تسبقونی بالدعاء له۔

''(یہ مسئلہ کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں ہے) اس میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی جب حضور جنازہ پڑھا کر فارغ ہو چکے تو اس وقت حضرت عمر کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضور نے (انہیں تکرارِ جنازہ سے روکتے ہوئے) فرمایا: نمازِ جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی لیکن میت کے لیے دعا کرو اور اس کے لیے استغفار کرو، یہ اس باب میں (کہ نمازِ جنازہ کی تکرار نہیں) نص ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایک نمازِ جنازہ نکل گئی (یعنی وہ دیر سے پہنچے) پس جب وہ میت کے پاس آئے تو صرف دعاء مغفرت پر اکتفا کی، اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام سے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ نکل گئی۔ جب وہ آئے تو انہوں نے (جنازے پر موجود حاضرین سے) کہا کہ اگر چہ تم لوگ مجھ سے نمازِ جنازہ میں پہل کر چکے ہو لیکن دعا میں مجھ سے پہل نہ کرو (یعنی دعا میں مجھے بھی شریک ہونے دو)''۔
(بدائع الصنائع جلد ۳، ص ۳۳۸ دار الکتب العلمیہ بیروت)

ان احادیثِ مبارکہ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا کا معمول تھا۔ مبسوط سرخسی میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔
''دعاء بعد الجنازہ'' کے ثبوت کا مسئلہ ہم نے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم اس کے فرض، واجب یا سنت قرار دینے کے مدعی نہیں ہیں بلکہ جواز اور استحباب کے مدعی ہیں کہ جتنے زیادہ مواقع پر اور جتنی زائد بار میت کے لیے دعا کی جائے وہ اس کے لیے مفید ہے اور خود دعا کرنے والے کے لیے بھی وسیلۂ اجر ہے، لیکن اگر کوئی شخص بطورِ خاص نمازِ جنازہ کے بعد میت کے لیے دعاء مغفرت و ایصالِ ثواب کو خلافِ سنت یا بدعت قرار دیتا ہے تو وہ عدمِ جواز کی دلیل پیش کرے۔ اصولاً بارِ ثبوت اس کے ذمے ہے کہ کہاں اور کب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس روایات و آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔
مصنف ابن ابی شیبہ جلد ثالث صفحہ ۳۳۱ پر ہے:

عن عمير بن سعيد قال صليت مع علي يزيد بن المكفف فكبر عليه اربعاثم مشى حتى اتاه وقال: اللهم عبدك و ابن عبدك نزل بك اليوم فاغفرله ذنبه و وسع عليه مدخله فانا لا نعلم منه الا خيرا وانت اعلم به

''عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کے ساتھ یزید بن مکفف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے ان پر (جنازے کی) چار تکبیرات پڑھیں، پھر چلے یہاں تک کہ میت کے قریب آ گئے اور عرض کیا: اے اللہ! (یہ) تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے آج تیرے حضور حاضر ہے تو تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما، ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو اس (کے حال) کو بہتر جانتا ہے''۔

کتاب الزکوٰۃ

زکوٰۃ

اہمیت، فضیلت، مسائل

توحید ورسالت کی شہادت اور نماز کے بعد زکوٰۃ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے۔ یہ خالص مالی عبادت ہے جو تمام انبیائے کرام اور رسلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتوں کا لازمی جز رہی ہے۔ جس طرح انسان کو جسمانی امراض اور عوارض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی اور اخلاقی امراض بھی لاحق ہوتے ہیں، ان میں بہت نمایاں اخلاقی بیماری، حبِ مال اور کثرتِ مال کی خواہش ہے، جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں تکبر، حرص، بخل، ہوس اور خودغرضی کی صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ عربی میں مال کو مال کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی طرف قلبِ انسانی بہت جلد مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (التغابن:۱۵)

''تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں''۔

ان اخلاقی امراض کے ازالے کے لئے اللہ جل شانہٗ نے عبادتِ زکوٰۃ فرض کی ہے، چنانچہ فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ

''(اے حبیب!) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوٰۃ) لیجئے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک وصاف کریں''۔ (التوبہ:۱۰۳)

دوسرے مقام پر فرمایا:

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (الیل:۱۷-۱۸)

''اور آتش دوزخ سے وہ نہایت متقی بندہ دور رکھا جائے گا، جو اپنا مال اس لئے (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس کا قلب) پاک ہو جائے۔''

زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآنی وعیدیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ

ثُمَّ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۱۸۰)

"اور جو لوگ اس مال میں، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں عطا فرمایا ہے، بخل کرتے ہیں (اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے)، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا مال ان کے حق میں خیر ہے بلکہ یہ ان کے لئے شر ہے اور عنقریب (قیامت کے دن) ان کے گلے میں بخل سے جمع کئے ہوئے مال کا طوق پہنایا جائے گا"۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (توبہ: ۳۵-۳۴)

"اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی!) انہیں اس دن کے دردناک عذاب کی وعید سنائیے جب ان کے اپنے جمع کئے ہوئے مال کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے اس مال کا انجام جسے تم نے (بے پناہ چاہت سے) جمع کیا تھا، تو اب اپنے (اُس) مال کا مزہ چکھو جو تم (دنیا میں بخل سے) جمع کیا کرتے تھے"۔

انسان کی جان و مال بلکہ ہر چیز کا مالکِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، انسان کی طرف مال و دولت اور اشیاء کی ملکیت مجازاً ہوتی ہے، انسان کو شریعت کی مقررہ حدود کے اندر اپنی جان و مال پر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ شرعی قیود مال کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر ہر جہت سے عائد ہوتی ہیں، حلال و حرام اور کسبِ مال و صرفِ مال کے شرعی احکام اسی مقصد کے لئے ہیں اور قیامت کے دن اسی کی باز پرس ہوگی۔ انسان بعض اوقات اپنی بیوی بچوں اور اہل و عیال کی جائز و ناجائز فرمائشوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر ان شرعی احکام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک دن داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے، سارا جمع شدہ مال دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مال پر وارث دادِ عیش دیتے ہیں اور حساب قبر میں مردے کو دینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (التکاثر: ۲-۱)

"تمہیں کثرت مال کی خواہش نے (آخرت کی جواب دہی سے) غافل کر دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا کر (اس کا انجام) دیکھ لوگے"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (الحشر: ۱۸)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے کیا آگے بھیجا ہے"۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ (البقرہ: ۲۵۴)

"اے ایمان والو! ہمارے دیئے گئے مال میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اس یوم (جزا) کی آمد سے قبل، جبکہ (دولت کے بل پر) نہ نیکیوں کو خریدا جا سکے گا، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی سفارش چلے گی"۔

اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم و کریم ہے کہ وہ خود اپنے بندے کو مال و دولت سے نوازتا ہے اور پھر امتحان کے طور پر اس سے فرماتا ہے:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ...... (المزمل: ۲۰)

"اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض حسن دو اور جو بھی عمل خیر تم (زکوٰۃ و صدقات کی صورت میں اپنی عاقبت کے لئے) آگے بھیجو گے، تو اسے اللہ کی بارگاہ میں (بدرجہا) بہتر اور بہت بڑے اجر کی صورت میں پاؤ گے"۔

لہٰذا قرآن مجید کی ان آیات مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ بندۂ مومن کو اپنی کمائی میں سے اپنا حصہ نکال کر اللہ تعالیٰ کی امان و حفاظت میں دینا چاہئے، امام رازی سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی چاہے کہ اس کا سارا مال اس کے ساتھ قبر میں جائے تو اس کی خواہش کی تکمیل کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے فرمایا: "وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، وہ سارا کا سارا اجرِ کثیر کی صورت میں اسے مل

جائے گا۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ ایک بار کاشانۂ نبوت میں ایک بکری ذبح کی گئی، حضور اکرم ﷺ شام کو گھر واپس تشریف لائے تو آپ نے دریافت فرمایا کچھ بچا ہے؟ گھر والوں نے عرض کیا، ایک دست بچا ہے، باقی خرچ ہوگیا، یعنی اللہ کے نام پر صدقہ کردیا ہے، آپ نے فرمایا اس طرح نہ کہو، بلکہ یوں کہو جو اللہ کے نام پر دے دیا وہ بچ گیا ہے، (یعنی آخرت کے لئے) اور جو گھر والوں کے لئے بچا ہے وہ خرچ ہوگیا ہے"۔

☆......☆......☆......☆......☆

زکوٰۃ کی تشخیص، ادائیگی اور مصارف کے پیچیدہ مسائل

زکوٰۃ کا مفہوم

لغت میں زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی، نمو، اضافہ اور برکت ہے۔ مال اور دولت سے انسان میں حرص، بخل، تکبر، تمرد اور فسق و فجور کی صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ مالی عبادات کے طور پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ انفاق فی سبیل اللہ سے ان اخلاقی امراض کا ازالہ ہو اور انسان میں قناعت، جود و سخا، انکسار اور تقویٰ و حسنِ عمل کی اعلیٰ صفات پیدا ہوں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے ان (کے قلب و ذہن) کا تزکیہ کیجئے" (سورۂ توبہ) قرآن کی رو سے زکوٰۃ ادا کر کے مالدار، مفلس و نادار پر احسان نہیں کرتا بلکہ وہ حقدار کو اس کا حق لوٹاتا ہے جو مال و دولت عطا کرنے والے ربِ کریم نے اس کے مال میں شامل کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات:۱۹)

"اور ان (مالداروں) کے مال میں سائل اور مال سے محروم لوگوں کا حق ہے"۔

گویا قرآن مجید کا پیغام یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ حق تلفی کرنے والا، ظالم اور غاصب ہے، کیونکہ وہ نادار کے حق کو لوٹانے سے عملاً منکر ہے۔

وجوبِ زکوٰۃ

مالدار پر زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط یہ ہیں: اسلام، عاقل ہونا، بالغ ہونا، نصاب شرعی کا مالک ہونا (یعنی صاحبِ نصاب ہونا) اور نصاب پر پورا ایک قمری سال گزر جانا۔

نصابِ زکوٰۃ

اس سے مراد وہ کم از کم مالیت ہے، جس کا مالک ہونے سے مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہوجاتی ہے اور

نصابِ شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مالِ تجارت جو اس کی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہو، یا 87.48 گرام سونا یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مالِ تجارت جو اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو۔ آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں تقریباً ایک اور سات کی نسبت ہے۔ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر اموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا اور کچھ چاندی اور دیگر اموال) یا صرف چاندی، تو چاندی ہی کے نصاب کا اعتبار ہوگا تاکہ ناداروں کو فائدہ ہو۔

حولانِ حول کا مفہوم

وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مال پر سال گزر جائے، اسے فقہی اصطلاح میں ''حولانِ حول'' کہتے ہیں۔ شریعت کی رو سے جس دن کوئی بالغ مسلمان مرد یا عورت زندگی میں پہلی بار مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق کم از کم نصاب کا مالک ہو جائے تو اسلامی کیلنڈر کی اسی تاریخ سے وہ ''صاحبِ نصاب'' قرار پاتا ہے۔ لیکن اس پر اسی دن سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس نصاب پر اس کی ملکیت میں پورا ایک قمری سال گزر نہ جائے، تاہم یہ امر پیشِ نظر رہے کہ سال بھر کے دوران ''صاحبِ نصاب'' کی ملکیت میں کم از کم نصاب کا رہنا ضروری ہے، ہر مال پر (خواہ وہ نقد رقم ہو یا سونا چاندی کی صورت میں ہو یا صنعت و تجارت کا مال ہو) سال گزرنا زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے لازمی نہیں ہے، اگر مال کے ہر جز پر سال گزرنے کی شرط کو لازمی قرار دیا جائے تو تاجر حضرات کے لئے زکوٰۃ کا حساب نکالنا (Assessment) تقریباً ناممکن العمل ہو جائے، کیونکہ مال کی آمد و خرچ کا سلسلہ روز جاری رہتا ہے، بلکہ تنخواہ دار آدمی بھی ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرتا ہے لہٰذا مال کے ہر حصے کی مدت الگ ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں زکوٰۃ کی تشخیص کی مقررہ تاریخ سے چند دن قبل بھی اگر مال، ''صاحبِ نصاب'' کی ملکیت میں آجائے تو اسے پہلے سے موجودہ مال میں شامل کر کے کل مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

اموالِ تجارت پر زکوٰۃ

مسلمان تاجر کی ملکیت میں جو بھی مال ہے، یعنی نقد رقم، بینک اکاؤنٹ، بانڈز، ڈیپازٹس، سونا چاندی اور مالِ تجارت وغیرہ، سب کی مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی غرض سے سونا

چاندی اور مالِ تجارت کی وہ قیمت معتبر ہے جو وجوبِ زکوٰۃ کے وقت ہوگی، یعنی قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان تاجر کو وجوبِ زکوٰۃ کی مقررہ تاریخ پر اپنے مالِ تجارت کی محتاط اسٹاک چیکنگ اور قدر (Valuation) یعنی صحیح قیمت کا تعین کرنا چاہئے۔

صنعت کاروں کی تشخیص

وہ کارخانہ جو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال ہو رہا ہے، اس کی زمین، عمارت، متعلقہ تنصیبات اور مشینری کی قیمت پر جو صنعتی پیداواری مقاصد میں استعمال ہو رہی ہے، زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ البتہ مسلمان صنعت کار کو اپنے دیگر تمام اموال کے ساتھ کارخانے میں موجود خام مال تیار مال اور مارکیٹ میں کریڈٹ پر دیئے ہوئے تمام مال کی بھی زکوٰۃ کرنی ہوگی۔

تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ

تاجر حضرات کا اکثر مارکیٹ میں لین دین جاری رہتا ہے، کسی سے کچھ لینا ہے اور کسی کو کچھ دینا ہے، تجارت سے ہٹ کر بعض اوقات لوگوں کا شخصی لین دین بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا تشخیص زکوٰۃ کے وقت واجب الوصول رقم کو اپنی مالیت میں جمع کر کے اس سے واجب الادا رقم کو منہا کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو مجموعی مالیت بنے گی اس پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

طویل میعادی قرض اور صنعتی قرض کا مسئلہ

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا قرض، بعض صنعتی اور تجارتی قرضوں کی ادائیگی فی الفور لازم نہیں ہوتی بلکہ وہ پانچ، دس، پندرہ سال یا اس سے بھی زائد مدت پر محیط ہوتے ہیں، ماہانہ یا سالانہ اقساط واجب الادا ہوتی ہیں۔ فوری ادائیگی کا نہ قرض خواہ مطالبہ کرتا ہے اور نہ مقروض فرد فوری طور پر قرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں رقم ہونے کے باوجود مقررہ اقساط سے زیادہ ادا نہیں کرتا، ورنہ یہ سوال زیرِ بحث آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے قرضوں کے بارے میں ہمارے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ یہ وجوبِ زکوٰۃ اور ادائیگی میں مانع نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثال فقہاء نے بیوی کے مہرِ مؤجل کی دی ہے کہ بیوی مطالبہ نہیں کرتی اور شوہر کا عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سرِ دست ادا نہیں کرنا چاہتا، لہٰذا شوہر تشخیص زکوٰۃ کے وقت ایسے دین مہر کو اپنی کل مالیت سے منہا نہ کرے۔ میعادی قرضوں کی نوعیت

بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح طویل المدتی صنعتی قرضوں کا معاملہ ہے، ایک طرف تو ان قرضوں کے مقابل اتنی یا اس سے زیادہ مالیت کے اثاثے موجود ہوتے ہیں، صنعت بیمار قرار پاتی ہے۔ لیکن صنعت کار کی مالی صحت پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس کے بنگلے، ذاتی اثاثے، جائیدادیں، کاریں، غیر ملکی مہنگے سفر پوری شان کے ساتھ قائم ودائم رہتے ہیں۔ ان کے اور ان کے اہل وعیال کی بودوباش اور رہن سہن انتہائی تمول کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ کچھ ہمارے ملکی قوانین، انکم ٹیکس وغیرہ کے پیچیدہ قوانین، بیوروکریسی کے بے کراں صوابدیدی اور انضباطی اختیارات، ایسی وجوہ ہیں کہ کالے دھن اور سفید دھن کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو پایا۔ ہمارے اہل ثروت اور صنعت کاروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معاملہ شفاف رکھنا چاہئے اور طویل المدتی قرضوں کو منہا کئے بغیر اپنی پوری مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے تا کہ کل قیامت کے دن اپنے ہی جمع کردہ مال سے نہ داغے جائیں۔

مکان، دکان، فلیٹس اور پلاٹوں پر زکوٰۃ

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لئے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مکان، یا پلاٹ یا دکانیں، فلیٹس جو کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی وضعِ مصارف کے بعد مالکِ جائیداد کی مجموعی سالانہ آمدنی میں جمع ہوگی اور تمام ذرائع آمدن سے سال کے اختتام پر جو رقم پس انداز ہوگی، اس سب پر زکوٰۃ ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹس، دکانیں یا فلیٹس جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لئے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے، اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ بطور انویسٹمنٹ پلاٹس اور جائیدادیں خریدنے والوں کے لئے یہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔ کرائے پر دیئے ہوئے مکان، دکان، فلیٹس وغیرہ کے ڈیپازٹ کی جو رقم جائیداد کے مالک کے پاس بطور زرِ ضمانت جمع ہے، اس کی زکوٰۃ رقم کا اصل مالک (کرایہ دار) ادا کرے گا، اسی طرح تاجر حضرات اور ایجنسی ہولڈرز کی جو رقوم بطور ضمانت (Sccurity Depositis) کسی ادارے یا فرم کے پاس جمع ہیں اور قابلِ واپسی ہیں، اس رقم کی زکوٰۃ بھی اصل مالک یعنی (Depositer) کو ادا کرنی ہوگی۔

اگر صاحبِ نصاب کے قرض کی رقم پھنسی ہوئی ہے اور مقروض نادہندہ ہے لیکن اس کی واپسی کی آس قائم ہے تو اس کی زکوٰۃ دے دینی چاہئے، اگر نہ دی تو ملنے پر گزشتہ ساری مدت کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ البتہ قرض کی ڈوبی ہوئی رقم کی زکوٰۃ اگر نہ دی تو وہ جواب دِہ نہیں ہوگا۔

استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ

سونا اور چاندی از روئے شریعت خلقی طور پر (In Born) مال ہیں، لہٰذا یہ کسی بھی ہیئت (Form,Shape) میں ہوں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً برتن، مالیاتی سکے (Coins) سونے یا چاندی کی ڈلی (GoldBullion) استعمال کے زیورات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن (Grasping) تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا: نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعیدِ عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں، (سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی)"۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کے "اوضاح" (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی، میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی اس کنز میں شامل ہے (جس پر سورۃ توبہ آیت: ۳۴۔۳۵ میں عذابِ جہنم کی وعید آئی ہے)؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جو سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو ان پر کنز کا اطلاق نہیں ہوتا"۔

(سنن ابی داؤد، مؤطا امام مالک)

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر سونا یا چاندی مخلوط (Mixed) ہو اور کسی اور چیز کی ملاوٹ اس میں ہو تو غالب جز کا اعتبار

ہوگا، یعنی اگر شے مخلوط میں غالب مقدار سونا ہے تو اسے سونا قرار دے کر ان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ورنہ نہیں، البتہ ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھر مثلاً زمرد، عقیق، یاقوت وغیرہ اگر تجارت کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ ہے، ذاتی استعمال میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ

اگر صاحب نصاب نے اپنے بالغ بیٹوں یا بیٹیوں کی شادی کے لئے زیورات بنوا کر رکھے ہوئے ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے اولاد کو اس کا مالک بنادیا ہے، دوسری یہ کہ بدستور اس کی ملک میں ہیں، جو بھی صورت ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

اگر کسی نے حج کے لئے رقم جمع کر رکھی ہے اور نیت یہ ہے کہ اس رقم کو حج پر صرف کرے گا تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر حکومت کے پاس اس مد میں جمع کرادیئے ہیں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

پھنسا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا

اگر مقروض نادہندہ اور نادار ہے تب بھی پھنسی ہوئی رقم کے لئے یہ نیت کر لینا کہ وہ زکوٰۃ میں عنداللہ محسوب ہوجائے، ایسی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ ابتداءً نادار کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہ کی جائے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب اسے زکوٰۃ کی رقم دے دے اور مقروض اس رقم کا مالک بن کر ادائے قرض میں اسے واپس کردے، یہ شرعاً جائز ہے لیکن یہ آزادانہ تصرف ہوگا، زکوٰۃ دیتے وقت یہ شرط عائد نہیں کی جاسکتی۔ نیز فقہائے کرام نے ادائے زکوٰۃ میں اس امر کو مستحسن قرار دیا ہے کہ زیادہ فقراء کو فائدہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا کسی ایک مستحق کو زکوٰۃ کی بھاری رقم دے دینا جائز تو ہے لیکن شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔

زکوٰۃ کہاں صَرف کی جائے؟

امام بخاری نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''زکوٰۃ ان (مسلمانوں) کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دی جائے۔'' اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مال زکوٰۃ کو خرچ کرنے میں افضل یہ ہے کہ جس مقام

پر زکوٰۃ وصول کی جائے، وہیں کے فقراء اور ناداروں پر صَرف کی جائے، البتہ مندرجہ ذیل صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: (۱) یہ کہ اس مقام پر کوئی مستحق نہ ہو جیسے امریکا، یورپ یا بعض متمول مسلم ممالک میں ایسا ممکن ہے (۲) یا زکوٰۃ ادا کرنے والے کے مستحق قریبی رشتہ دار کسی دوسرے مقام پر رہتے ہوں۔ (۳) یا کسی جگہ کے مسلمان بہت زیادہ نادار اور ضرورت مند ہوں تو ان صورتوں میں دوسرے مقامات پر بھی زکوٰۃ کی رقوم بھیجی جاسکتی ہیں لیکن مقامی مستحقین کو بالکل نظر انداز کر کے دوسرے مقامات پر زکوٰۃ کی رقوم بھیجنا شرعاً قابل ترجیح اور پسندیدہ امر نہیں ہے، اگرچہ ایسا کرنے سے اصولی طور پر زکوٰۃ ادا ہوجائے گی۔

زکوٰۃ کا سب سے اہم شعبہ

قرآن نے فرضیتِ زکوٰۃ کو تو وضاحت کے ساتھ متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، لیکن نصابِ زکوٰۃ، شرائطِ وجوبِ زکوٰۃ اور شرحِ زکوٰۃ کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں، البتہ جس شعبۂ زکوٰۃ کو قرآن نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ مصارفِ زکوٰۃ کا شعبہ ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ آیت: ۶۰ میں ان آٹھ مصارف کی تصریح کردی گئی ہے جن پر زکوٰۃ صَرف کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملینِ زکوٰۃ (۴) مؤلفۃ القلوب (۵) جن کو طوق غلامی سے آزاد کرنا مقصود ہو (۶) جو بارِ قرض تلے دبے ہوئے ہوں یا ان پر کوئی تاوان آپڑا ہو (۷) جنہوں نے کل وقتی اپنے آپ کو دین کی نصرت و حفاظت کے لئے وقف کر رکھا ہو (۸) ایسے مسافر جن کا گھر سے رابطہ منقطع ہوچکا ہو۔

سنن ابوداؤد کی ایک طویل حدیث میں زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمائیے! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو کسی نبی یا غیر نبی کی مرضی پر نہیں چھوڑا بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کی آٹھ اقسام بیان کی ہیں، اگر تم ان میں سے کسی قسم کے تحت حقدار بنتے ہو تو میں زکوٰۃ میں سے تم کو دے دوں گا (ورنہ نہیں)۔ لہٰذا زکوٰۃ نکالنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مستحقین تک پہنچانا اور جائز شرعی مصارف پر صَرف کرنا بھی لازم ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں جمع وصرفِ زکوٰۃ کی بعض صورتیں رائج ہیں جو

شرعاً درست نہیں ہیں۔

مدارس تعلیم القرآن

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتب تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس و مکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس و مکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فدیہ، فدیۂ صوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔ البتہ وہ دینی مدارس و جامعات جن میں مستحق اقامتی طلبا دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ و صدقات واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔

کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ

بعض کمیونٹیز، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونٹی یا برادری کے افراد کے لئے رفاہی فنڈ قائم کر رکھے ہیں، فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ کی صورت میں، اس فنڈ میں زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی وغیرہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ اس فنڈ سے برادری یا کمیونٹی کے افراد کو آسان شرائط پر قرض دیئے جاتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت مستحقِ زکوٰۃ کے شرعی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، یہ طریقہ کار شرعاً درست نہیں ہے۔ اول تو زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ فطرہ و زکوٰۃ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق فرد کو ادا نہیں کی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا مقاصد بلاشبہ لائق تحسین ہیں، لیکن ان کے لئے صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ وغیرہ سے الگ نفلی صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی عمومی رقوم اور عطیات وغیرہ پر مشتمل ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کرنا چاہئے۔ جس کے صَرف پر زکوٰۃ، فطرہ والی پابندیاں عائد نہیں ہوں گی۔

مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا

مساجد کی تعمیر اور مصارفِ جاریہ پر زکوٰۃ و فطرہ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ ان مقاصد کے لئے حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشائے شریعت کو

باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۲۶ پر لکھتے ہیں:

کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

(۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود، رشوت، پگڑی وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔

(۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو حیلہ مستحب یا واجب ہے۔

(۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے۔

(۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حدودِ شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

(۱) جو دوا نادار مستحق زکوٰۃ کی ملک میں دے دی جائے گی وہ جائز ہے۔

(۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکسرے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبہ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے۔

(۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقاتِ واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے، غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ''ویلفیئر فنڈ'' قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو۔

(۴) چند سال پیشتر جب مرکزی زکوٰۃ کونسل کے ایک رکن نے ایک رفاہی ادارے کا معائنہ کیا تھا تو انہوں نے زکوٰۃ کے حوالے سے بہت سے ناقص پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی تھی۔

جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت

کالجوں اور جامعات میں زیر تعلیم مستحق طلبہ کی اعانت کی جاسکتی ہے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں زکوٰۃ کی مد سے براہِ راست رقم دی جائے اور وہ متعلقہ ادارے کی فیس خود ادا کریں۔ انہیں ذاتی استعمال کے لئے بطورِ ملکیت کتابیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ البتہ زکوٰۃ کی رقم سے لیبارٹری

کے آلات، کمپیوٹرز، لائبریری کے لئے کتب نہیں خریدی جاسکتیں کیونکہ زکوٰۃ محض کسی چیز کو مباح قرار دینے یا اس پر تصرف کا موقع دینے سے ادا نہیں ہوتی۔ البتہ جس طالب علم کی اعانت مالِ زکوٰۃ سے کی گئی ہو اس سے ان اشیاء یا لائبریریز، لیبارٹری، ہاسٹل وغیرہ کے استعمال کی فیس وصول کی جاسکتی ہے۔

محض رقم الگ کردینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

محض اپنے پاس سے زکوٰۃ کی نیت سے رقم الگ کرکے رکھ لینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ مستحقین تک پہنچا نہ دی جائے، لہٰذا اگر زکوٰۃ کی نیت سے رقم اپنے پاس الگ کرکے رکھ دی ہو اور خدانخواستہ وہ تلف ہوجائے یا چوری ہوجائے تو زکوٰۃ اب بھی ادا کرنا لازم ہے، اس طرح وہ بری الذمہ نہیں ہوگا۔

دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی

اگر دورانِ سال کوئی صاحبِ نصاب تھوڑی تھوڑی رقم وقتاً فوقتاً زکوٰۃ کی نیت سے مستحقین کو ادا کرتا رہا ہے تو سال کے اختتام پر، تشخیص زکوٰۃ کے بعد پہلے سے ادا شدہ رقم کو وضع کرکے باقی رقم ادا کرے، اسی طرح مجموعی واجب الاداز کوٰۃ کی رقم بالاقساط بھی ادا کرسکتا ہے۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرضِ حسن

حال ہی میں ہمارے پاس ایک سے زیادہ استفسار آئے ہیں کہ بعض برادریوں (Communities) کی فلاحی انجمنیں (Welfare Associations) ہیں، وہ برادریوں کے اہلِ ثروت افراد سے زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ کی رقم جمع کرکے اس میں سے برادری کے نادار اور مستحق افراد کی مدد کرتے ہیں، یہ ایک مستحسن امر ہے اور شرعاً درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ اس زکوٰۃ فنڈ سے ضرورت مند افراد کو قرضِ حسن کے طور دیتے ہیں اور پھر ان سے آسان اقساط میں وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا جاری (Regenerating) فنڈ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، زکوٰۃ کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنادیں اور ان کو اختیار ہو کہ اپنی آزادانہ مرضی سے جیسے چاہیں تصرف کریں، انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران صرف زکوٰۃ کے لئے اہلِ ثروت کے

وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ ایسی انجمنوں کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ صدقاتِ واجبہ (زکوٰۃ، فدیہ، فطرہ، نذر اور کفارہ کی رقوم) سے الگ عطیات اور نفلی صدقہ و خیرات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں جس سے ضرورت مندوں کو بلاسود قرضے جاری کریں اور ادائیگی کے لئے انہیں حسبِ حال رعایت دیں اور اگر کوئی نادار قرض کی واپسی کے قابل نہ ہو تو اسے معاف کردیں۔ یہ اپنی جگہ ایک بہت بڑی نیکی اور اجر کا کام ہے۔

زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ

بعض انجمنیں زکوٰۃ کی رقوم کو قومی بچت کی اسکیموں میں لگا کر سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور ان سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس سے ناداروں کی اعانت کرتی ہیں، یہ عمل بھی شرعاً ناجائز ہے، اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوتی اور سود لینے کا وبال الگ ہے، ایسے لوگ گنہگار ہیں، اگر زکوٰۃ دینے والوں کی منشا بھی اس میں شامل ہے تو وہ بھی گنہگار ہوں گے اور ان کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی۔

اپنے اصول وفروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی۔ یہی حکم صدقۂ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

ہر فرد مسئول ہے

اسلامی عبادات خواہ بدنی ہوں (جیسے نماز اور حج وغیرہ) یا مالی (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ) ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرداً فرداً عائد ہوتی ہیں۔ خاندان پر بحیثیتِ مجموعی عائد نہیں ہوتیں۔ لہٰذا والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی میں سے جو بھی ''صاحبِ نصاب'' ہوگا، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور اسے اپنے مال میں سے ادا کرنی ہوگی۔ ہاں البتہ اگر شوہر بیوی کی طرف سے یا

اولاد والدین کی طرف سے ان کی مرضی اور اجازت سے زکوٰۃ ادا کریں تو ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرح سونا، چاندی، نقد رقوم، شیئرز، بینک ڈیپازٹس، بانڈز، اموالِ تجارت وغیرہ پر ڈھائی فیصد ہے، جو فرض کے درجے میں ہے، مطلوب کامل اور آئیڈیل نہیں ہے۔ آئیڈیل تو یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی حلال اور طیب مال میں سے بھی ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ ضرورت مند، قرابت داروں کی اعانت کرے۔ صدقاتِ نافلہ، عطیات اور صدقاتِ جاریہ کے کاموں میں صَرف کرے، دولت کا بندہ بن کر نہ رہ جائے، دولت کو اللہ کی بندگی میں خرچ کرے۔

تنگیٔ رزق، بارِ قرض سے سبکدوش ہونے کا وظیفہ

سوال: آج کل میں معاش اور روزگار کی تنگی کا شکار ہوں، قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں اور ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، کوئی ایسا وظیفہ بتائیے جس کی برکت سے بارِ قرض سے نجات مل جائے اور رزق میں کشادگی آئے۔ (عبدالرحمٰن، کیماڑی، کراچی)

جواب: امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے کہ قرض اور تنگیٔ رزق سے نجات کے لیے مندرجہ ذیل وظیفہ پڑھیں، ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ اور صبح و شام سو سو بار، اول و آخر درود شریف پڑھیں، لکھتے ہیں: ''اس دعا کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تجھ پر مثلِ پہاڑ کے بھی قرض ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کے اسباب پیدا فرما دے گا۔ دعا کے کلماتِ مبارکہ یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَ اَغْنِنِیْ بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ۔

''اے اللہ! مجھے حلال رزق اس قدر عطا فرما کہ حرام کی حاجت ہی نہ رہے اور اپنے فضل و کرم سے اتنا عطا فرما کہ غیر کا احتیاج نہ رہے''۔

اسی طرح آپ سے پوچھا گیا کہ آمدنی کی قلت ہے اور اہل و عیال کی کثرت سے سخت دشواری ہے، آپ نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشاء قبلہ رو ہو کر باوضو، ننگے سر ایسی جگہ کہ جہاں سر اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، یہاں تک کہ سر پر ٹوپی بھی نہ ہو، روزانہ پانچ سو بار

''یَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ'' پڑھے اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے۔

(نوٹ: خواتین سر ڈھانپ کر ایسی جگہ بیٹھ کر پڑھیں جہاں پردے کا بھی اہتمام ہو) ان وظائف کے ساتھ حسبِ توفیق و استطاعت جدوجہد اور سعی و عمل میں بھی مشغول رہیں، ان شاء اللہ العزیز مشکل سے نجات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور مقدر ہوگی۔

شوہر مقروض ہو اور بیوی کے پاس سونا ہو

سوال: میں بچوں کی شادی پر دو لاکھ کا مقروض ہوں، میری بیوی کے پاس اگر مقدارِ نصاب یا اس سے زیادہ سونا ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کس کے ذمے ہے؟ (شاہ نواز بنگش۔ پی این ایس بہادر)

جواب: شرعاً ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت اپنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہیں، احکامِ شرعیہ میں خاندان بطور ایک یونٹ کے نہیں ہوتا بلکہ ہر ہر فرد اپنی اپنی ذات کے لئے مسئول ہوتا ہے۔ آپ مقروض ہیں تو آپ پر زکوٰۃ نہیں۔ آپ کی بیوی کے پاس بقدرِ نصاب، یعنی ساڑھے سات تولے (۸۷،۴۸ گرام) یا اس سے زائد سونا موجود ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اگر نقد رقم ادائیگیِ زکوٰۃ کے لئے نہیں ہے تو اسی سونے کا چالیسواں یعنی (۲ ۱/۲) ڈھائی فیصد وزن کاٹ کر دے۔

زکوٰۃ کا نصاب

سوال: سونے کے لئے زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟
(غازی خان شارع فیصل۔ ہلال احمد۔ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی)

جواب: سونے کیلئے زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولے یعنی ۸۷،۴۸ گرام ہے، بشرطیکہ صرف سونا ہو اور کوئی دوسرا مال چاندی یا نقد رقم یا مالِ تجارت ملکیت میں نہ ہو، اگر اموال متفرق ہوں تو پھر چاندی کا نصاب معتبر ہوگا۔ یعنی ساڑھے باون تولے یا ۶۱۲،۳۶ گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت بازاری قیمت۔

زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر دی جائے

سوال: زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر ادا کی جائے، حکومتی بچت اسکیموں میں جمع رقم کا منافع ششماہی ملتا ہے، زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟ اگر اصل رقم پر ہی گزر اوقات ہے تو کیا پھر بھی اس پر زکوٰۃ

ہے، متفرق مال پر کس طرح زکوٰۃ دی جائے، کاروباری منافع پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟
(ہلال احمد۔سوسائٹی)

جواب: بینک یا حکومت کی بچت اسکیموں میں جمع اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، بینک انٹرسٹ تو سود ہے، جو شرعاً حرام ہے اور زکوٰۃ تو طیب مال پر واجب ہے، کاروباری منافع جائز ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہے، تاریخ تشخیص زکوٰۃ پر مختلف مدات میں جتنا بھی مال ہو، مثلاً تنخواہ کی آمدنی (اگر ہے)، کرائے کی آمدنی (اگر ہے)، مالِ تجارت (اگر ہے)، بینک یا اسکیموں میں جمع شدہ اصل رقوم، کاروبار میں لگا ہوا مال مع منافع، کسی پر قرض ہے تو، اور زیورات وغیرہ، الغرض تمام ذرائع سے جو مال سال کے آخر میں بچ جاتا ہے اور جمع رہتا ہے، اس سب پر زکوٰۃ ہے ڈھائی فیصد کی شرح سے۔ کل مالیت کو چالیس پر تقسیم کردیں زکوٰۃ نکل آئے گی۔

بیٹی کی زکوٰۃ کی رقم سے انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرنا

سوال: میری بیٹی انگلینڈ میں رہتی ہے، وہ زکوٰۃ کی رقم بھیجتی ہے، جسے میں اپنے نام سے جمع کرادیتا ہوں، پھر زکوٰۃ دے کر اپنے نام سے رسید بنوالیتا ہوں اور اس کی بناء پر انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرتا ہوں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (زاہد عثمانی۔ناظم آباد)۔

جواب: آپ کی بیٹی کا آپ کو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے وکیل بنانا درست ہے۔لیکن آپ کا اس رقمِ زکوٰۃ کو اپنی زکوٰۃ دکھا کر اس کے ذریعے انکم ٹیکس سے REBATE یعنی چھوٹ لینا درست نہیں ہے، یہ غلط بیانی ہے اور اسلام میں جائز نہیں ہے، کیونکہ اس REBATE کا استحقاق آپ کو تب حاصل ہوتا ہے جب آپ نے اپنی زکوٰۃ ادا کی ہو نہ کہ کسی اور کی، خواہ بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

بنو ہاشم کے لئے بنو ہاشم کی زکوٰۃ

سوال: ہمارا تعلق بنو ہاشم سے ہے یعنی ہم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد ہیں، کیا ہم اپنی زکوٰۃ اپنے نادار رشتہ داروں کو دے سکتے ہیں، (نیاز الدین عباسی، گلشن اقبال)

جواب: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں ہے''۔ائمہ اربعہ کے نزدیک بنو ہاشم کے لئے زکوٰۃ جائز نہیں ہے۔بنو ہاشم میں آلِ علی، آلِ عباس، آلِ جعفر، آلِ عقیل اور آلِ حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔بنو ہاشم کی اپنی زکوٰۃ بھی بنو ہاشم کے لئے جائز

نہیں ہے۔تاہم جو سادات یا بنی ہاشم ضرورت مند ہوں بنو ہاشم اور غیر بنو ہاشم سب کو چاہئے کہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کو ہدیہ اور نفلی صدقہ دیں اور رسول اللہ ﷺ سے نسبی قرابت کی وجہ سے ان کا احترام کریں اور حبِ رسول کا ثبوت دیں۔

سید کی غیر سیدہ بیوی کو زکوٰۃ دینا

سوال: اگر شوہر سید ہو اور اس کی بیوی غیر سیدہ، تو کیا بیوی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟
(نسیم عبداللہ۔ڈیفنس)

جواب: جی ہاں دی جاسکتی ہے، اس کے بعد وہ اس مال کی مالک ہے جیسے چاہے خرچ کرے۔

بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ

سوال: بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہے، (محمد نواز۔بزنس ایونیو)

جواب: شرعاً ہر عاقل و بالغ مرد و عورت اپنے اپنے دینی فرائض (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ) کے لئے جوابدہ ہے۔بیوی شوہر کو اور بہو سسر کو اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وکیل بنا سکتی ہیں، یا وہ خود ان کی اجازت سے ادا کرسکتے ہیں۔

بہن کو زکوٰۃ دینا

سوال: میری بہن کے شوہر معذور ہیں، ان کا ذاتی مکان بھی نہیں ہے، تو کیا انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ (نوید احمد۔ناظم آباد)۔

جواب: اگر شرعاً بہن یا بہنوئی مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں تو انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

کیا دو سال کی زکوٰۃ اکٹھے دی جاسکتی ہے

سوال: کیا دو سالوں کی زکوٰۃ اکٹھی کرکے ایک صاحب کو دی جاسکتی ہے؟
(نوید احمد، ناظم آباد)

جواب: دینی فریضے کا بروقت ادا کرنا افضل ہے، تاہم اگر گزشتہ سال کی زکوٰۃ کسی کے ذمے باقی ہے تو اسے رواں سال کی زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر دیا جاسکتا ہے، کسی ایک فرد کو زکوٰۃ کی بڑی رقم

دینا اگرچہ مستحسن نہیں ہے لیکن دینے سے ادا ہوجائے گی۔

صدقات کے فنڈ سے قرضِ حسن

سوال: پاکستان بھر میں ایک برادری جو اپنی برادری کے غریب، نادار، بے سہارا، بیوہ، یتیم اور بیماروں کی فلاح و بہبود کے لیے برادری کے مخیّر حضرات سے زکوٰۃ، خیرات، صدقات، قربانی کی کھالیں ونقد عطیات وصول کرتی ہے اور شعبۂ امداد کے ذریعے برادری کے لوگوں کی مالی مدد کرتی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کریں کہ اس فنڈ (شعبۂ امداد) سے برادری کے کسی شخص کو قرضِ حسن دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرکے اپنی آمدنی بڑھا سکے اور اپنے خاندان کی کفالت آسانی سے کرسکے اور ماہانہ ادائیگی کرتا رہے۔ (محمد یاسین ملک، کراچی)

جواب: صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک صدقاتِ واجبہ ہیں، جیسے زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفارات اور فدیہ کی رقوم، ان کے آٹھ مصارف اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ آیت نمبر ۶۰ میں متعین کرکے بتا دیے ہیں، لہٰذا یہ رقوم مالکانہ بنیاد پر ان مستحقین کو دے دی جائیں اگر برادری کے اندر ایسے مستحقین موجود ہوں تو انہیں دیں، ورنہ صدقات دینے والوں کی اجازت سے برادری سے باہر کے ضرورتمندوں اور ناداروں کی مدد کریں، ان صدقاتِ واجبہ کا کھاتہ (Head of Account) اور مصارف کا ریکارڈ الگ ہونا چاہئے۔ دوسری قسم کے صدقات نفلی ہیں جن میں عام خیرات کی رقم اور عطیات شامل ہیں، ان میں سے "قرضِ حسنہ" کا شعبہ قائم کرسکتے ہیں، بشرطیکہ عطیہ وخیرات دینے والے اس کی اجازت دیں۔

زیورات پر زکوٰۃ جبکہ نقد رقم نہ ہو

سوال: ہماری مالی حیثیت کمزور ہے، ہم پر زیورات کی ڈھائی ہزار روپے زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے، جو ہم سال بھر تھوڑا تھوڑا کرکے بھی بمشکل ادا کرپاتے ہیں کہ نئے سال کی زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔ اب بتائیں کہ اس حال میں ہمارا مال اور کھانا پینا حرام ہے؟ نیز یہ کہ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ (م۔الف۔ع، کراچی)

جواب: سونا یا چاندی زیورات کی شکل یا کسی بھی شکل میں اگر بقدرِ نصاب ہے تو اس پر زکوٰۃ بہرحال فرض ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رو سے آپ زکوٰۃ ادا کررہے ہیں،

اگرچہ اقساط میں اور قدرے تاخیر سے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں شریعت نے یہ رخصت رکھی ہے کہ وقت سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اقساط میں بھی ادا کی جاسکتی ہے اور یکمشت بھی ادا کی جاسکتی ہے، بروقت ادا کرنا افضل ہے کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کا دن زندگی میں آئے گا یا نہیں آئے گا۔ تاہم وقتِ وجوب کے بعد کی ادا کردہ زکوٰۃ بھی عنداللہ ادا ہی شمار ہوتی ہے۔ زکوٰۃ میں قضاء کا تصور نہیں ہے۔ لہٰذا آپ کا مال اور کھانا پینا حلال ہے، متفکر نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ سے رزق کی کشادگی اور وسعت کے لئے دعاء کرتے رہیں اور مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد اول وآخر درود شریف پڑھ کر یہ دعاء قرآنی پڑھیں:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

(الطلاق: ۳-۲)

"اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے مشکل اور تنگی سے نکلنے کی راہ نجات مقدر فرما دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرما دیتا ہے جو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتی"۔

اور سو بار "یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَاب" پڑھا کریں۔

سونا اور چاندی جب کم از کم مقدارِ نصاب کی مالیت کی ہیں ان پر زکوٰۃ فرض ہے اگر نقد رقم نہیں تو اس میں سے چالیسواں حصہ نکال کر دینا ہوگا۔ باقی شریعت نے زکوٰۃ "مالِ نامی" پر فرض کی ہے، یعنی ایسا مال جس میں اگر انسان کاروبار وغیرہ کے ذریعے چاہے تو نمو کی صلاحیت موجود ہے ورنہ خانہ داری کے سامان، سواری کی چیز یا آلاتِ کسب پر زکوٰۃ نہیں ہے نہ ہی مکان کی مالیت پر زکوٰۃ ہے۔

اگر عید الفطر کے دن صدقۂ فطر نہ ادا کرسکا ہو تو؟

سوال: میری آمدنی بہت کم ہے اور گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو میرے پاس ضرورت سے زائد اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا فطرہ ادا کرسکتا، کیا اب مجھ پر اس کی قضاء واجب ہے اور مجھے بعد میں ادا کرنا ضروری ہے،

(عبداللہ۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: یکم شوال المکرم یعنی عید الفطر کو، جن صاحب کی مِلک میں ضرورت سے زائد بقدرِ

نصابِ زکوٰۃ فاضل رقم موجود ہو، ان پر اپنے اور اپنے زیرِ کفالت افراد کا فطرہ ادا کرنا واجب ہے۔ فطرے کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر ''صاحبِ نصاب'' رہنا شرط نہیں ہے، یہی صورتِ حال قربانی کے وجوب کی ہے، جبکہ اس کے برعکس ''فرضیتِ زکوٰۃ'' کے لئے سال بھر ''صاحبِ نصاب'' رہنا شرط ہے۔ اگر آپ کے پاس عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم نصاب زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں تھی، تو آپ پر صدقہءِ فطر واجب ہی نہیں ہوا، لہٰذا اس کی کوئی قضاء بھی آپ کے ذمے نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ اس دن ''صاحبِ نصاب'' ہوتے اور فطرہ ادا نہ کیا ہوتا تو جب تک آپ ادا نہ کرتے آپ سے اس کا وجوب ساقط نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے دین میں آسانی رکھی ہے اور بندے کو کسی ایسی جسمانی یا مالی ذمہ داری کے لئے مکلّف (جوابدہ) نہیں ٹھہرایا، جس کا ادا کرنا اس کے بس میں نہ ہو۔

☆***☆***☆***☆***☆

کتاب الصوم

تراویح کی رکعات کتنی ہیں؟

سوال: تراویح کی رکعات آٹھ ہیں یا بیس، دلائل سے بتائیں۔؟ (مہر۔ بلوچ کالونی)

جواب: جہاں تک آٹھ رکعات کا حضور ﷺ سے بطور تراویح ثابت کرنے کا دعویٰ ہے، یہ باطل ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ''اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز (تہجد) رمضان وغیر رمضان میں تیرہ رکعات ہوتی تھیں''۔ اس سے معلوم ہوا کہ گیارہ، تیرہ اور پندرہ رکعات مع وتر کے بارے میں جو احادیث ہیں وہ تہجد پر محمول ہیں، جو رمضان وغیر رمضان دونوں کے بارے میں ہیں، ان سے تراویح کا ثبوت درست نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات پر اجماع ہے کہ تراویح کی رکعات کی تعداد بیس ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور مؤطا امام مالک کی روایات میں مع وتر ۲۳ رکعات کا ثبوت موجود ہے، اسی طرح سنن کبریٰ للبیہقی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ میں متعدد روایات ۲۰ تراویح کے ثبوت میں موجود ہیں۔ حافظ ابوبکر کی السنن الکبریٰ اور سنن ترمذی میں بھی ۲۰ رکعات تراویح کا ثبوت موجود ہے۔

کیا تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہیں

سوال: کیا نماز تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہے؟ (مسز سرور مظہر۔ ڈیفنس فیز II)

جواب: جی ہاں پڑھی جاسکتی ہے، لیکن کھڑے ہو کر پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھی جائے تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

چار چار رکعات کی نیت کے ساتھ 'تراویح' پڑھنا

سوال: کیا تراویح کی نماز دو دو رکعت پڑھنے کے بجائے ایک نیت کے ساتھ چار چار رکعات کر کے پڑھی جاسکتی ہیں۔ (نسیم عبداللہ۔ ڈیفنس)

جواب: جی ہاں، پڑھی جاسکتی ہیں، البتہ دوگانہ کر کے پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔

پانچ روزہ تراویح

سوال: آج کل یہ عام رواج ہے کہ لوگ پانچ روزہ، چھ روزہ اور دس روزہ تراویح و ختمِ قرآن کا اہتمام کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے"۔ (محمد شریف، گلشن اقبال، حمید قریشی۔ گلشن اقبال)

جواب: اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ بیرون مسجد، پارکس، مکانات وغیرہ میں جو جماعت کا اہتمام ہوتا ہے، اس میں نماز باجماعت تو یقیناً ادا ہوگی لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔ اگر پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح و ختمِ قرآن سے لوگ یہ سمجھ لیں کہ بس ایک قرآن ختم ہوگیا، اب تراویح سے بھی فارغ، تو یہ طرزِ عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہِ رمضان کی سنت ہے، لہٰذا جن لوگوں کا ختم قرآن ستائیسویں کو ہوتا ہے، ان کو بھی چاہئے کہ بقیہ دنوں کی تراویح باقاعدگی سے پڑھیں۔

روزے کی حالت میں سر پر مہندی اور خوشبو لگانا

سوال: کیا روزے کے دوران سر پر تیل، مہندی یا خوشبو لگانا جائز ہے؟ (شازیہ۔ جمشید روڈ)

جواب: جی ہاں لگا سکتے ہیں، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مسنون دعاءِ افطار کب پڑھی جائے؟

سوال: عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ افطار کے وقت پہلے مسنون دعاء افطار پڑھتے ہیں، پھر افطار کرتے ہیں، جبکہ کھانے کی دعاء کھانے کے بعد پڑھی جاتی ہے، از راہِ کرم بتایئے کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟ (محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال...... محمد اعظم۔ مظفر آباد، آزاد کشمیر)

جواب: "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب روزہ کھول لیتے تو فرماتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہوگئیں، اور انشاء اللہ اجر ثابت ہوگیا ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)۔" دوسری حدیث میں ہے: معاذ بن زہرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب افطار فرمالیتے تو یہ دعاء پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔

"اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی عطا کردہ پر افطار کیا"۔
(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

حدیث مبارک کے الفاظ بالکل واضح ہیں کہ افطار سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ

اظہارِ بندگی اور تشکرِ نعمتِ باری تعالیٰ کے لئے یہ دعاء فرماتے۔ امام احمد رضا خان قادری فتاویٰ رضویہ میں لکھتے ہیں کہ ملا علی القاری شارح مشکوٰۃ نے بھی یہی لکھا کہ حضور ﷺ افطار کے بعد یہ دعاء مانگتے تھے، اور ابن المبارک نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ "اَیْ قَرَأَ بَعْدَ الْاِفْطَارِ"، یعنی آپ افطار کے بعد یہ دعاء پڑھتے تھے۔ اور اگر کوئی شخص اس دعاء کو "قبل افطار" پر محمول کرتا ہے تو وہ بلاضرورت حدیث میں تاویل کرتا ہے، یعنی اس صورت میں کلماتِ حدیث "اِذَا اَفْطَرَ" کے معنی یہ کرنا پڑیں گے کہ "اَیْ اِذَا اَرَادَ الْاِفْطَارَ" یعنی جب آپ افطار کا ارادہ فرماتے، اور بلاضرورت حدیث پاک میں اپنی من پسند تاویل کرنا درست نہیں ہے۔

کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟

سوال: کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟ (فائزہ۔ گلشن اقبال)

جواب: جی نہیں، دس سالہ بچی پر روزہ فرض نہیں ہے، البتہ وہ شوق سے نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہو جائیں تو اس پر بلوغت کا حکم لگایا جائے گا اور اس پر احکامِ شرعیہ فرض ہو جائیں گے، اور کم از کم نو سال کی عمر میں بلوغت ممکن ہے، اگر علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بالغ تصور کیا جائے گا۔

ڈاکٹر کا ٹیوبلائزیشن کے ذریعے بچوں کی ولادت کا آپریشن کرنا

سوال: میں ڈاکٹر ہوں، ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ہمیں ڈیلیوری کرانا پڑتی ہے، ستر کھلتا ہے، کیا ایسے آپریشن سے میرے روزے پر اثر پڑے گا، طبی عمل کے ذریعے بچوں کی تولید بند کرنا شرعاً کیسا ہے؟ (عائشہ دانش۔ کارساز)

جواب: یہ اطمینان کی بات ہے کہ خواتین کے علاج اور آپریشن کے لئے خواتین ڈاکٹر موجود ہیں، نفسانی حظ و شہوت کے لئے ستر کو دیکھنا اور چھونا حرام ہے، علاج کے لئے جائز ہے اور اس سے ڈاکٹر کے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ انسانیت کی خدمت ہے۔ جب فطری طریقے سے کسی حاملہ خاتون کے ہاں زچگی نہ ہوسکتی ہو یا زچہ و بچہ کے لئے اس میں خطرہ ہو تو ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ڈیلیوری کرانا جائز ہے۔ اگر کوئی خدا ترس مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو مصنوعی طریقے سے عمل تولید کی بندش جائز

ہے اور شوہر کی رضامندی ہو تو بہر صورت جائز ہے۔

روزے کی حالت میں اگربتی سلگانا

سوال: کیا روزے دار جہاں بیٹھے ہوں، وہاں اگربتی سلگانا جائز ہے؟
(محمد ناصر خان چشتی...... گلشن اقبال، کراچی)

جواب: جائز ہے، لیکن اگربتی سلگا کر اسے دانستہ ناک کے قریب لے جا کر اس کا دھواں ناک کے اندر کھینچے تو دھواں اندر جانے کی صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم آئے گی۔

روزے میں INHALER کا استعمال

سوال: کیا روزے میں INHALER کا استعمال جائز ہے اور اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں، (فائزہ۔ گلشن اقبال)۔

جواب: ڈاکٹر صاحبان سے ہم نے اس سلسلے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق سانس کے مریض کے پھیپھڑے سکڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں تکلیف اور دشواری محسوس ہوتی ہے۔ ان ہیلر کے ذریعے ایسے کیمیکلز گیس یا مائع بوندوں کی شکل میں ان کے پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں جن کی بناء پر ان کے پھیپھڑے (LUNGS) کھل جاتے ہیں اور وہ دوبارہ آسانی سے سانس لینے لگتا ہے، تو چونکہ مریض کے بدن کے اندر ایک مادی چیز جاتی ہے لہٰذا اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور اگر مرض اس درجے کا ہے کہ پورے روزے کا وقت ان ہیلر کے استعمال کے بغیر مریض کے لئے گزارنا مشکل ہے تو پھر وہ معذور ہے، بر بنائے عذر و بیماری روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کرے۔

روزے کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا کے ڈراپ ڈالنا

سوال: روزے کی حالت میں کیا سرمہ لگا سکتے ہیں، یا آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالے جا سکتے ہیں، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں۔ (طارق۔ لانڈھی)

جواب: روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دوا کے قطرے ڈالنے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں اور یہ اختلاف آراء اس بات پر مبنی ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف کوئی نالی یا سوراخ ہے یا نہیں۔ جدید

طبی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف نالی (ROUTE) ہے، لہٰذا ہم اس رائے سے متفق ہیں کہ آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا

سوال: روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا کیسا ہے، کیا اس کے ذرات پیٹ میں جانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ (کمال اشرف۔ کلفٹن)

جواب: ویسے تو لپ اسٹک مفسدِ صوم نہیں ہے، لیکن اگر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی عادت ہے اور اس سے لپ اسٹک کے ذرات پیٹ میں چلے جاتے ہیں تو روزہ ٹوٹ جائے گا، لہٰذا احتیاط بہتر ہے۔

معتکف خاتون کا اپنے لئے کھانا خود تیار کرنا؟

سوال: میں تنہا خاتون اپنے گھر میں رہتی ہوں، گھر پر میری خدمت کیلئے اور کوئی بھی نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ اپنے گھر میں اعتکاف پر بیٹھ جاؤں، اور کسی رشتے دار کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا کھانا خود تیار کر لوں، کیا اس طرح میرا اعتکاف ہو جائے گا۔ (آفرین فاطمہ۔ گلشن اقبال)

جواب: آپ اس طرح اعتکاف پر بیٹھ سکتی ہیں، اپنے گھر پر ایک جگہ متعین کر کے، صرف کھانا پکانے کے لئے ضرورتاً کچن میں جائیں اور کھانا اٹھا کر اپنی جائے اعتکاف پر لا کر کھائیں اور باقی معمولات میں احکامِ اعتکاف کی پابندی کریں۔

روزے میں سحری کے بعد اگر غسل واجب ہو جائے تو روزہ رہے گا؟

سوال: رمضان المبارک میں سحری کے بعد روزے کی حالت میں احتلام ہو گیا اور غسل واجب ہو گیا، تو کیا روزہ قائم رہے گا، (مستقیم، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی)

جواب: جی ہاں روزہ بدستور قائم رہے گا، جتنی جلد ہو سکے غسل واجب ادا کر کے پاک ہو جائیں تا کہ کسی وقت کی نماز قضا نہ ہو جائے۔

بیوی ''بائی پاس آپریشن'' کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتی

سوال: بیوی کا ''بائی پاس آپریشن'' ہوا ہے، جس کی بناء پر روزہ نہیں رکھ سکتی، کتنا فدیہ ہوگا۔
(حفیظ الرحمٰن۔ سوسائٹی)

جواب: اگر بیوی کا ''بائی پاس'' آپریشن ہوا ہے اور کوئی خدا ترس دین دار ڈاکٹر یہ مشورہ دیتا ہے کہ روزہ رکھنے سے مریض کا مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑ دیں اور فدیہ دیں، ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلانا ہے، یا اس کے مساوی نقد رقم دے دیں، کم از کم تیس (30) روپے یومیہ کے حساب سے۔

سحری میں اذان شروع ہونے کے بعد کھانا اور پینا

سوال: سحری کے وقت اگر آنکھ دیر سے کھلے اور جب انسان اٹھے تو اذان ہو رہی ہو تو کیا اس وقت جلدی جلدی کچھ کھا پی سکتے ہیں، اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں۔
(ثریا پروین۔ نارتھ ناظم آباد، مسز سلیم۔ گلشن اقبال)

جواب: روزہ، ایک محدود وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عبادت کی نیت سے، کھانے، پینے اور جنسی عمل سے رک جانے کا نام ہے۔ لہٰذا جوں ہی صبح صادق شروع ہوئی، جس کا وقت انتہائے سحر کے عنوان سے آج کل ریڈیو، ٹیلی وژن، مختلف اداروں کے مطبوعہ نقشہ جات، اخبارات اور مساجد سے مشتہر ہو جاتا ہے، اور اذانِ فجر سحری کا وقت ختم ہونے پر ہی شروع ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت کھانا پینا منع ہے اور اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس کی قضا لازم ہوگی۔ آپ سحری ختم ہونے کے چند منٹ بعد کھائیں یا چند گھنٹے بعد، آپ نے شریعت کی بندش کو توڑ دیا تو روزہ نہ رہا۔ ایسی صورت میں بغیر کچھ کھائے پیے روزے کی نیت کر لیا کریں۔

کوئی شخص دوسرے ملک سے رمضان کے روزے رکھ کر آئے تو اب تکمیل کس حساب سے کرے

سوال: کوئی شخص مثلاً سعودی عرب سے روزہ رکھ کر آئے، جہاں رمضان المبارک ایک دن پہلے شروع ہوا تھا، وہاں کے حساب سے رمضان کے ایام ختم ہوگئے ہیں، لیکن یہاں پاکستان میں رمضان کا آخری دن چل رہا ہے، تو اب وہ کیا کرے، جہاں اور جس ملک میں رمضان المبارک شروع کیا تھا، اس کے حساب کے مطابق رمضان کی تکمیل کرے یا جہاں اب پہنچا ہے، اس کے حساب سے رمضان کی تکمیل کرے۔ (مولانا غلام دستگیر افغانی...... آگرہ تاج کالونی)

جواب: اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو نصوص حدیث ہیں، ایک یہ کہ ''الصَّوْمُ یَوْمَ

یَصُوْمُوْنَ وَالفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُوْنَ'' یعنی تم جس مقام پر ہو اس کے مطابق روزہ رکھو یا عید مناؤ، یعنی ان کی پیروی کرو، لہٰذا اگر تمہارے تیس روزے پورے بھی ہوگئے ہیں، تب بھی اس مقام والوں کو ساتھ دو، اس مقام کی اتباع میں آپ کے لئے ابھی رمضان جاری ہے۔

دوسرا یہ کہ ماہ رمضان زیادہ سے زیادہ تیس دن کا ہوتا ہے، اگر آپ کے تیس روزے پورے ہوگئے ہیں تو آپ یہاں اب 31 واں دن کا روزہ نہ رکھیں، جبکہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ...... ''پس تم میں سے جو اس ماہ رمضان کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے روزے رکھے'' والی آیت قرآنی کی رو سے آپ اس مقام پر رمضان کو پا رہے تھے، لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ روزہ رکھیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کے لئے یہ رمضان 31 دن کا متحقق ہوگا، آپ کے مخصوص حالات کی بناء پر۔

اور اگر آپ یہاں سے روزۂ رمضان کا آغاز کر کے سعودی عرب جائیں اور وہاں بالفرض 29 ویں رمضان کو چاند نظر آئے گا، جبکہ آپ کے ابھی اٹھائیس روزے ہوئے کیونکہ پاکستان میں رمضان ایک دن پیچھے شروع ہوا تھا، تو اب کے پاس دو راستے ہیں ''الصَّوْمُ یَوْمَ یَصُوْمُوْنَ وَالفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُوْنَ'' پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ رکھیں اور بعد میں ایک دن کی قضا رکھیں، کیونکہ رمضان المبارک 29 دن سے کم کا نہیں ہوتا۔ یا ''اَکْمِلُوا الْعِدَّۃَ'' پر عمل کرتے ہوئے ان کے ساتھ عید نہ منائیں اور اپنے روزے مکمل کر لیں۔

رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو بعد نماز تراویح مخصوص سورتیں پڑھنا

سوال: ہمارے علاقے میں گاؤں کی مساجد میں بعض جگہ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میں ختمِ قرآن ہوتا ہے اور بعض جگہ چھوٹی سورتیں پڑھی جاتی ہیں لیکن ستائیسویں شب کو تعین کے ساتھ نمازِ تراویح کے بعد سورۂ روم اور سورۂ عنکبوت پڑھی جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟
(سید ذاکر شاہ۔ بٹگرام، ہزارہ)

جواب: کسی عملِ خیر کو کسی خاص وقت، دن اور تاریخ کے ساتھ اس نظریے کے ساتھ متعین کر کے ادا کرنا کہ اس کا اجر و ثواب اس تعین کے ساتھ مشروط ہے یا یہ تعین اجرِ زائد کا سبب ہے

اسے تعینِ شرعی کہتے ہیں، اور دلیل شرعی کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ شارع کا منصب ہے جیسے فرضی روزوں کے لئے رمضان المبارک کا تعین، قربانی کے لئے ۱۰ تا ۱۲ ذوالحجہ، حج کے لئے وقوفِ عرفہ اور ۹ ذوالحجہ، رمی جمرات کے لئے ۱۰ تا ۱۳ ذوالحجہ وغیرہ۔ بعض مواقع کے لئے بعض سورتوں کا تذکرہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے مثلاً

(۱) رسول اللہ ﷺ رات کو سونے سے پہلے "الم تنزیل" اور "تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ" پڑھا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو سورۃ الواقعہ پڑھتا رہے وہ کبھی فقر و فاقہ اور تنگدستی کا شکار نہیں ہوگا۔

(۳) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن "سورۃ الکہف" پڑھے دو جمعوں کے درمیان (مدت کے برابر) اس کے لئے وسیلہ نور ہوگی (یہ نور اس کے قلب کو روشن کرے گا یا اس کی قبر یا حشر کی ظلمتوں میں نور ہوگا) وغیرہ۔

یوں تو قرآن مجید کی ہر سورت مقدس اور مبارک ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی تاریخ کو اس کا پڑھنا باعثِ برکت ہے (بشرطیکہ کوئی اور شرعی مانع نہ ہو) اور رمضان المبارک میں تو نفل عبادت کا ثواب دیگر ایام کے فرائض کے برابر ہوتا ہے، لہٰذا اگر کچھ لوگ ستائیسویں شب کو "سورۃ الروم" اور "سورۃ العنکبوت" پڑھتے ہیں یا حسبِ توفیق اور بھی سورتیں پڑھیں تو بلاشبہ یہ اجر و ثواب اور سعادت کی بات ہے لیکن تعینِ شرعی کی نیت سے پڑھنا درست نہیں ہے۔

تعینِ شرعی سے مراد ہے کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خاص اس رات کو یہ سورتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے یا یہ کہ اس دن دوسری سورتوں کے مقابلے میں ان کا زیادہ ثواب ہے یا یہ کہ یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاص معمول تھا درست نہیں ہے۔

روزے کی حالت میں خون دینا

سوال: روزے کی حالت میں ٹیسٹ کے لئے خون دینا کیسا ہے؟ کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ (محمد طیب، ناظم آباد)

جواب: روزے کی حالت میں ٹیسٹ کے لئے خون نکالنا مفسدِ صوم نہیں ہے، روزہ صحیح رہتا

ہے، کیونکہ حدیث پاک میں ہے: "الفطر مما دخل لیس مما خرج"، بدن میں کوئی چیز جانے سے روزہ ٹوٹتا ہے نہ کہ خارج ہونے سے۔

حاملہ عورت کو الٹی آجائے تو کیا روزہ توڑ دے

سوال: میں حاملہ ہوں، روزہ رکھنے کے بعد الٹی آگئی، تو کیا روزہ قائم رہا؟
(جویریہ عمران۔ گلشن اقبال)

جواب: الٹی آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ اگر حاملہ عورت کی صحت کمزور ہو اور روزہ رکھنے سے زچہ و بچہ کی صحت کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو اور کوئی خدا ترس دین دار ڈاکٹر یہ مشورہ دے کہ روزہ نہ رکھو تو اس صورت میں وہ روزہ چھوڑ سکتی ہیں لیکن بعد میں اتنے دنوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت اچھی ہے تو روزہ رکھتی رہیں۔

رمضان المبارک میں عشاء کی نماز تنہا پڑھنے والا، وتر جماعت کے ساتھ پڑھے یا تنہا؟

سوال: رمضان المبارک میں ایسے مواقع اکثر پیش آتے رہتے ہیں کہ ایک شخص نمازِ عشاء کے لئے مسجد میں پہنچا تو فرض کی جماعت ختم ہو چکی ہوتی ہے، اب وہ بامر مجبوری فرض اور سنت مؤکدہ تنہا ادا کر کے تراویح کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال میں وہ وتر باجماعت یا تنہا پڑھے۔؟ (اکرام اللہ۔ بلدیہ ٹاؤن، کراچی)

جواب: اس مسئلے میں ہمارے فقہاء کرام کی دو آراء ہیں، ایک یہ کہ ماہِ رمضان المبارک میں فرض نماز جماعت کے ساتھ نہ بھی پڑھی ہو تو اس کا وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا بلا کراہت جائز ہے، اور دلائل کے اعتبار سے یہی نظریہ راجح ہے، جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ "فرضِ عشاء" جماعت کے ساتھ نہ پڑھے ہوں، تو وتر بھی جماعت کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تنہا پڑھے، دلائل کے اعتبار سے یہ نظریہ مرجوح ہے۔

فقہاءِ کرام میں یہ اختلافِ آراء ایک اور اختلاف پر مبنی ہے، وہ یہ کہ آیا رمضان المبارک میں وتر کی جماعت، "فرضِ عشاء" کی جماعت کے تابع ہے یا تراویح کی جماعت کے۔ قول صحیح یہ ہے کہ فی نفسہٖ نماز وتر تو فرضِ عشاء کے تابع ہے، لیکن وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی

جماعت کے مسنون ہونے کے تابع ہے، کیونکہ اگر وتر کی جماعت عشاء کی جماعت کے تابع ہوتی تو وتر سارا سال جماعت کے ساتھ مسنون ہوتے، اس لئے کہ عشاء کی نماز میں جماعت سارا سال واجب ہے، جبکہ وتر تو صرف رمضان المبارک میں جماعت کے ساتھ مسنون ہیں، پس ثابت ہوا کہ وتر کی جماعت کا مسنون ہونا تراویح کی جماعت کے مسنون ہونے کے تابع ہے۔

علامہ محمود قاضی خان اوزجندی لکھتے ہیں:

اِخْتَلَفُوْا اَنَّ اَدَاءَ الْوِتْرِ فِیْ رَمَضَانَ بِالْجَمَاعَةِ اَفْضَلُ اَمِ الْاَدَاءُ فِیْ مَنْزِلِهٖ وَحْدَهٗ اَلصَّحِیْحُ اَنَّ الْجَمَاعَةَ اَفْضَلُ لِاَنَّ عُمَرَ ابْنَ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کَانَ یَؤُمُّهُمْ فِی الْوِتْرِ وَلِاَنَّهٗ لَمَّا جَازَ الْاَدَاءُ بِالْجَمَاعَةِ کَانَتِ الْجَمَاعَةُ اَفْضَلُ اِعْتِبَاراً بِالْمَکْتُوْبَةِ۔

"اس بات میں اختلاف ہے کہ رمضان میں وتر با جماعت ادا کرنا افضل ہے یا تنہا گھر میں پڑھنا، صحیح یہ ہے کہ جماعت افضل ہے، کیونکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کو وتر جماعت کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور یہ بات اس لئے بھی درست ہے کہ جب وتر کو جماعت کے ساتھ پڑھنا جائز ہے تو پھر فرض پر قیاس کرتے ہوئے (یہی کہنا چاہئے کہ وتر میں بھی) جماعت ہی افضل ہے"۔

(فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ج ۱ ص ۲۴۴ مطبوعہ کبریٰ بولاق مصر)

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر ج ۱ ص ۴۱۰-۴۰۹ پر اس مسئلے کی بحث کی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

"علامہ قاضی خان کی مذکورہ بالا عبارت کو نقل کرنے کے بعد "صاحبِ نہایہ" نے فرمایا کہ ہمارے علماء کا مختار یہ ہے کہ وتر بغیر جماعت کے پڑھے جائیں۔" اس پر کلام کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام تطبیق فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ (رمضان المبارک میں) وتر کا باجماعت پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، پھر اس کے تسلسل کو ترک کرنے کا سبب وہی ہے جو جماعت تراویح کا ہے، پھر خلفاءِ راشدین سے بھی وتر کی جماعت اور تعامل ثابت ہے، اس حقیقت کے پیش نظر علامہ قاضی خان کے قول کا محمل یہ ہے کہ اگر وتر عشاء کے اول وقت میں پڑھنے ہوں تو باجماعت پڑھنا افضل ہے اور اگر رات کے آخری حصے میں پڑھنے ہوں تو تنہا پڑھنا افضل ہے، جیسا کہ حضرت عمر کا

قول ہے: "رات کے جس حصے میں تم سو جاتے ہو، اس میں نماز پڑھنا افضل ہے" اور رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی معروف ہے کہ رات کو تمہاری آخری نماز وتر ہونی چاہئے تو اسے مؤخر کر کے پڑھو، جیسا کہ علماء عاملین اور سلف صالحین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ وتر کو آخر شب تہجد کے ساتھ پڑھتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت جماعت کا اہتمام دشوار ہے۔ علامہ ابن ہمام کے اس قول کو نقل کر کے جن فقہاء نے (آخر شب کی استثنائی صورت کے علاوہ) وتر کی جماعت کی افضلیت پر استدلال کیا ہے، ان میں علامہ زین الدین ابن نجیم، علامہ حسن بن عمار شرنبلالی، علامہ ابراہیم اور علامہ عبدالحلیم کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

اَلَّذِیْ یَظْهَرُ اَنَّ جَمَاعَةَ الْوِتْرِ تَبَعٌ لِجَمَاعَةِ التَّرَاوِیْحِ وَاِنْ کَانَ الْوِتْرُ نَفْسُهٗ اَصْلاً فِیْ ذَاتِهٖ لِاَنَّ سُنَّةَ الْجَمَاعَةِ فِی الْوِتْرِ اِنَّمَا عُرِفَتْ بِالْاَثَرِ تَابِعَةً لِلتَّرَاوِیْحِ۔

"جو بات میرے نزدیک بالکل عیاں ہے وہ یہ ہے کہ: وتر کی جماعت، تراویح کی جماعت کے تابع ہے، (یہاں بات جماعت وتر کی ہو رہی ہے ورنہ) فی نفسہٖ اپنی مشروعیت کے اعتبار سے تو وتر کی نماز بذاتِ خود اصل ہے (یعنی کسی کے تابع نہیں ہے، مگر یہاں بات جماعتِ وتر کی ہو رہی ہے) اور وتر کی جماعت کا سنت ہونا، آثار کی روشنی میں تراویح کے تابع ہے"۔ (ردالمحتار، ج ۱، ص ۶۶۳)

اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ رمضان المبارک میں وتر کی جماعت، تراویح کے تابع ہے، تو واضح ہوگیا کہ رمضان میں اگر عشاء کے فرض تنہا پڑھے ہوں اور تراویح جماعت کے ساتھ پڑھی ہو تو پھر وتر کی نماز تراویح کے ساتھ بلا کراہت پڑھ سکتا ہے۔

مولانا عبدالحلیم لکھتے ہیں:

اِذِ الْاِیْتَارُ بِالْجَمَاعَةِ فِیْ رَمَضَانَ سُنَّةٌ کَمَا اَنَّهَا سُنَّةٌ فِی التَّرَاوِیْحِ۔

"رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھنا سنت ہے، جیسا کہ تراویح میں جماعت سنت ہے"۔ (حاشیۃ الدرر ص ۸۴)

علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر (غنیۃ المستملی) میں لکھتے ہیں:

قَالَ اَبُوْ يُوْسُفَ الْبَانِي: اِذَا صَلّٰى مَعَ الْاِمَامِ شَيْأً مِّنَ التَّرَاوِيْحِ يُصَلِّيْ مَعَهُ الْوِتْرَ وَكَذَا اِذَا لَمْ يُدْرِكْ مَعَهٗ شَيْأً مِّنْهَا وَكَذَا اِذَا صَلَّى التَّرَاوِيْحَ مَعَ غَيْرِهٖ لَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ الْوِتْرَ مَعَهٗ وَهُوَ الصَّحِيْحُ، ذَكَرَهٗ اَبُو اللَّيْثِ وَكَذَا قَالَ ظَهِيْرُ الدِّيْنِ الْمَرْغِيْنَانِيُّ لَوْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَحْدَهٗ فَلَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ التَّرَاوِيْحَ مَعَ الْاِمَامِ وَهُوَ الصَّحِيْحُ.

"ابو یوسف البانی کہتے ہیں کہ: اگر امام کے ساتھ کچھ تراویح پڑھ لی ہیں تو اس کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے، اور اگر امام کے ساتھ کچھ بھی نہ پڑھا ہو (نہ فرض، نہ تراویح)، اسی طرح اگر کسی اور کے ساتھ تراویح پڑھی ہوں تو وہ امام کے ساتھ وتر پڑھ سکتا ہے۔ اور یہی صحیح ہے، اس مسئلے کو ابو اللیث نے ذکر کیا ہے، اور علامہ ظہیر الدین مرغینانی نے بھی یہی کہا ہے، اور اگر عشاء کے فرض تنہا پڑھے ہوں، تب بھی وہ امام کے ساتھ تراویح پڑھ سکتا ہے، یہی قول صحیح ہے"۔ (غنیۃ المستملی ص ۳۹۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی)

علامہ ابراہیم حلبی منیۃ المصلی کی شرح کبیر کے بعد منیہ کی شرح صغیر میں یہ مسئلہ مزید وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں:

وَاِذَا لَمْ يُصَلِّ الْفَرْضَ مَعَ الْاِمَامِ قِيْلَ لَا يَتْبَعُهٗ فِي التَّرَاوِيْحِ وَلَا فِي الْوِتْرِ وَكَذَا اِذَا لَمْ يُصَلِّ مَعَهُ التَّرَاوِيْحَ لَا يَتْبَعُهٗ فِي الْوِتْرِ وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ يَجُوْزُ اَنْ يَّتْبَعَهٗ فِيْ ذٰلِكَ كُلِّهٖ.

"اور جب امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے گئے ہوں تو کہا گیا ہے کہ پھر امام کی اقتداء میں نہ تراویح پڑھے نہ وتر، اسی طرح اگر امام کی اقتداء میں تراویح نہ پڑھی ہوں تو اس کی اقتداء میں وتر نہ پڑھے، اور صحیح قول یہ ہے کہ جب امام کے ساتھ فرض یا تراویح نہ پڑھی ہوں تو وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے، اسی طرح اگر امام کے ساتھ فرض نہ پڑھے ہوں تو تراویح جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے"۔ (شرح صغیر (صغیری) ص ۲۱۰)

علامہ احمد بن محمد الطحطاوی لکھتے ہیں:

لِاَنَّ الْمُنْفَرِدَ لَوْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَحْدَهٗ فَلَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ التَّرَاوِيْحَ مَعَ الْاِمَامِ ..... اِلٰى قَوْلِهٖ ..... قَضِيَّةُ التَّعْلِيْلِ فِي الْمَسْئَلَةِ السَّابِقَةِ بِقَوْلِهِمْ

لِاَنَّهَا تَبَعٌ لِلتَّرَاوِيْحِ وَلَا لِلْعِشَاءِ عِنْدَ الْاِمَامِ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنْتَهٰى.

"کیونکہ اگر کوئی شخص عشاء کی نماز تنہا پڑھے تو اس کے لئے تراویح امام کے ساتھ پڑھنا جائز ہے..... آگے چل کر لکھتے ہیں..... گزشتہ مسئلے میں بیان کردہ علت کا یہی تقاضا ہے، جس میں انہوں نے کہا ہے کہ (رمضان میں) امام کے نزدیک وتر کی جماعت نہ جماعت عشاء کے تابع ہے اور نہ ہی جماعت تراویح کے"۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۱ ص ۲۹۷)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ رمضان میں اگرچہ فی نفسہٖ "جماعتِ وتر" کا مسنون ہونا، "جماعتِ تراویح" کے مسنون ہونے کے تابع ہے، یعنی چونکہ رمضان میں تراویح با جماعت پڑھنا سنت ہے، لہٰذا وتر بھی با جماعت پڑھنا سنت ہے، لیکن وتر کا عملاً با جماعت پڑھنا، نہ جماعتِ عشاء کے تابع ہے اور نہ جماعتِ تراویح کے، لہٰذا اگر کسی نے فرض عشاء یا تراویح میں سے کوئی بھی با جماعت نہ پڑھے ہوں، وہ وتر با جماعت پڑھ سکتا ہے۔

ملا خسرو فرماتے ہیں:

ولا يصلى الوتر (بجماعة خارج رمضان) للاجماع ولا يصلى التطوع بجماعة الا قيام رمضان و عن شمس الائمة الكردری ان التطوع بالجماعة انما يكره اذا كان على سبيل التداعی اما لو اقتدى واحد بواحد او اثنان بواحد لا يكره.

"رمضان کے علاوہ وتر با جماعت نہ پڑھے اس پر اجماع ہے اور تراویح کے سوا نفل با جماعت نہ پڑھے، شمس الائمہ کردری سے منقول ہے کہ نوافل کی جماعت اس وقت مکروہ ہے جب لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے اگر ایک کی اقتداء میں ایک یا ایک کی اقتداء میں دو آدمی نفل پڑھ لیں تو مکروہ نہیں ہے"۔

(درر الحکام فی شرح غرر الاحکام ج ۱ ص ۱۲۰)

اس عبارت کا مستفاد یہ ہے کہ غیر رمضان میں وتر با جماعت پڑھنا جائز ہے مگر مکروہ ہے، اس سے زیادہ واضح طور پر علامہ علائی نے لکھا ہے:

وَلَا يُصَلِّي الْوِتْرَ وَلَا التَّطَوُّعَ خَارِجَ رَمَضَانَ اَیْ یَکْرَہُ ذٰلِکَ۔

"وتر اور نوافل رمضان کے علاوہ جماعت سے نہ پڑھے جائیں، یعنی جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے"۔ (درمختار علی ھامش الرد ج ا، ص ۶۶۳)

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی نے طویل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر رمضان میں وتر اگر کبھی باجماعت پڑھ لئے جائیں تو یہ مباح ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ منصور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رات گئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تدفین کی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے وتر نہیں پڑھے اور پڑھنے کھڑے ہو گئے، ہم نے بھی ان کی اقتداء میں صف باندھ لی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہم کو تین رکعات پڑھائیں اور صرف آخر میں سلام پھیرا۔

الغرض غیر رمضان میں کبھی کبھار وتر باجماعت پڑھ لینا مباح، غیر مکروہ یا غیر مستحب یا زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہے، البتہ اسے معمول بنالینا بدعتِ مکروہہ ہوگا۔

(نوٹ:- جو حضرات اس مسئلے کو مزید تفصیل کے ساتھ سمجھنا اور مطالعہ کرنا چاہتے ہوں، وہ شرح صحیح مسلم، مصنفہ علامہ غلام رسول سعیدی ج ۲، ص ۵۰۲ تا ۵۰۹ کا مطالعہ کریں)

روزے میں سرمہ لگانے کے جواز پر ایک دلچسپ اور مفید علمی بحث
جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں بعض فقہی مسائل پرنظرِ ثانی کی ضرورت

ہمارے قدیم فقہاءِ کرام نے ظن غالب کی بناء پر بعض امور کے مفسدِ صوم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے قائم کر کے حکم صادر کیا تھا۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ کان سے معدے کی طرف حلق کے راستے ایک منفذ' نالی یا سوراخ ہے۔ اب جدید طبی تحقیق نے عین الیقین سے بتادیا کہ کان سے معدے کی طرف کوئی سوراخ نہیں ہے، لہٰذا اب اس پر فقہاءِ عصر کا اجماع ہوتا جارہا ہے کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ الحمدللہ ہم لوگ اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری اس مسئلے کی نشاندہی میں سبقت کا شرف رکھتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے قدیم فقہاءِ کرام کی رائے یہ تھی کہ چونکہ آنکھ میں حلق کی جانب

کوئی سوراخ یا منفذ نہیں ہے، اس لئے آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ہمارے معاصر فقہاء میں سے غالب اکثریت ابھی تک اسی رائے پر قائم ہے۔ اب چونکہ طبی طور پر عین الیقین کی حد تک یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنکھ میں حلق کی طرف سوراخ یا نالی موجود ہے، اس لئے اب اہل فتویٰ کو یہ فتویٰ دینا چاہئے کہ آنکھ میں دوا ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

ہمارے اجلّہ فقہاءِ عصر علامہ غلام رسول سعیدی اور علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری کی یہی رائے ہے اور انہی کی تحقیقات سے استفادہ کر کے ہم نے تین سال قبل قومی اخبارات و جرائد میں ان مسائل کی جانب فقہاءِ عصر کو متوجہ کیا تھا اور ان سے جدید تحقیق کی روشنی میں اس مسئلے کے بارے میں اپنی قدیم رائے پر نظرِ ثانی کی درخواست کی تھی۔ ان مسائل جدیدہ میں سے کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جانے کی بابت علماء دیوبند میں سے دارالعلوم کراچی کے مفتیانِ کرام کا نظرِ ثانی شدہ فتویٰ باقاعدہ دستخطوں کے ساتھ آچکا ہے، جس کی ہم نے "مجلس فقہ اسلامی" کی جانب سے تحسین کی ہے اور انہیں بعض دیگر مسائل پر نظرِ ثانی کرنے اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

ہم نے آنکھ میں دوا ٹپکانے کے مسئلے میں لکھا تھا کہ سرمہ لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے، لہٰذا خلافِ قیاس استحساناً سرمہ لگانے کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیا جائے گا۔ اس پر کوئی محترم اشرف صاحب ہیں، جنہوں نے حضرت مفتی محمد رفیق حسنی صاحب نائب رئیس مجلس فقہ اسلامی کی خدمت میں ہمارا اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا موقف ارسال کر کے "سرمے کے مفسدِ صوم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں" ان سے محاکمہ کرنے کی درخواست کی ہے، "مفتی صاحب نے اپنا موقف واضح کرنے کے لئے یہ مسئلہ مجھے ارسال فرمایا ہے۔ اس مسئلے پر اپنے تفصیلی معروضات پیش کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ہمارے اور حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کے درمیان اصل متفق علیہ ہے، لہٰذا اختلافِ رائے اصول میں نہیں ہے بلکہ اس کے اطلاق میں ہے، جو اصل ہمارے درمیان متفق علیہ ہے، وہ یہ ہے کہ آنکھ اور حلق کے درمیان منفذ ہے، حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری ہمارے معاصر علماء و فقہاءِ کرام اور اہل فتویٰ میں سے دقت نظر کے حامل ہیں، جزئیات پر اصول کے اطلاق و انطباق میں ان کی نظر عمیق ہے۔

جزئیات کے استنباط و استخراج، مماثل جزئیات میں علتِ مشترکہ کی بناء پر ایک حکم دوسری

کے لئے ثابت کرنے اور جدید دور میں پیش آمدہ مسائل کا فقہی وشرعی حل تلاش کرنے میں مجتہدانہ بصیرت کے حامل ہیں۔ موجودہ دور میں ایسے وسیع المطالعہ، متصلّب فی الدین اور روشن خیال علماء کا وجود اہلسنّت کے لئے غنیمت اور وقیع علمی سرمایہ ہے۔ ہم اسے علمی دیانت کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں کہ زیر بحث مسئلے پر حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا موقف ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ پیش کردیا جائے تاکہ اہلِ علم کو محاکمہ کرنے میں آسانی ہو۔

چنانچہ مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں: ''اختتامِ بحث سے قبل اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا روزہ کی حالت میں سرمہ ڈالنا یا اس کا حکم فرمانا ثابت نہیں اور اس سلسلے میں مروی تمام احادیث ضعیف ہیں۔ اس قسم کی متعدد احادیث اور ان کی اسناد پر مفصل جزم کے لئے فتح القدیر ص ۲۷، ج ۲، مطبوعہ مصر اور مرقات شرح مشکوٰۃ ص ۵۰۵، ص ۵۰۶، ج ۴، مطبوعہ المکتبہ التجاریہ، مکہ مکرمہ ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف ایک حدیث اور پھر اس کی فنی حیثیت پر امام ابوعیسیٰ ترمذی علیہ الرحمۃ کا کلام نقل کیا جاتا ہے۔

ترمذی شریف باب ماجاء فی الکحل للصائم میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے:

جاء رجل الی النبی ﷺ قال اشتکت عینی افاکتحل وانا صائم قال نعم وفی الباب عن ابی رافع قال ابوعیسٰی حدیث انس حدیث اسناده لیس بالقوی ولا یصح عن النبی ﷺ فی هذا الباب شیٔ و ابو عاتکة یضعف و اختلف اهل العلم فی الکحل للصائم فکرهه بعضهم وهو قول سفیان و ابن المبارک و احمد و اسحق و رخص بعض اهل العلم فی الکحل للصائم۔

''ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا میری آنکھیں دکھتی ہیں کیا میں روزہ رکھتے ہوئے سرمہ لگا سکتا ہوں فرمایا ہاں (امام ابوعیسیٰ ترمذی فرماتے ہیں) اس باب میں ابورافع سے بھی روایت ہے اور حدیث انس (جس کا ابھی ذکر ہوا) کی سند قوی نہیں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث صحت کے ساتھ ثابت نہیں اور ابو عاتکہ (جو حدیث انس کے راوی ہیں) کو ضعیف مانا جاتا ہے اور اہل علم نے روزہ کی

حالت میں سرمہ لگانے میں اختلاف کیا ہے بعض اسے مکروہ کہتے ہیں حضرت سفیان ثوری، ابن المبارک، امام احمد اور اسحٰق کا یہی قول ہے اور بعض اہل علم نے روزہ دار کو سرمہ لگانے میں رخصت دی ہے''۔

الغرض ''اکتحال فی الصوم'' کے جواز میں وارد احادیث ضعیف ہیں۔ بلکہ روزہ کی حالت میں سرمہ ڈالنے کی ممانعت پر بھی بعض ضعیف احادیث موجود ہیں، چنانچہ سنن ابی داؤد میں حضرت معبد بن ہوذہ سے روایت ہے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے سوتے وقت مشک ملے ہوئے اثمد (سرمہ کی ایک قسم) لگانے کا حکم فرمایا اور یہ بھی ارشاد فرمایا لیتقه الصائم یعنی ''روزہ دار اس سے بچے''۔

اسی حدیث سے قاضی ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ (یہ دونوں تابعی ہیں اور حضرت امام اعظم کے معاصر ہیں) نے یہ استدلال کیا ہے کہ سرمہ لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد میں ہے: وقد استدل لهذا الحدیث ابن شبرمة و ابن ابی لیلی وقالا ان الکحل یفسد الصوم ص ۲۸۳، ج ۲، طبع بیروت۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ روزہ میں سرمہ لگانے کی احادیث اگرچہ ضعیف ہیں مگر احادیث ضعیفہ کا مجموعہ قابل استدلال ہوتا ہے جیسا کہ امام ابن الہمام اور علامہ علی قاری نے اس کی تصریح فرمائی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجموعہ کی قوت مسلّم ہے مگر یہ حدیث صحیح ''الفطر مما دخل'' کے معارض ہیں اور احناف تعارض کے وقت ''محرم'' کو ''مبیح'' پر ترجیح دیتے ہیں چونکہ ''الفطر مما دخل'' سے روزہ کی حالت میں سرمہ لگانے کی حرمت ظاہر ہوتی ہے اور اکتحال فی الصوم کی احادیث سے سرمہ ڈالنے کا جواز نکلتا ہے لہٰذا الفطر مما دخل کی روایات اکتحال فی الصوم کی روایات پر راجح قرار پائیں گی۔

نیز الفطر مما دخل کی روایت ضابطہ کلیہ بیان کررہی ہے اور اکتحال فی الصوم کی روایات اس ضابطہ کلیہ کے خلاف ایک امر جزئی (آنکھ میں سرمہ ڈالنا) بیان کررہی ہیں اور احناف ایسی صورت میں اس روایت کو قبول کرتے ہیں جو ضابطہ کلیہ بیان کررہی ہو۔

(خلاصہ تذکرۃ المحدثین بحوالہ عمدۃ القاری، ص ۷۹)

پھر الفطر مما دخل کی روایت مؤید بالقیاس ہے اور اکتحال فی الصوم کی روایات مؤید

بالقیاس نہیں بلکہ مخالفِ قیاس ہیں اس لئے بھی الفطر مما دخل کی حدیث راجح ہونی چاہئے۔
مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ جب دو حدیثوں میں تعارض ہو تو مُحَرِّم کو مُبِیح پر ترجیح دی جاتی ہے، لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' یا ''اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' والی حدیث کو، ترمذی کی روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت والی حدیث پر، ترجیح حاصل ہے۔ کیونکہ ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' والی حدیث، جو انہوں نے فتح القدیر، ص ۷۲، ج ۲ کے حوالے سے لکھی ہے، یہ مسند ابو یعلیٰ کی حدیث نمبر ۴۶۰۲ ہے اور فتح القدیر میں بھی یہ مسند ابو یعلیٰ ہی کے حوالے سے لکھی گئی ہے اور امام کمال الدین ابن ہمام نے اس حدیث کو درج کرنے کے بعد یہ لکھ دیا ہے کہ: وَلِجَهَالَةِ الْمَوْلَاةِ لَمْ يُثْبِتْهُ بَعْضُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ یعنی'' باندی کے مجہول ہونے کی وجہ سے بعض ماہرینِ علم حدیث کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔'' اس جملے کو حضرت مفتی محمد ابراہیم نے نقل نہیں فرمایا کہ یہ حدیث غیر ثابت ہے اور لائقِ استدلال نہیں، نیز مسند ابو یعلیٰ کے شارح اور محقق نے اس حدیث کی سند پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: سلمٰی کے مجہول ہونے کی وجہ سے اس کی سند ضعیف ہے۔ (حاشیہ مسند ابو یعلیٰ ج ۸ ص ۷۶) اور حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو درج کر کے لکھا ہے: ''وَفِيْهِ مَنْ لَمْ اَعْرِفْ'' یعنی'' اس میں ایک راوی ایسا ہے جسے میں نہیں جانتا۔'' (مجمع الزوائد ج ۳ ص ۱۶۷)

ان تمام حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ حدیث ضعیف ہے اور دیگر اسانید سے اس کو روایت کر کے اس کی تقویت بھی نہیں کی گئی، لہٰذا اس حدیث میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ یہ جامع ترمذی کی اس حدیث سے معارض ہو سکے جو دیگر اسانید سے تقویت یافتہ ہے۔

یہ اصل جو بیان کیا گیا ہے کہ مُبِیح اور مُحَرِّم میں تعارض کے وقت ''مُحَرِّم'' کو ''مُبِیح'' پر ترجیح ہوتی ہے، یہ اس وقت ہے جب دونوں حدیثیں ایک ہی درجہ کی ہوں، لیکن جو حدیث ''مُبِیح'' ہے، وہ صحاح ستہ کی ہے اور دیگر متعدد اسانید سے اس کی تائید و تقویت ہے، اور جو حدیث ''محرم'' ہے، وہ غیر صحاح ستہ کی ہے اور اس کی ضعیف سند کی کسی دوسری سند سے تائید بھی نہیں ہے، لہٰذا ان دونوں میں تعارض ہی نہیں ہے، چہ جائے کہ ایک دوسری پر راجح ہو۔ نیز مفتی صاحب کا اسے حدیث صحیح قرار دینا فنی اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

مفتی صاحب نے ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' (یعنی روزہ ان چیزوں سے ٹوٹتا ہے جو بدن کے

اندر داخل ہوں) والی جو حدیث پیش کی ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عکرمہ (جو تابعی ہیں) کے اقوال ہیں اور ان کی فنی حیثیت یہ ہے کہ ان کو امام بخاری نے تعلیقاً بغیر سند کے درج کیا ہے۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۶۰)'' جیسا کہ علامہ عینی نے لکھا ہے: ''هٰذَانِ التَّعْلِيْقَانِ۔ (عمدۃ القاری ج ۱۱ ص ۳۷)

اور اہل علم سے مخفی نہیں کہ امام بخاری کی تعلیقات میں ہر قسم کی روایات ہیں اور صحیح بخاری میں درج ہونے سے وہ لازماً صحیح نہیں قرار پاتیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، اور ''اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' یہ صحابی اور تابعی کے اقوال ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بہر حال صحابی اور تابعی کے اقوال پر راجح ہے۔ لہٰذا یہ بھی ایک درجے کی احادیث نہیں ہیں اور ان میں بھی تعارض نہیں ہے، اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ ان میں سے مُحَرِّم، مُبِیح پر راجح ہے، کیونکہ ترجیح اس وقت دی جاتی ہے جب دونوں ایک ہی درجے کی احادیث ہوں۔

مفتی صاحب نے سنن ابی داؤد کی حدیث نمبر ۲۳۷۷ کا حوالہ دیا ہے جو یہ ہے:

عن عبدالرحمن بن النعمان بن معبد بن هوذة عن ابيه عن جده عن النبی ﷺ انه امر بالاثمد المروح عندالنوم وقال: ليتقه الصائم.

''حضرت معبد بن ہوذہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے سوتے وقت مشک ملا ہوا سرمہ لگانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا کہ روزے دار اس سے بچے''۔

اس حدیث کے تحت امام ابوداؤد نے لکھا ہے کہ یہ حدیث ''منکر'' ہے، واضح رہے کہ حدیث ''منکر'' اسے کہتے ہیں جو حدیث معروف کے مقابلے میں ہو اور معروف حدیث یہ ہے:

عن انس بن مالک، قال: جاء رجل الى النبی ﷺ فقال: اشتكت عينی، افأكتحل وأنا صائم؟ قال: نعم.

''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری آنکھیں دکھ رہی ہیں، کیا میں سرمہ لگا سکتا ہوں جبکہ میں روزے سے ہوں، آپ نے فرمایا: ہاں''۔ (جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۷۲۶)

لہٰذا یہ جامع ترمذی کی حدیث معروف کے معارض نہیں ہو سکتی۔

حضرت مفتی محمد ابراہیم قادری نے ''اَلْاِفْطَارُ مِمَّا دَخَلَ'' کو ضابطۂ کلیہ قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ''عام مخصوص عنہ البعض'' ہے، کیونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ناک میں پانی ڈالنے اور کلی کرنے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی ''مِمَّا دَخَلَ'' کے عموم میں شامل ہے۔ اور جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ تک پہنچنے کے ''مفطر'' ہونے کا ذکر کسی حدیث میں نہیں ہے، یہ ہمارے فقہاء کرام کی تصریح ہے۔ اور ''عام مخصوص عنہ البعض'' ظنی ہوتا ہے اور اس سے کسی کلیہ پر استدلال کرنا یا اس کو ضابطۂ کلیہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ ایک صحابی یا تابعی کا قول ہے اور وہ حدیث رسول سے متصادم ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا، اور برسبیلِ تنزل اگر اسے ضابطہء کلیہ مان بھی لیا جائے، تب بھی رسول اللہ ﷺ سے سرمہ لگانے کی اجازت اس ضابطہء کلیہ سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ آپ شارع ہیں۔ علاوہ ازیں جس طرح ایک صحابی اور ایک تابعی حضرت ابن عباس اور حضرت عکرمہ سے ''اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ'' منقول ہے، جس کی بنیاد پر حضرت مفتی صاحب نے روزے میں سرمہ لگانے کو ''مفطر'' (روزہ ٹوٹنے کا سبب) قرار دیا ہے، اسی طرح سے ایک صحابی اور ایک تابعی حضرت انس اور حضرت اعمش سے عبارۃ النص سے روزے میں سرمہ لگانے کے ''غیر مفطر'' ہونے کی تصریح ہے، وہ روایات درج ذیل ہیں:

عن انس بن مالک انه کان یکتحل وهو صائم.

''حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ وہ روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے''۔ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۲۳۷۸)

عن الاعمش قال: مارأیت احدا من اصحابنا یکره الکحل للصائم وکان ابراهیم یرخص ان یکتحل الصائم بالمصبر.

''حضرت اعمش نے فرمایا کہ میں نے اپنے اصحاب میں سے کسی کو نہیں دیکھا جو روزے دار کے لئے سرمہ لگانے کو مکروہ سمجھتا ہو اور ابراہیم روزے دار کو مصبر کا سرمہ لگانے کی اجازت دیا کرتے تھے''۔ (سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۲۳۷۹)

حضرت ابن عباس اور عکرمہ کے اقوال سے ''اشارۃ النص'' کے طور پر روزے میں سرمہ لگانے کی ممانعت ثابت ہے اور اس کے مقابلے میں حضرت انس اور اعمش سے روزے میں سرمہ لگانے کے ''غیر مفطر'' ہونے کی تصریح ہے۔ اگر ان اقوال کو آپس میں متعارض بھی قرار دیا جائے

تو جامع ترمذی میں جو روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت کا ذکر ہے، وہ تعارض سے خالی ہے اور اس کا کوئی مزاحم نہیں ہے۔

امید ہے حضرت علامہ مفتی محمد ابراہیم قادری صاحب ان سطور کا مطالعہ فرمانے کے بعد اپنے موقف پر یا تو نظر ثانی فرمائیں گے اور یا ہماری ان گزارشات کی توجیہ فرمائیں گے۔

ایک ہی ملک میں روزہ اور عید الگ الگ کیوں ہوتے ہیں؟

سوال: اکثر ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں باقی ملک کے مقابلے میں روزہ اور عید الگ الگ ہوتے ہیں، ایسا کیوں ہے، (پیر رحمٰن آفریدی۔ بلدیہ ٹاؤن)۔

جواب: حکومت نے اسی لئے رویتِ ہلال کا ملک گیر نظام قائم کیا ہے۔ اب تمام مکاتبِ فکر کے جید اور ثقہ علماء کرام پر مشتمل ''مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان'' ہے، اس کی اعانت کے لئے ملک کے تمام صوبائی، ڈویژنل، ڈسٹرکٹ اور سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹرز پر زونل رویت ہلال کمیٹیاں موجود ہیں۔ جب حکومت نے ایک ادارہ قائم کر کے اس کو اختیار تفویض کر دیا ہو تو اس کے متوازی اور مقابل، علماء کو پرائیویٹ کمیٹیاں قائم نہیں کرنی چاہئیں بلکہ اس کمیٹی کی معاونت کرنی چاہئے اور اس کے نظام کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ پورے ملک میں ایک ساتھ رمضان کا آغاز ہو اور ایک ساتھ عید منائی جائے۔ اور الحمدللہ اس سال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پورے ملک میں ایک ساتھ رمضان شروع ہوا ہے اور گزشتہ سال بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ دعا کریں کہ عید الفطر بھی پوری قوم ایک ساتھ منائے۔

اسلامک ایجوکیشن انٹرنیشنل برطانیہ کی جانب سے رویتِ ہلال کے مسئلے پر استفسار

بصد ادب گزارش یہ ہے کہ اسلامی مہینوں کی ابتداء اور انتہا نئے چاند کے دیکھنے پر منحصر ہے۔ تاجدار کائنات ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک دنیا بھر کے مسلمانوں کا اسی پر عمل رہا ہے۔ سعودی عرب دونوں عیدوں، حج اور رمضان کا اعلان کرتے وقت یہ دعویٰ کرتا ہے وہاں پر بہت سارے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا ہے جب کہ ابزرویٹری کی معلومات کے مطابق چاند کا انسانی آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے وہ اسلامی ملک جہاں

آنکھوں سے دیکھنے کا پورا اہتمام ہوتا ہے وہاں بھی یہ سارے دن ایک دن بعد شروع ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اہل حدیث، دیو بند، عرب اور اہلِ سنت کی ایک بہت بڑی تعداد ان کی پیروی میں ان مقدس دنوں کا اعلان کر دیتی ہے۔ اہل سنت کا ایک طبقہ اور چند دوسرے افراد اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا رمضان کی ابتداء اور دونوں عیدیں ایک دن نہیں ہو پاتیں اور ہر شہر میں دو اور کبھی تین عیدیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح عرب ریاستیں بھی سعودی عرب کی پیروی میں نئے اسلامی مہینے کی ابتداء کا اعلان کر دیتی ہیں۔ سعودی عرب کی پیروی میں اس سال کئی عرب ملکوں نے عید الفطر کا اعلان کیا۔

مثلاً اس بار 4 دسمبر 2002 ابزرویٹری کے مطابق پوری دنیا میں کہیں بھی چاند نظر آنے کا امکان نہیں تھا۔ لندن میں 4 دسمبر 2002 کو سورج 3:54 پر غروب ہوا اور چاند غروب 3:56 پر ہوا۔ سعودی عرب ہمارے مشرق میں ہے اگر وہاں پر چاند نظر آئے تو مغرب میں چاند نظر آنا یقینی ہے مگر سعودی عرب نے 5 دسمبر کی عید کا اعلان کیا ہے۔ میری گزارش یہ ہے۔

ا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سعودی عرب کے اس اعلان کو صحیح مان لیا جائے اور اس کے مطابق عید کا اعلان کر کے یہ ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے کیونکہ وہ مسلمان ملک ہے اور مسلمان کے بارے بدظنی نہیں کرنی چاہئے۔

عام تاثر یہ ہے کہ سعودی عرب میں شرعی شہادت کے تحت اعلان ہوتا ہے حالانکہ ان کے ہاں نئے چاند کی پیدائش پر نئے مہینے کا اعلان ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت میں روانہ کر رہا ہوں۔ شہادت وہ لیتے ہیں لیکن اس کی تحقیق نہیں کرتے۔ کسی جگہ کا کوئی شخص بھی اگر وہاں کے امام کو یہ بتائے کہ میں چاند دیکھا ہے تو وہ مرکزی رویت ہلال کو اطلاع دے دیتا ہے اور اسی گواہی کی بنا پر نئے مہینے کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

2۔ کیا ابزرویٹری کی معلومات پر اعتماد صحیح ہے کہ اس اعتماد کی وجہ سے ایک مسلمان ملک کی رویت کے اعلان کو نہ مانا جائے۔

3۔ اسلامی مہینوں کی ابتداء پہلے کرنے والے اپنے تحفظ میں ایک نیا موقف متعارف کرا رہے ہیں۔ اور وہ ہے چاند کے موجود ہونے ان کی وضاحت کے مطابق رؤیت، علم کے معنی میں ہے اور چاند سے مراد مطلق چاند ہے۔ لہٰذا نیا چاند اگر سورج کے غروب ہونے کے بعد چند لمحات کے لئے

بھی موجود رہے تو اگلا دن نئے مہینہ کا پہلا دن ہوگا۔ بلکہ اہل سنت کی ایک معروف شخصیت کی جانب سے اس میں مزید وسعت آ رہی ہے۔ ان کی دعویٰ ہے کہ: ''اگر رات 12 بجے تک بھی چاند کی پیدائش ہو جائے تو اگلا دن پہلا ہوگا۔ یہ استحسان ضرورت ہے اور ضرورت مسلمانوں کی اتحاد ہے۔ رویت، علم کے معنی میں ہے اور چاند سے مطلق چاند مراد ہے چاہے وہ نظر آنے کے قابل ہو یا نہ ہو جب کہ اس موقف کو صرف ان کے اداروں نے اپنایا ہے۔ ان کے علاوہ ایک بھی مسجد نے نہیں اپنایا۔ کیا صرف چاند کی پیدائش یا سورج غروب ہونے کے بعد چاند کے وجود کی بنیاد پر اسلامی مہینے کی ابتداء کرنا صحیح ہے؟

کیا زمانہ رسالت سے لے کر آج تک کسی عالم دین نے رویت اور ہلال کا یہ معنی لیا ہے؟ اگر لیا ہے تو اس کی طرف راہنمائی کی جائے۔ کیا امت کے اتحاد کے لئے اور لوگوں کی بے چینی کو دور کرنے کے لئے اس معنیٰ کو لینے کی کوئی معمولی سی گنجائش ہے؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس افتراق سے اسلام کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے اور کفار کی جانب سے تعلیمی اداروں میں خاص طور پر اور ہر سطح پر عام طور پر نوجوانوں نسل کو دین سے متنفر کیا جا رہا ہے اور وہ متنفر ہو رہے ہیں۔

4۔ عید الاضحیٰ کے موقعہ پر یہ ایک وزنی اعتراض ہوتا ہے کہ کیا سعودی عرب لاکھوں اہل اسلام کا فریضہ حج فاسد کر رہے ہیں۔ مخالفین کے پاس یہ ایک مضبوط عوامی دلیل ہوتی ہے کہ حج کے دوسرے دن عید الاضحیٰ ہوتی ہے اور یہ منوانا بہت مشکل ہوتا ہے کہ سعودی عرب اکثر اعلان غلط کرتا ہے۔ احقر العباد بھی اس ضمن میں سخت الجھن میں ہے کہ کیا واقعتاً حج فاسد ہو رہا ہے کیونکہ ہمارے نظریہ کے مطابق وقوفِ عرفہ 9 کی بجائے 8 ذی الحجہ کو ہو رہا ہے۔ ہر سال پوری دنیائے اسلام سے بڑے بڑے علماء حج پر آتے ہیں تو اس مسئلہ کو کیوں نہیں اٹھاتے؟ اس خاموشی کی بنیاد کیا ہے؟ یہ مسئلہ تو حکومتی سطح پر بھی اٹھایا جا سکتا ہے، کبھی کسی نے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

ہمارے چند علماء کرام نے یہ تو وضاحتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں کہ اگر ایک آدمی پاکستان سے سعودی عرب جائے۔ پاکستان میں روزہ ہو اور وہاں عید ہو تو وہ کیا کرے یا کوئی آدمی سعودی عرب سے عید کے دن چلے اور پاکستان میں روزہ ہو تو کیا کرے یہ نہیں لکھا کہ سعودی عرب کا اعلان غلط ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی وضاحت کے بعد اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے اگر ایسا ہوا تو یقیناً ساری امت آپ کو دعائیں دے گی وگرنہ عند اللہ تو بہر صورت آپ کو اجر عظیم سے نوازا

جائے گا۔

آپ سے گزارش ہے کہ اپنا جواب آسان ترین الفاظ میں لکھیں تا کہ عام لوگ اس کو سمجھ سکیں۔ میری آپ سے یہ بھی گزارش ہوگی کہ اپنے جوابؐ میں کسی شخصیت یا کسی جماعت پر ذاتی تنقید نہ کریں کیونکہ اس سے مزید الجھاؤ پیدا ہوگا۔

مجھے اس بات کا مکمل احساس ہے کہ ان ساری گزارشات کی توضیحات پر آپ کا کافی وقت صرف ہوگا اور آپؐ کی دینی و مسلکی مصروفیات و معمولات میں رکاوٹ ہوگی، لیکن واللہ اس مسئلہ کی بنیاد پر مسلمانوں کا وقار نہ صرف مجروح ہورہا ہے بلکہ نفرتوں میں تبدیل ہورہا ہے۔ آپ کی راہنمائی مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس گزارش کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلہ میں ضرور رہنمائی فرمائیں گے اور جس قدر جلد ممکن ہوا اپنی تحقیق سے نوازیں گے۔

نوٹ: آپ کی معلومات اور اپنی تشویش کے ثبوت کیلئے بعض دستاویزات کے اقتباسات بھی منسلک ہیں،

(خادم العلم والعلماء ساجد الہاشمی)

160-162, Grey Street, Burnley, Lancashire,

BB101PX, England

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجواب بعون الملک الوہاب

قرآن وحدیث میں چاند کے بارے میں جو نصوص ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند ساکن اور جامد نہیں ہے بلکہ متحرک ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (الرحمٰن:5)

"سورج اور چاند (اپنی گردش میں) ایک حساب اور ضابطے کے پابند ہیں"۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین:38-40)

"اور سورج اپنی قرارگاہ (محور ومدار) پر رواں دواں ہے، یہ ایک غالب علیم ہستی کا طے کردہ (نظام) ہے، اور چاند کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں، یہاں تک کہ لوٹ پھر کر وہ کھجور کی پرانی شاخ کی مانند ہوجاتا ہے، نہ سورج کی مجال کہ وہ (چلتے چلتے) چاند کو جا پکڑے، اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے، اور ہر ایک (اپنے) مدار میں تیر رہا ہے"۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ (ابراہیم:34)

"اور اس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مطیع کردیا کہ وہ مسلسل رواں دواں رہیں"۔

ان آیات مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند اللہ تعالیٰ کے حکم سے متحرک ہے، اس کا مدار ومحور اور منزلیں مقرر ہیں، اس کا یہ سفر خودسری کا نہیں ہے اور نہ ہی بے ہنگم ہے، بلکہ ایک سسٹم، ڈسپلن اور نظام کے تابع ہے۔

یہ آیات مبارکہ آیاتِ تشریع تو نہیں ہیں بلکہ آیاتِ تکوین اور تذکیر وموعظت ہیں، لیکن بہر کیف ان سے یہ منشائے ربانی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ چاند کا محور ومدار، حرکت ورفتار اور منازل قادرِ مطلق کی جانب سے متعین ہیں اور اس تقدیرِ الٰہی سے کسی کو سرمو انحراف کی مجال نہیں ہے۔ اور موجودہ دور میں سائنسی علوم اور آلات کے ذریعے انسان نے تیقن یا کم از کم ظنِ غالب کی حد تک اس علم کو حاصل کرلیا ہے اور فقہاءِ اسلام نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ مسائل واحکام شرعیہ کے استنباط واستخراج اور اطلاق میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی آراء سے استفادہ کرنا چاہئے، اس کی دو مثالیں پیشِ خدمت ہیں:

۱) فقہائے احناف نے اس مسئلہ پر امکانی بحث کی ہے کہ احلیل ذکر سے پانی یا مائع داخل کردیا جائے تو روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟۔ امام اعظم ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد نہیں ہوگا، امام ابو یوسف کا قول یہ ہے کہ روزہ فاسد ہوجائے گا اور امام محمد مضطرب الخیال ہیں یعنی کوئی حتمی اور قطعی رائے قائم نہیں کرپائے، یہ اختلاف اس امر پر مبنی ہے کہ آیا "احلیلِ ذکر" اور جوفِ معدہ کے درمیان منفذ (یعنی کوئی روٹ یا نالی) ہے یا نہیں۔

امام اعظم کا خیال یہ تھا کہ منفذ نہیں ہے بلکہ درمیان میں مثانہ ہے اور پیشاب اس سے مترشح ہوکر آتا ہے اور امام ابو یوسف کا خیال تھا کہ منفذ ہے اور ان دونوں ائمہ کا اس مسئلے میں اختلاف (

یعنی ایک کے نزدیک اس عمل سے روزے کا نہ ٹوٹنا اور دوسرے کے نزدیک ٹوٹ جانا) اسی اختلاف پر مبنی ہے۔امام محمد نے پہلے امام اعظم کے قول سے اتفاق کیا، پھر امام ابو یوسف کے قول کی جانب ان کی رائے مائل ہوئی، اور آخر عمر میں توقف فرمالیا، یعنی کوئی قطع رائے قائم نہ کرسکے، کیونکہ اصولی طور پر یہ اختلاف فقہی نہیں ہے، فقہی اصول تینوں ائمہ احناف کے درمیان متفق علیہ ہے، بلکہ یہ مسئلہ ''علم تشریح الاعضاء'' (ANOTOMY) کا ہے، یعنی ماہرین طب نے طے کرنا ہے۔اور اس وقت تک ''علم تشریح الاعضاء'' نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی، جس مقام پر آج ہے، (ملخصاً البنایہ فی شرح الہدایہ، جلد نمبر ۳، ص ۶۸۵ـ ۶۸۴، دار الفکر۔بیروت)

(۲) اسی طرح ہمارے قدیم فقہاء کا خیال تھا کہ کان سے جوفِ دماغ تک منفذ ہے، لہٰذا انہوں نے مسئلہ مستنبط کیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، لیکن اب ماہرینِ علم تشریح الاعضاء (Anatomist) نے بتایا کہ کان سے جوفِ معدہ یا دماغ تک کوئی منفذ (Route) نہیں ہے، میں تقریباً تین سال سے اس مسئلے پر اخبارات ورسائل میں لکھ رہا ہوں کہ اس قدیم مسئلے کی تصحیح ہونی چاہئے۔گزشتہ سال دار العلوم کراچی کے علماء نے الحمدللہ بالاتفاق اسے تسلیم کرلیا کہ کان میں دوا یا تیل ٹپکانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔لہٰذا ہمیں ''رویتِ ہلال'' کے مسئلے پر بھی ماہرین موسمیات وفلکیات کے علم سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے، لیکن اس کی حدود کیا ہوں، یہ آئندہ سطور میں ملاحظہ فرمائیے گا، پہلے رسول اللہ ﷺ کے یہ صریح ارشادات ملاحظہ کیجئے:

لاتصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه

''جب تک چاند نہ دیکھ لو، روزہ نہ رکھو (یعنی آغازِ رمضان نہ کرو) اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر روزہ (رمضان) نہ چھوڑو''۔

لاتصوموا حتی تروا الهلال ولاتفطروا حتی تروه فان غم عليكم فاقدروا له۔

''اور (رمضان کا) چاند دیکھے بغیر روزہ (رمضان) شروع نہ کرو اور (شوال کا) چاند دیکھے بغیر (رمضان کا) روزہ نہ چھوڑو، اگر مطلع ابر آلود ہو (اور چاند نظر نہ آئے) تو تیس کا مہینہ پورا کرو''۔

صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم عليكم فاكملوا عدة شعبان

ثلاثين۔

''(رمضان کا چاند) دیکھ کر روزہ (رمضان) شروع کرو اور (شوال کا) چاند دیکھ کر اختتامِ رمضان کرو، اگر تم پر مطلع ابر آلود ہو جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو، (مشکوٰۃ المصابیح باب رؤیۃ الہلال)''۔

یہ احادیثِ مبارکہ رویتِ ہلال کے بارے میں ''تشریعی نصوص'' ہیں اور ہم شرعاً ان پر عمل کے مکلف ہیں، لہٰذا ہر قمری مہینے کا آغاز ''رویتِ ہلال'' پر ہی مبنی ہوگا، محض ماہرینِ فلکیات کی رائے پر فیصلہ نہیں ہوگا، تاہم ''شہادتِ رویت'' کے ردّ وقبول میں ان کی رائے سے استفادہ کیا جائے گا، کیونکہ علی الاطلاق کوئی بھی شہادت حجت لازمہ وملزمہ نہیں ہوتی۔

چاند تو مطلع ومدار پر ہر وقت موجود ہے، لیکن قمری ماہ کی 29 تاریخ کو اگلے ماہ کا چاند نظر آنے یا نہ آنے کے حوالے سے ماہرین فلکیات کے معیارات امکانِ رویت کے اعتبار سے متعین ہیں، قمری مہینے کی 29 تاریخ کو چاند کا ظہور ونمود اگر ہے تو اسے اصطلاحاً پیدائش (Birth) سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ چاند ویسے تو ہمیشہ موجود رہتا ہے، معدوم کبھی نہیں ہوتا، لیکن زیر بحث مسئلہ اس کے مطلع پر ظہور ونمود سے متعلق ہے۔لیکن بعض اوقات (Birth Of Moon) کے باوجود امکانِ رویت (Visibility) نہیں ہوتا، اس کے لئے چاند کی عمر، درجہ، غروبِ آفتاب کے بعد اس کی مدتِ حیات، زاویہ وغیرہ، کئی Parameters ہیں۔ان کی روشنی میں کبھی ''امکانِ رویت'' بالکل نہیں ہوتا، کبھی بالکل نمایاں اور واضح ہوتا ہے اور کبھی خفیف سا ہوتا ہے کہ نظر آ بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

میں بحیثیت چیئر مین مرکزی رویتِ ہلال کمیٹی پاکستان اور ہمارے اراکین جب امکانِ رویت بالکل نہ ہو اور شہادت آجائے تو اسے دقتِ نظر سے پرکھتے ہیں اور بالآخر وہ خود ہی رجوع کرلیتا ہے، جب امکانِ رویت خفیف یا خفیف ترین ہو تو بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں اور الحمدللہ گزشتہ دو سالوں سے پاکستان میں یہ مسئلہ متفقہ طور پر حل ہو رہا ہے اور عیدین یا اعیادِ متعددہ کی روایت دم توڑ رہی ہے، بس اس میں تھوڑی سی استقامت اور عزیمت کی ضرورت ہے۔یہاں میں یہ بھی عرض کردوں کہ میں گزشتہ پچیس سال سے کسی نہ کسی حیثیت سے ''رویت ہلال'' کے نظام سے متعلق رہا ہوں، ہمیں محکمۂ موسمیات سپارکو اور بعض اوقات نیوی کے ماہرین کی خدمات میسر ہوتی ہیں، لیکن آج تک ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ باہر کھلی آنکھ (Naked Eye) چاند نظر

نہ آیا ہو اور صرف دوربین سے نظر آیا ہو، چاند جب مطلع پر قابل دید (Visible) ہوتا ہے تو دوربین سے بھی نظر آتا ہے اور کھلی آنکھ سے بھی نظر آتا ہے۔

یو۔کے استفتاء میں جو یہ مسئلہ اٹھایا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ''رویت'' سے مراد علم ہے اور جب سائنسی یا کسی اور ذریعے سے علم حاصل ہو جائے تو قضاءِ شرعی کے لئے اس پر اکتفاء کر لیا جائے۔اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ یہ رائے ''اصولِ دین'' سے ناواقفی پر مبنی ہے، اصولِ فقہ کا مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے حقیقی معنیٰ متروک یا متعذر نہ ہوں، اسے حقیقت پر ہی محمول کیا جائے گا۔اور الحمدللہ! حدیث مبارک ''صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته'' میں ''رویت'' کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، اور قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں ہے، لہٰذا حقیقی معنیٰ سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے اور ثبوت رویت کے لئے ''قضاءِ شرعی'' کا مدار رویت پر ہی ہوگا۔

استفتاء و استفسار کا ایک نکتہ یہ ہے کہ رصدگاہوں (Observatories) اور ماہرین فلکیات کے اعتبار سے سعودی عرب کے اعلانات رمضان المبارک اور حج کے بارے میں گذشتہ کئی مواقع پر غلط اور خلاف واقع ہوئے ہیں، یہ بات فی نفسہٖ درست ہے، گذشتہ دو سال سے تو سائنسی اعتبار سے ایسے مواقع بھی آئے کہ پورے عالم میں یا اکثر عالم میں آغازِ رمضان و عید الفطر اور یوم الحج ایک ساتھ متوقع تھا، لیکن اس کے برعکس وہاں سے فیصلے کا اعلان ہوا اور اس پر عملدرآمد بھی ہوا۔

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ ''شہادتوں'' کے ردّ و قبول میں احتیاط سے کام نہ لیتے ہوں اور جدید ذرائع علم کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہوں، ہم ان کی نیت پر تو شبہ نہیں کرتے، کیونکہ ہم ''ظنوا المؤمنين خيراً'' کے مکلف ہیں۔تاہم جو شخص، اشخاص اور ادارے بدنیتی یا دانستہ تساہل کا ارتکاب کریں گے تو وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں گے۔لیکن اس فیصلے پر جو عامۃ المسلمین عمل کریں گے، وہ اپنی عبادات کے لئے انشاء اللہ اجرِ آخرت سے محروم نہیں رہیں گے۔کیونکہ قضاء قاضی اپنی حدود میں نافذ اور مؤثر ہوتی ہے، اور سعودی عرب کی رویت ہلال کمیٹی وہاں کی حکومت کی جانب سے ان کے اپنے ملک کے لئے مامور ہے، پورے عالم اسلام یا عالم پر حکمرانی کے لئے وہ حکومت خود مختار و مجاز نہیں ہے تو اس کا قائم کردہ ایک ذیلی ادارہ کیسے مجاز ہو سکتا ہے۔جہاں تک واقع اور حقیقت کے خلاف قضاء قاضی کے مؤثر اور نافذ ہونے کا تعلق ہے تو شیخ

الاسلام علامہ برہان الدین المرغینانی لکھتے ہیں:

ومن رأى هلال الفطر وحده ولم يفطر احتياطاً وفي الصوم الاحتياط في الايجاب

''اور اگر کسی شخص نے تنہا ہلال عید (یعنی شوال کا چاند) دیکھا (اور اس کی شہادت قاضی نے قبول نہیں کی) تو وہ خود بھی احتیاطاً روزہ رکھے اور ہلالِ رمضان میں احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اتباع امام کو واجب قرار دے''۔

(ہدایہ اولین: ج ۱ ص ۳۹۶، مطبوعہ محمد علی کارخانہ کتب، کراچی)

اور علامہ علاؤالدین حصکفی لکھتے ہیں:

(رأى) مكلف (هلال) رمضان او الفطر و رد قوله بدليل شرعي صام مطلقاً وجوباً، وقيل ندباً

''اور اگر ایک عاقل و بالغ مسلمان نے رمضان یا شوال کا چاند دیکھا اور (قاضی نے) دلیل شرعی سے اس کا قول رد کر دیا تو (اتباعِ قاضی میں) اس پر مطلقاً (یعنی ہلال رمضان ہو یا ہلالِ عید) روزہ رکھنا واجب ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مستحب ہے''۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

لو صام رائى هلال رمضان واكمل العدة لم يفطر الا مع الامام لقوله عليه السلام صومكم يوم يصومون وفطركم يوم يفطرون (رواه الترمذي وغيره).

''اگر کسی شخص نے ہلالِ رمضان دیکھ کر رمضان شروع کیا اور اس (کے روزوں) کی گنتی (تیس) پوری ہوگئی، (مگر امام کے حکم پر ہلالِ عید کا اعلان نہیں ہوا) تو وہ امام کے بغیر تنہا روزۂ رمضان نہ چھوڑے (یعنی عید نہ منائے) کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان ہے: جس دن (اتباعِ امام میں) قوم کا روزہ ہو تو تم بھی روزہ رکھو اور جس دن (اتباعِ امام میں) قوم عید منائے اور روزہ چھوڑ دے تو تم بھی ایسا ہی کرو''۔

البتہ علامہ شامی نے بدائع الصنائع کے حوالے سے لکھا ہے کہ علماء محققین کا قول یہ ہے کہ اپنے مشاہدے کے برعکس امام کی اتباع واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، آگے چل کر ''مبسوط'' کے

حوالے سے لکھتے ہیں کہ بصورتِ رمضان واجب ہے اور بصورتِ عید اتباعِ امام مستحب ہے۔

(ردالمحتار: ج ۳ ص ۳۱۵-۳۱۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)

جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، اس میں خطاء اجتہادی پر مبنی قاضی کا فیصلہ ظاہراً نافذ تو ہو جاتا ہے، لیکن یہ فیصلہ حقیقتِ واقعہ کو تبدیل نہیں کرتا، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

انکم تختصمون الی ولعل بعضکم ان یکون الحن بحجتہ من بعض فاقضی لہ علی نحو مما اسمع منہ فمن قطعت لہ من حق اخیہ شیأ فانما اقطع لہ بہ قطعۃ من النار۔

"تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کے بہ نسبت زیادہ مؤثر دلائل کے ساتھ پیش کرنے کی مہارت رکھتا ہو اور اس سماعت کے اعتبار سے (بالفرض) میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں، تو جس شخص کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے (خلافِ حقیقت) کچھ دے دوں تو (وہ چیز اس کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ اسے سمجھنا چاہئے کہ) میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں"۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۳۵۹)

اب ہم اس تفصیلی اور مدلل بحث کے بعد آپ کے سوالات کا ترتیب وار جواب خلاصہ کلام کے طور پر دے رہے ہیں اس میں بعض امور کا تکرار ناگزیر ہے اس لئے اس سے طبیعت پر بار محسوس نہیں کیجئے گا۔

1- سعودی عرب کا اعلان رویت مملکت سعودی عرب میں نافذ العمل ہے، دوسرے ممالک ان کی رویت کا تحقیقی جائزہ لے کر کہ آیا ان کا فیصلہ شرعی قواعد وضوابط کے مطابق ان کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں، ان کے فیصلہ کو قبول یا رد کر سکتے ہیں۔

2- آبزرویٹری کی وہ معلومات جو بدیہی ہیں، ان سے رویتِ ہلال میں استفادہ ممکن ہے۔ اگر چاند افق پر موجود ہو اور چاند نظر نہ آئے تو فیصلہ حساب پر نہیں بلکہ رویت پر ہوگا۔ تاہم چاند افق پر موجود نہ ہو اور رویت کی شہادت آ جائے تو اس پر دقتِ نظر سے غور کرنا چاہئے، کیونکہ اس صورت میں آنکھیں بند کر کے شہادت قبول کرنے سے امتِ مسلمہ کی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ پاکستان کی رویت ہلال کمیٹی اس شہادت کو قبول نہیں کرتی جو واقع کے خلاف ہو، یعنی چاند افق پر موجود ہی نہ

ہو اور رویت کی شہادت آ جائے تو اس شہادت کو قاضی کے شرح صدر کے منافی سمجھ کر تسلیم نہیں کیا جاتا، کیونکہ کوئی بھی شہادت علی الاطلاق حجت لازمہ وملزمہ نہیں ہوتی۔ چاند کا نظر آنا اگر بہت مشکل ہو لیکن موجود ہو تو اس وقت شہادتوں پر فنی قواعد کی روشنی میں بھرپور جرح سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ آیا واقعی دعویٰ کرنے والے نے چاند دیکھا ہے یا اس کو سہو ہوا ہے (سہو کی نظیریں آثار صحابہ میں موجود ہیں)، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے چاند دیکھا ہے تو اس کو پھر تسلیم کیا جاتا ہے ورنہ نہیں۔ سوال کے دوسرے حصے کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر پہلے سوال کا جواب معلوم ہو تو اس سے فائدہ اٹھا کر نہ تو اس مسلمان ملک کے ساتھ الجھے، نہ ہی ان کا فیصلہ اپنے اوپر لاگو کرنا ضروری ہے۔

3- یہ تجویز ہرگز قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ شرعاً رات غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے، اس لئے جو چاند غروبِ آفتاب سے پہلے دیکھے وہ معتبر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ چاند کے نظر آنے کے لئے Birth Of Moon کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کی اتنی عمر ہونی چاہئے جس سے یہ نظر آنے کے قابل (Visible) ہو جائے۔ پس رات کے 12 بجے Birth Of Moon پر چاند کے کیم کا فیصلہ ہونے لگے تو اس سے اصل رویت سے یقیناً ایک دن کا فرق پڑ جائے گا کیونکہ ماہرین فن کے نزدیک چاند کو نظر آنے کے لئے تقریباً 17 گھنٹے کی عمر درکار ہوتی ہے جبکہ غروبِ آفتاب اور رات کے 12 بجے میں اوسطاً 6 گھنٹے کا فصل ہوتا ہے۔ اس طرح 17 اور 6 گھنٹے مل کر 23 بن جاتے ہیں جو کہ تقریباً ایک دن کے برابر ہے۔ امت کا اتحاد بہت ضروری ہے، لیکن جب خلافِ حقیقت امر پر اتحاد ممکن ہی نہیں تو ایسے اتحاد کی کوشش مزید انتشار کا باعث ہوگا۔ جہاں تک مذکورہ موقف کا دوسرا دعویٰ ہے تو اس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے:

صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلثین

"یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو اور اگر آپ کے سامنے آڑ (غم) ہو جائے تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرو"۔

اب آپ ﷺ کے دور میں علم فلکیات وموسمیات میں انسان کے پاس وہ علم، تجربہ، مشاہدہ اور آلات نہیں تھے جو آج دستیاب ہیں، لہٰذا یہ ادعاء بالکل باطل ہے کہ حدیث شریف میں

''رویت''، علم کے معنیٰ میں ہے، جبکہ آج کل کے حالات میں چاند کے علم میں 'غُمّ'' ممکن نہیں۔ کیونکہ اب چاند کا ایک سیکنڈ کی غلطی کے بغیر ٹھیک ٹھیک (Accurate) حساب مرتب ہو چکا ہے، لیکن ہم جدید علوم، تجربے، مشاہدے اور آلات کی مدد سے منشائے کتاب وسنّت کو صحت کے اعلیٰ معیار پر حاصل کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں، لیکن اسے باطل کرنے کی جسارت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہ قطعی طور پر طے ہے کہ رویت سے مراد ''رویت علمی'' ''نہیں'' بلکہ ''رویت بصری'' ہے، کیونکہ اصول فقہ کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب تک کسی لفظ کے معنیٰ حقیقی متروک یا متعذر نہ ہوں ،تو حقیقت پر ہی عمل ہوگا اور الحمدللہ! حدیث مبارک...... صوموا لرؤيته وافطروا لرؤيته...... میں رویت کا حقیقی معنیٰ قرنِ اوّل سے آج تک معمول بہ بھی ہے، قابل عمل بھی ہے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی تعذر بھی نہیں، لہٰذا معنیٰ حقیقی سے عدول کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے۔ اس لئے ثبوت رویت کے لئے قضاءِ شرعی کا مدار رویت عینی پر ہی ہوگا۔

اگلے سوال کا جواب بھی اس میں آ گیا کہ صرف چاند کی پیدائش یا سورج غروب ہونے کے وقت چاند کا وجود فیصلہ کن نہیں بلکہ چاند کی رویت ضروری امر ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق کسی مشہور محقق نے رویت ہلال کا یہ مفہوم نہیں لیا جس کا اس سوال میں ذکر ہے، امت کے اتحاد پر پہلے بات ہو چکی ہے۔ امت مسلمہ کا اتحاد غیر منطقی بنیادوں پر ممکن ہی نہیں اس لئے اس کی کوشش فضول اور تضیع اوقات کا باعث ہے۔

ہم ایک اسلامی ملک کے شہری تو ہیں لیکن سعودی اتھارٹیز اور اداروں کے سامنے ہماری جانب سے بعض مسائل اٹھانے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، حکومتی سطح پر بعض مصلحتیں بھی رکاوٹ بن جاتی ہیں، سفارتی حساسیت (Diplomatic Sensitivity) اور تیل پیدا کرنے والے اسلامی ممالک کا اپنی وافر دولت پر زعم بھی ایک وجۂ بے اعتنائی ہے۔ لیکن آپ مغرب میں ہیں، مغرب سے اٹھنے والی آواز پر وہ کان ضرور دھرتے ہیں کیونکہ ان کی سلطنت واقتدار کی بقاء ان کی مرہون منت ہے۔ لہٰذا آپ علماء اور ماہرین فلکیات کا ایک وفد مرتب کر کے پہلے جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے ثقہ علماء، میں اس مسئلے پر اجماع کلی یا اکثری (Consensus)، جیسا بھی حالات کے تحت ممکن ہو، پیدا کرنے کی کوشش کریں، پھر دیگر ممالک ایشیاء، افریقہ وعالم عرب سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اس میں شریک کریں۔ اس کے بعد ایک وقیع وفد ترتیب دے کر سعودی سفیر

سے ملاقات کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کریں اور ان کے توسط سے اس مسئلے پر اپنے افکار وخیالات سے سعودی وزارت خارجہ و وزارت اوقاف و مذہبی امور تک پہنچائیں اور آخری مرحلے میں سعودی علماء، ماہرین فلکیات وموسمیات اور سیاسی قیادت سے براہِ راست مذاکرات کریں۔ یہ تمام عمل بلاشبہ بڑا صبر آزما اور جہد مسلسل وسعی پیہم کا متقاضی ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ بالآخر یہ ثمر آور اور نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان اور زونل رویت ہلال کمیٹیوں میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء شامل ہیں اور پورا ملک اس کے فیصلے کو تسلیم کرتا ہے، آپ بھی ایسی کمیٹی تشکیل دے سکتے ہیں۔

عید الفطر خوشی اور شکر کا دن ہے

عید کا تاریخی پس منظر، عظمت اور فلسفہ

روح کی لطافت، قلب کے تزکیہ، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار وبغایت خشوع وخضوع تمام مسلمانوں کا اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانہ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

لفظ عید کے معنی اور وجہ تسمیہ

عید کا لفظ عود سے ماخوذ ہے جس کے معنی لوٹنا ہے۔ چونکہ یہ دن مسلمانوں پر بار بار لوٹ کر آتا ہے، اس لئے اس کو عید کہتے ہیں (بحوالہ لسان العرب مصنف علامہ ابن منظور افریقی) ابن العربی نے کہا کہ عید کو 'عید' اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دن ہر سال مسرت کے ایک نئے تصور کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مسرت اور خوشی کے دن کو عید، نیک شگون کے طور پر کہا جاتا ہے تاکہ یہ دن ہماری زندگی میں بار بار لوٹ کر آئے، جس طرح ''قافلہ'' کے معنی ہیں ''لوٹ کر آنے والا'' اہل عرب قافلہ کو بھی نیک شگون کے طور پر قافلہ کہتے ہیں، گویا اس کے پیچھے یہ آرزو اور تمنا کارفرما ہوتی ہے کہ جس مقصد کے لئے جا رہا ہے، اس میں کامیاب وکامران ہو کر عافیت اور سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر واپس آ جائے۔ چونکہ رب تبارک وتعالیٰ اس دن اپنے مقبول اور عبادت گزار بندوں پر اپنی اَن گنت نعمتیں اور برکتیں لوٹاتا ہے اس لئے اسے عید کہتے ہیں۔

عید، انسانی فطرت کا تقاضہ

سال میں چند ایام جشن، تہوار اور عید کے طور پر دنیا کی تمام اقوام وملل اور مذاہب میں منائے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر قوم، مذہب وملت کے لوگ اپنے ایام عید کو اپنے اپنے عقائد، تصورات، روایات اور ثقافتی اقدار کے مطابق مناتے ہیں، لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہوتی ہے کہ تصورِ عید انسانی فطرت کا تقاضہ اور انسانیت کی ایک قدر مشترک ہے۔ مسلمان قوم چونکہ اپنی فطرت، عقائد ونظریات اور ملی اقدار کے لحاظ سے دنیا کی تمام اقوام سے منفرد وممتاز ہے۔ اس لئے اس کا عید منانے کا انداز بھی سب سے نرالا ہے، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اور اقوام کی عید محافل ناؤنوش ورقص وسرود بپا کرنے، دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں کھو جانے، مادر پدر آزاد ہوکر بدمستیوں میں ڈوب جانے، تمام اخلاقی اقدار کو تج دینے، نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کو فروغ دینے اور "آج یا پھر کبھی نہیں" کے مصداق ہوسِ نفس کا اسیر بن جانے کا نام ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روح کی لطافت، قلب کے تزکیے، بدن ولباس کی طہارت اور مجموعی شخصیت کی نفاست کے ساتھ بصد عجز وانکسار وخشوع وخضوع تمام مسلمانوں کے اسلامی اتحاد واخوت کے جذبے سے سرشار ہوکر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ بندگی اور نذرانۂ شکر بجالانے کا نام عید ہے۔

قرآن مجید میں ذکرِ عید

قرآن مجید میں سورۂ مائدہ آیت: ۱۱۴ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا کے حوالے سے عید کا ذکر موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ أَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُونُ لَنَا عِيدًا لِّأَوَّلِنَا وَآخِرِنَا وَآيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ

"عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے اللہ! ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار دے (اور اس طرح اس کے اترنے کا دن) ہمارے لئے اور

ہمارے اگلوں، پچھلوں کے لئے (بطور) عید (یادگار) قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور ہمیں رزق عطا فرما اور تو بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے"۔

اس سے اگلی آیت میں ارشاد خداوندی ہے:

قَالَ اللّٰهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّيْٓ أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّآ أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (المائدہ:115)

"اللہ نے فرمایا کہ میں یہ (خوان) تم پر اتار تو دیتا ہوں مگر اس کے بعد تم میں سے جو کفر کرے تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا جو سارے جہانوں میں اور کسی کو نہ دیا ہو"۔

رہا یہ سوال کہ دعائے عیسیٰ علیہ السلام کے نتیجے میں ان کی قوم پر یہ خوان اترا یا نہیں، قرآن نے اس سلسلے میں سکوت اختیار فرمایا ہے، البتہ تفاسیر میں دونوں طرح کی روایات موجود ہیں۔ ہمارے زیرِ بحث موضوع سے جو بات متعلق ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کے مسرت کے دن کا قرآن نے عید کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور جو دن کسی قوم کے لئے اللہ کی کسی خصوصی نعمت کے نزول کا دن ہو، وہ اس دن کو اپنا یوم عید کہہ سکتی ہے۔

عیدِ میلادِ مصطفیٰ کا ثبوت ایک لطیفہ پیرائے میں

مفسر قرآن مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہ نے قرآن مجید کے اپنے تفسیری حاشیے "خزائن العرفان" میں اس مقام پر ایک لطیف نکتہ آفرینی کی ہے۔ وہ یہ کہ جب اللہ کی خصوصی نعمت کے نزول کا دن عید قرار پا سکتا ہے اور قرآن ایک طرح سے اس کی توثیق کر رہا ہے تو اگر امتِ محمد ﷺ اللہ کی نعمتِ عظمیٰ محمد ﷺ کی ولادت باسعادت کے دن کو ایک عید کے طور پر منائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہئے۔

اسلام میں عید کا آغاز

خالص اسلامی فکر اور دینی مزاج کے مطابق اسلامی تمدن، معاشرت اور اجتماعی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں عیدین کا مبارک سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس کا تذکرہ سنن ابی داؤد کی مندرجہ ذیل حدیث میں ملتا ہے۔ "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ دو دن بطورِ تہوار منایا کرتے تھے جن

میں وہ کھیل تماشے کیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا "یہ دو دن جو تم مناتے ہو، ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟" (یعنی ان تہواروں کی اصلیت اور تاریخی پس منظر کیا ہے؟) انہوں نے عرض کیا کہ ہم عہدِ جاہلیت میں (یعنی اسلام سے پہلے) یہ تہوار اسی طرح منایا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے تمہارے ان دونوں تہواروں کے بدلے میں تمہارے لئے ان سے بہتر دو دن مقرر فرما دیئے ہیں، یوم (عید) الاضحیٰ اور یوم (عید) الفطر۔"

غالباً وہ تہوار جو اہل مدینہ اسلام سے پہلے عہدِ جاہلیت میں عید کے طور پر منایا کرتے تھے وہ "نوروز" اور "مہرجان" کے ایام تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تہوار منانے سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلے میں اپنے خصوصی انعام و اکرام کے طور پر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے مبارک ایام مسلمانوں کو عطا فرمائے ہیں۔

عید کے ایام کو مقرر کرنے کی حکمت

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کر دیا کہ نوروز اور مہرجان کے انہی تہواروں کی اصلاح فرما دیتے اور ان میں جو رسوم شرعی اعتبار سے منکرات کے زمرے میں آ سکتی تھیں، ان کی ممانعت فرما دیتے اور اظہارِ مسرت کی جو جائز صورتیں تھیں وہ اختیار کرنے کی اجازت دے دیتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں اللہ کی حکمت کارفرما تھی۔ دراصل ہر چیز کا ایک مزاج اور پس منظر ہوتا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کریں کسی چیز کو اس کے تخلیقی مزاج اور تاریخی پس منظر سے جدا نہیں کر سکتے، لہٰذا جس چیز کی اساس کسی شر پر رکھی گئی ہو اس کی کانٹ چھانٹ اور بناؤ سنگھار سے کوئی خیر پر مبنی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا اور اسلام تو آیا ہی اس لئے ہے کہ کفر اور بدی کے اثرات کو مٹایا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسلامی معتقدات اور خالص دینی فکر اور شرعی مزاج کا تقاضہ یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق تمام جاہلی رسوم اور کافرانہ شعائر سے یکسر ختم کر دیا جائے تاکہ عہد جاہلیت کی تمام علامات سے کٹ کر ان میں صحیح دینی فکر پیدا ہو سکے۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس نے جہاں اپنے ماننے والوں کو لادینی نظریات سے محفوظ رکھا وہاں ان کے صحیح جبلی اور فطری تقاضوں کی آبیاری بھی کی، عید منانا انسانی فطرت کا

تقاضہ تھا لہٰذا مسلمانوں کو ایک کی بجائے عیدین کی دوہری نعمت عطا فرمائی۔

یوم عید کے مستحبات

عید کے دن یہ امور مستحب ہیں:

☆ حجامت بنوانا ☆ ناخن تراشنا ☆ غسل کرنا ☆ مسواک کرنا ☆ خوشبو لگانا ☆ اچھے صاف ستھرے یا دستیاب ہوں تو نئے کپڑے پہننا ☆ صبح کی نماز مسجد میں پڑھ کر عیدگاہ چلے جانا۔

عیدگاہ جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا

سنت یہ ہے کہ جس راستے سے عیدگاہ جائے، نماز پڑھ کر اس راستے کے بجائے دوسرے راستے سے گھر واپس جائے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے:

"حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عید کے دن نبی اکرم ﷺ (عیدگاہ آتے جاتے میں) راستہ تبدیل کرتے تھے۔"

اس کی متعدد حکمتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں: دونوں راستے نمازی کی عبادت اور ذکر پر گواہی دیں، دونوں راستوں پر اسلامی شعار کا اظہار ہو اور دونوں راستوں پر بے نمازیوں اور اللہ کی عبادت سے غافل رہنے والوں کو اپنے عمل سے یاد خدا کی طرف مائل کیا جائے۔

ون وے ٹریفک کا نظریہ

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک راستے سے جانے اور دوسرے راستے سے واپس آنے سے آنے جانے والوں کے لئے سہولت ہو، اژدہام اور بھیڑ میں کمی واقع ہو اور گزرگاہ تنگ نہ ہو۔ ہم بجا طور پر دنیا والوں کے سامنے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ نے جدید تمدن، معاشرت اور شہری زندگی کے مسائل کو اپنی تعلیمات کے ذریعے نہایت سہل انداز میں حل فرمایا ہے اور یہ کہ One Way Traffic کے اصولوں کے بانی ہمارے پیارے نبی ﷺ ہیں۔

عید نہ منانا

قوموں کی زندگی میں المیے، حوادث اور مصائب پیش آتے رہتے ہیں اور بدقسمتی سے گزشتہ

برسوں سے اس طرح کے المناک واقعات ہماری روزمرہ زندگی کا ایک معمول بن چکے ہیں۔ ایسے حوادث کے پیش نظر اکثر اوقات بعض افراد یا حلقوں کی جانب سے یہ سننے میں آتا ہے کہ اس سال ہم عید نہیں منائیں گے۔ اس طرح کے بیانات کے پیچھے یقیناً نیک نیتی' حب الوطنی، اخوتِ اسلامی اور انسانیت دوستی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ عید نہ منانے کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی جشن یا تہوار تو ہے نہیں، یہ تو عبادت اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ ہے، اخوتِ اسلامی اور اتحادِ امت کا مظاہرہ ہے، جمعیتِ قومِ مسلم کا ایک حسین منظر ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانہ نمازِ عید کی ادائیگی کا نام ہے۔ شرافت، متانت اور نفاست ایسی انسانی خصوصیات کا مظہر ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اور کوئی بات ایسی نہیں جو عسر و یسر اور رنج و راحت ہر حال میں منائے جانے کے قابل نہ ہو۔ باقی رہا لہو و لعب میں مشغولیت، رقص و سرود کی محافل برپا کرنا، ناؤ نوش اور محرماتِ شرعیہ کا ارتکاب اور ہوس نفس کی تسکین کے سامان بہم پہنچانا، یہ ایسے امور ہیں جن کا اسلامی تصورِ عید سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جو ایک مسلمان کو نہ صرف عید کے مقدس موقع پر بلکہ زندگی کے ماہ و سال کے ہر لمحہ و لحظہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں بلکہ ان محرمات و منکراتِ شرعیہ کو چھوڑنا ہی ایک مومن کامل کی حقیقی عید ہے اور ایسی عید اللہ تعالیٰ ہر بندۂ مومن کو نصیب فرمائے۔

{☆......☆......☆☆☆......☆......☆}

کتاب الحج

قرض لے کر حج کرنا

سوال: اگر کوئی مسلمان (مرد یا عورت) عمرہ یا حج کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس اس کے سفر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مکمل رقم نہیں ہے، جبکہ وہ عمرہ/حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، تو کیا وہ بغیر کسی سود وغیرہ کے قرض رقم حاصل کر کے کسی ادارے یا وسیلے سے وقتی طور پر عمرہ یا حج ادا کر سکتا ہے اور عمرہ/حج کی ادائیگی کے بعد یکمشت یا اقساط میں وہ لیا ہوا قرض ادا کر سکتا ہے۔

(عبدالمعید خان، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: حج کی شرائطِ وجوب میں سے ایک استطاعت ہے، اسے فتاویٰ عالمگیری نے ان کلمات سے تعبیر کیا ہے:

وَمِنهَا الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ

''اور ان (شرائطِ وجوب) میں سے ایک زادِراہ اور سواری پر قدرت ہے''۔

اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

و تفسير ملك الزاد والراحلة ان يكون لهٗ مالٌ فاضلٌ عن حاجته وهوماسوىٰ مَسكنهٖ و لبسه و خدمه واثاث بيته و ما يبلغه الىٰ مكة ذاهبا وجائيا راكبا لا ماشيا و سوى ما يقضي به ديونه ويمسك لنفقة عياله و مرمة مسكنه و نحوه الى وقت انصرافه، كذا في محيط السرخسي۔

''اور زادِراہ اور سواری کا مالک ہونے کی تفسیر یہ ہے کہ اس کے پاس حاجت (اصلیہ) سے زیادہ مال ہو، یعنی رہائش گاہ، لباس، خدام (اگر ہوں)، گھر کے ساز و سامان سے زائد اتنا مال جو اسے سواری پر نہ کہ پیدل مکہ تک آنے جانے کے لیے کافی ہو اور گھر واپسی تک قرض کی ادائیگی (اگر کوئی ہو) اہل و عیال کے نان نفقہ اور مکان کی مرمت کی ضروریات سے بھی فاضل ہو، محیط سرخسی میں اس طرح ہے''۔

(عالمگیری جلد نمبر ۱ صفحہ ۲۱۷)

لہٰذا کوئی مسلمان اس امر کا مکلف نہیں ہے کہ قرض لے کر فریضۂ حج ادا کرے اور اگر اس کے پاس حاجاتِ اصلیہ سے فاضل اتنا مال نہیں ہے کہ مصارفِ سفرِ حج برداشت کر سکے تو شرعاً اس پر حج فرض نہیں ہے لیکن اگر کوئی مسلمان "صاحبِ استطاعت" نہ ہونے کے باوجود قرض لے کر یا کسی بھی طریقے سے حج ادا کر لیتا ہے تو اس کا فریضۂ حج یعنی "حجۃ الاسلام" ادا ہو جائے گا۔ فتاویٰ عالمگیری ۱/۲۱۷ پر ہے:

الفقیر اذا حج ماشیا ثم ایسر لا حج علیه هکذا فی فتاوی قاضی خان

"فقیر نے جب پیدل حج کر لیا ہو، پھر مالدار ہو جائے تو اب اس پر (دوبارہ) حج کی ادائیگی فرض نہیں ہے"۔

فتاویٰ شامی ۳/۴۰۶ مطبوعہ "داراحیاء التراث العربی" بیروت میں ہے:

تنبیه! الفقیر الا فاقی اذا وصل الیٰ میقات فهو کالمکی۔

تنبیہ: فقیر آفاقی (یعنی جو حدودِ میقاتِ حج سے باہر کا رہنے والا ہے) جب میقاتِ حج پر پہنچ جائے تو وہ مکی کی طرح ہے (یعنی اب اس کے لیے صرف سواری اور زادِ راہ کی استطاعت ہی شرط ہے)۔

درمختار میں ہے:

لو لم یحج حتی اتلف ماله وسعه ان یستقرض و یحج۔

"اگر (کسی شخص پر حج فرض ہو گیا تھا، لیکن) اس نے حج نہ کیا یہاں تک کہ اس کا مال ضائع ہو گیا تو اس کے لیے اس امر کی گنجائش ہے کہ قرض لے کر حج کرے"۔

اس پر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مختار یہ ہے کہ اس کا ظنِ غالب یہ ہو کہ وہ کوشش کر کے قرض ادا کر سکے گا تو قرض لے کر حج کرے"۔ (فتاویٰ شامی ۳/۴۰۳)

آپ کے سوال میں تضاد ہے، ایک طرف تو آپ لکھتے ہیں کہ وہ حج و عمرہ کی استطاعت رکھتا ہے، دوسری جانب آپ لکھتے ہیں کہ اس کے پاس پوری رقم نہیں ہے تو اس لحاظ سے وہ صاحبِ استطاعت نہ ہوا۔ تاہم اگر اس نے قرض لے کر حج ادا کر لیا تو اس کا فریضۂ حج ادا ہو جائے گا، اسی طرح قرض لے کر عمرہ ادا کرنے میں بھی کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ استطاعت وجوبِ حج کے لیے شرط ہے، جواز کے لیے شرط نہیں ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے حج پر بھیجنا

سوال: ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ چند افراد فی کس 1000 روپے جمع کر کے قرعہ اندازی کے ذریعے کسی ایک یا چند افراد کو حج کی سعادت کے لئے بھیجا جائے اور اس عمل کو "حج ٹوکن اسکیم" کا نام دیا جائے کیا شریعت مطہرہ کی روشنی میں یہ عمل جائز ہے۔ علمی تحقیقی جواب دے کر ہماری راہنمائی فرمائیں۔ (چوہدری خالد ستار......نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

جواب: اگر یہ لوگ یہ کام لاٹری کے طور پر نہیں بلکہ سعادت اور عبادت کے طور پر اور حصولِ اجر وثواب کے لیے ایسا کریں۔ اور نیت یہ ہو کہ یہ رقم انہوں نے حج یا عمرہ کے لیے ہبہ کر دی ہے اور سب نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنا لیا ہے کہ وہ اس رقم کو اس نیک مصرف پر صرف کرے۔ اور قرعہ اندازی کے ذریعے کسی ایسے شخص کو حج یا عمرے کے لئے دے دے جو خود اس کی استطاعت نہیں رکھتا، اور اگر کچھ ایسے صالح اور دیندار نادار لوگوں کے نام بھی اس قرعہ اندازی میں شامل کر دیں، جنہوں کے خود اس پول میں حصہ نہیں ڈالا یا ہر ایک پر ایک معین رقم لازم کرنے کے بجائے اس کی گنجائش اور استطاعت پر چھوڑ دیں تو یہ مزید حسن نیت کا مظہر ہوگا۔ یہ لاٹری سے مختلف چیز ہے۔ لاٹری میں تو ایک کو سب رقم مل جاتی ہے اور باقی لوگوں کے حصے میں خسر الدنیا والاخرة یعنی دنیا اور آخرت کا خسارہ رہ جاتا ہے۔ اور جس کو سب رقم مل جاتی ہے، گناہ سب کے ساتھ اس کے حصے میں بھی آتا ہے۔ جبکہ سوال میں مذکورہ صورت میں اجرِ آخرت بقدرِ حصہ سب کو ملے گا۔ اور یہ سعادت وعبادت حج جس خوش نصیب کے حصے میں بھی آئے اس کے اجر میں انشاء اللہ العزیز سب شریک ہوں گے۔

ایامِ حج میں اگر عورت کے مخصوص ایام شروع ہو جائیں؟

سوال: اگر ایامِ حج میں عورت کے ایام شروع ہو جائیں اور اس کی واپسی کا شیڈول پہلے سے طے ہو اور تاریخ روانگی کو مؤخر کرنا اس کے بس میں نہ ہو تو پھر طوافِ زیارت کس طرح ادا کرے گی، کیونکہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں حرم میں داخل ہونا منع ہے۔

(عائشہ......اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: ہاں یہ درست ہے کہ حیض ونفاس اور جنابت کی حالت میں حرم میں داخل ہونا اور

طواف کرنا منع ہے اور طوافِ زیارت حج کا رکن ہے اور فرض ہے۔ اور بارہ ذوالحجہ تک طواف زیارت کرنا ضروری ہے، اگر بارہ ذوالحجہ تک طواف زیارت نہ کیا تو تاخیر کی بناء پر دم لازم آئے گا، دم اس صورت میں لازم آئے گا کہ جب تاخیر کا سبب بندے کی اپنی کوتاہی یعنی "تقصیر من جہت العباد" ہو۔ اور اگر تاخیر میں بندے کی کوتاہی کا کوئی دخل نہ ہو بلکہ قدرت کی طرف سے ہو تو دم لازم نہیں آئے گا، جیسے عورت کے لئے حیض کا شروع ہوجانا۔ طواف زیارت ادا کئے بغیر میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوں گے۔ اگر عورت کا حیض ایامِ حج میں شروع ہوجائے اور واپسی کے طے شدہ فلائٹ شیڈول کی وجہ سے اس کی روانگی لازمی ہو اور اس میں ردوبدل کی گنجائش نہ ہو تو وہ حالتِ حیض میں طواف کرلے اور حرم میں ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) دے دے اس طرح وہ حلال ہوجائے گی اور امید ہے کہ عذر و مجبوری کی بناء پر اللہ تعالیٰ حالتِ حیض میں طوافِ زیارت کی تقصیر کو معاف فرمائے گا۔

احرام باندھتے وقت عورت اگر حالتِ حیض میں ہو تو کیا کرے؟

سوال: اپنے میقات سے احرام باندھتے وقت یا مکۂ مکرمہ سے ۸/ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھتے وقت عورت حالتِ حیض میں ہو تو کیا کرے؟ (عائشہ، اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: عورت غسل کرکے احرام باندھ لے، نیت کرکے تلبیہ پڑھ لے تو وہ "مُحرِمہ" ہوجائے گی، احرام کے لئے نفل نہیں پڑھے گی۔ باقی حالتِ حیض میں وہ حج کے تمام اعمال ادا کرے گی، تلبیہ، تسبیح، اذکار و درود بھی پڑھ سکتی ہے۔ وقوفِ عرفہ، قیامِ مزدلفہ و منیٰ، رمی جمار اور قربانی وغیرہ تمام اعمال کرتی رہے گی، البتہ طواف، نماز اور تلاوت نہیں کرے گی۔

پانچ سال کے بچے کو عمرے پر لے جانا

سوال: پانچ سال کے بچے کو عمرے پر لے جانا کیسا ہے، کیا باقاعدہ احرام باندھنا پڑے گا، اگر اس کا احرام نہ باندھا تو کیا دم دینا پڑے گا؟ (کامران۔ دارالامان سوسائٹی)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ مقام روحاء میں ایک عورت نے اپنے بچے کو اٹھا کر پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! کیا اس کا بھی حج ہوجائے گا، آپ نے فرمایا: ہاں اور تم کو بھی اجر ملے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کا حج

ہوجائے گا۔ لیکن ائمہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ نفلی حج ہوگا اور بالغ ہونے کے بعد بصورتِ استطاعت اس پر جو "حجۃ الاسلام" فرض ہوگا، یہ اس کا بدل نہیں ہے اور اس سے وہ ساقط نہیں ہوگا، نیز جنایت پر بچے کے مال میں سے دم بھی نہیں ہوگا۔ پانچ سال کا بچہ مکلف نہیں ہے، نہ اس پر احرام لازم ہے اور نہ ترکِ احرام سے کوئی دم۔

آخری عشرے میں عمرے کی ادائیگی اور ابتداء شوال میں واپسی

سوال: بھائی آخری عشرے میں عمرے پر جارہے ہیں اور آٹھ شوال المکرّم کو واپسی ہوگی، کیا اس طرح ان پر حج فرض ہوجائے گا۔ (نورالدین جنیدی۔ ایف بی ایریا)

جواب: شوال المکرّم سے موسم حج شروع ہوجاتا ہے، اگر ان کے پاس پورے حج سیزن کے لئے مصارف ہیں اور موسم حج تک مزید قیام ممکن ہوسکتا ہے، قانون کی حدود میں رہتے ہوئے، تو ضرور حج کرکے واپس آئیں۔ لیکن اگر اس کے پاس ادائیگی حج کے لئے رقم نہیں ہے، یا اسے قانونی قیام کی اجازت مزید نہیں مل سکتی، اگر وہ مزید وہاں رہے گا تو خلافِ قانون ٹھہرے گا، اسے جیل میں ڈالا جاسکتا ہے، جبری خروج کرایا جاسکتا ہے، اس کی عزتِ نفس مجروح ہوسکتی ہے، تو وہ معذور ہے، واپس چلا آئے۔ اسلام میں قرآن کا ارشاد ہے:

"اپنے ہاتھوں سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔

عمرے کا احرام باندھا ہوا ہے فلائٹ پر سیٹ نہیں ملی

سوال: ایک شخص گھر سے عمرے کا احرام باندھ کر ایئرپورٹ گیا، وہاں جاکر جہاز پر سیٹ نہیں ملی، بورڈنگ کارڈ نہیں ملا اور احرام کھولنا پڑا تو اس پر کیا ہے۔؟ (نہال احمد۔ گلشن اقبال)

جواب: بہتر تو یہ ہے کہ وہ جہاز کی سیٹ ملنے تک حالتِ احرام میں رہے، گھر چلا آئے اور سیٹ کنفرم ہونے پر روانہ ہوجائے۔ اگر احرام کھول دیا تو اس پر دم واجب ہے۔ اور عازمین حج و عمرہ کے لئے مشورہ یہ ہے کہ وہ گھر سے غسل کرکے لباس احرام پہن کر چلے جائیں، جب سیٹ کنفرم ہوجائے اور بورڈنگ مل جائے تو دو رکعت نفل پڑھ لیں۔ اور جب فلائٹ روانہ ہوجائے تو نیت باندھ لیں اور تلبیہ پڑھ لیں، ورنہ بصورتِ دیگر واپس آجائیں اور نارمل لباس پہن لیں، چونکہ وہ مُحرِم نہیں ہوئے تھے، اس لئے ان پر کچھ واجب نہیں ہوگا۔

كتاب الاضاحى

(قربانی کے مسائل)

اگر ایامِ قربانی میں قربانی نہ کی ہو؟

سوال: ایسا مالدار شخص جس پر شرعاً قربانی واجب ہے اگر ایامِ قربانی میں قربانی نہ کر سکے تو کیا بعد میں کر سکتا ہے؟ (محمد عرفان الملانی۔ پاکستان چوک، کراچی)

جواب: قربانی ان عبادات میں سے ہے جن کے لئے شریعت نے دن مقرر کر رکھے ہیں جیسے حج کا رکنِ اعظم وقوفِ عرفہ صرف ۹ رذوالحجہ ہی کو ہو سکتا ہے، اسی طرح قربانی کے لئے ۱۰ رذوالحجہ کی صبح صادق سے ۱۲ رذوالحجہ کے غروبِ آفتاب تک کا وقت مقرر ہے، جہاں نمازِ عید ہوتی ہے وہاں ۱۰ رذوالحجہ کو نمازِ عید سے قبل قربانی ادا نہیں ہوگی، ۱۰۔۱۱ اور ۱۱۔۱۲ کی درمیانی راتوں میں قربانی کی تو واجب ادا ہو جائے گا لیکن رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ ۱۰ رذوالحجہ سے پہلے اور ۱۲ رذوالحجہ کے بعد قربانی کی تو ادا نہیں ہوگی اور صاحبِ نصاب کے ذمے سے واجب ساقط نہیں ہوگا۔ تاہم اگر کسی نے بدقسمتی سے استطاعت کے باوجود ایامِ قربانی میں قربانی نہیں کی تو قربانی کے دن گزرنے کے بعد وہ رقم صدقہ کر دے، اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایامِ قربانی میں کوئی شخص قربانی کرنے کے بجائے رقم صدقہ کر دے تو کیا قربانی کا اجر ملے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو قربانی کا اجر ملے گا اور نہ ہی قربانی کا واجب ساقط ہوگا۔ البتہ جس قدر رقم صدقہ کی ہے اس کا ثواب مل جائے گا اور واجب قربانی ترک کرنے کا گناہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایامِ قربانی میں انسان کا کوئی بھی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک جانور کا خون بہانے (یعنی قربانی) سے زیادہ محبوب نہیں ہے اور یہ قربانی کا جانور قیامت کے دن (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گا اور یہ کہ ذبح کے وقت (قربانی کے جانور کا بہنے والا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مرتبۂ قبولیت کو پالیتا ہے، تو (اے مومنو!) خوش دلی سے قربانی کیا کرو"۔

(مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ)

خصی جانور کی قربانی کا حکم

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ چونکہ عیب دار جانور کی قربانی شرعاً جائز نہیں ہے اور نر جانور کا خصی ہونا ایک نقص اور عیب ہے لہٰذا خصی جانور کی قربانی جائز نہیں، اس بارے میں شرعی حکم بیان کیجیے؟ (سید عمیر الحسن برنی۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: بلاشبہ قربانی کے جانور کا عیب سے پاک ہونا شرعاً ضروری ہے اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں ہے۔ مثلاً جس کے تھن کٹے ہوئے ہوں، سینگ جڑ سے ٹوٹے ہوئے ہوں، کان تہائی سے زائد کٹا ہوا ہو، لنگڑا ہو، کانا ہو وغیرہ۔ عیب سے مراد وہ عیب ہے جو تاجروں کے نزدیک عیب شمار ہوتا ہو اور قیمت میں کمی کا باعث ہو۔ خصی ہونا، تاجروں کے نزدیک عیب نہیں ہے بلکہ خصی جانور کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اور سنت سے بھی خصی جانور کی قربانی ثابت ہے۔ سنن ابی داوٗد میں حدیث ہے: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قربانی کے دن رسول اللہ ﷺ نے دو خوبصورت سینگوں والے خصی مینڈھے ذبح فرمائے۔'' البتہ جو شخص افزائش نسل کے لئے حلال نر جانور خریدنا چاہتا ہے تو اس کے نزدیک اس کا خصی ہونا ضرور عیب ہوگا۔

سات سے کم افراد گائے کی قربانی میں مساوی طور پر شریک ہو سکتے ہیں؟

سوال: کیا ایک گائے میں سات سے کم افراد شریک ہو کر قربانی کر سکتے ہیں اور یہ شرعاً جائز ہے؟ (حبیب الرحمٰن، آزاد کشمیر)

جواب: قربانی اصولی طور پر ''اراق الدم'' یعنی خون بہانے اور جانور کو عبادت کی نیت سے اللہ کے نام پر قربان کرنے کا نام ہے، اور یہی قربانی دراصل عبادت ہے، اب ''اراق الدم''، یعنی جانور کا خون بہانا جو درحقیقت اس کی جان تلف کرنا ہے، یہ ایک جان ایک اکائی (Unit) ہے۔ اور اس کی تجزی (یعنی اجزاء میں تقسیم) نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گائے میں سات حصوں کی اجازت دے دی ہے اور شارع مختار ہیں، اس لئے استحساناً خلاف قیاس گائے کی قربانی سات افراد کی جانب سے جائز ہے بشرطیکہ سب کی نیت عبادت اور ''تقرب الی اللہ'' کی ہو۔ اور جب گائے یا اونٹ میں سات افراد کی شرکت مساویانہ طور پر جائز ہے تو سات سے کم افراد (مثلاً چھ، پانچ، چار، تین، دو) کی بطریقِ اولیٰ جائز ہے، بشرطیکہ سب کا حصہ مساوی ہو۔

البتہ سات سے زائد افراد (مثلاً آٹھ یا نو) کی ایک گائے میں شرکت جائز نہیں ہے۔ ایک آدمی اپنی طرف سے ایک مکمل گائے کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔

حلال جانور کے ممنوع اجزاء

سوال: ایسا حلال جانور جسے شریعت کے مطابق ذبح کیا گیا ہو کیا اس کے بعض اجزاء ایسے بھی ہیں جنہیں کھانا شرعاً منع ہے، بعض لوگ بڑے شوق سے پکا کر کھاتے ہیں؟

(سید ذاکر شاہ، بگرام)

جواب: شریعت کے مطابق ذبح کیے ہوئے حلال جانور کے مندرجہ ذیل اجزا کھانا منع ہے۔ دمِ مسفوح (ذبح کے وقت بہنے والا خون) ذکر، گائے، بکری یعنی مادہ جانور کے پیشاب کی جگہ، خصیتین (کپورے)، دبر (پاخانے کی جگہ)، مثانہ، حرام مغز، اوجھڑی اور آنتیں ان میں دم مسفوح حرام قطعی ہے اور باقی مکروہ ہیں۔

دمِ مسفوح سے کیا مراد ہے؟

سوال: اپنے سوال و جواب کے کالم میں آپ نے ''دمِ مسفوح'' لکھا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ (عبداللہ۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: ''سَفح'' اور ''سَفُوح'' کے معنی ہیں: ''خون یا آنسو بہانا'' اور ''دمِ مسفوح'' کے معنی ہیں: ''وہ خون جو جانور کی ذبح کے وقت تیزی سے بہہ کر نکلتا ہے'' یہ بہنے والا خون قرآن کی رو سے حرام قطعی ہے اور حرام ہونے کی بنا پر ناپاک بھی ہے۔ بعد میں ذبح شدہ جانور کی ہڈیوں اور گوشت پر جو خون لگا ہوتا ہے، اگر وہ جسم یا کپڑے پر لگ جائے تو وہ نجس اور حرام نہیں ہے، اس سے نماز پڑھ لی جائے تو جائز ہوگی۔ لیکن طبعی نفاست اور نماز کی تقدیس کا تقاضا یہ ہے کہ لباس معنوی اعتبار سے بھی پاک ہو اور ظاہری اعتبار سے بھی پاک صاف ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا (لباس) زینت زیب تن کیا کرو، (الاعراف:۳۱)'' لہٰذا نماز کے لئے لباس صاف وشفاف کے ساتھ ساتھ باوقار بھی ہونا چاہیے۔

☆......☆......☆......☆

كتاب النكاح

کیا یہ نکاح جائز ہے؟

سوال: ایک شخص کی شادی اس کی تایازاد بہن سے ہوئی ہے جبکہ لڑکی کی ماں اس کے والدمحترم کی سگی بھانجی ہیں، کچھ دوستوں کا خیال ہے کہ کزن کی بیٹی ہونے کے ناطے وہ رشتے میں اس شخص کی بھتیجی ہوتی ہے، کیا یہ رشتہ جائز ہے (م-ر-، اسلام آباد)۔

جواب: صورتِ مسؤلہ میں اگر اس شخص کا تایا محض رشتے کا یا دور پار کا تایا نہیں ہے بلکہ اس کے والد کا واقعی بھائی ہے تو اس کے والد کی بھانجی، تایا کی بھی بھانجی ہوگی اور دونوں کی آپس میں شادی جائز نہیں ہے کیونکہ ماموں کے ساتھ نکاح ناجائز ہے۔ باقی چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہن بھائیوں کا جب آپس میں براہِ راست نکاح جائز ہے تو اولاد در اولاد کا یہ طریق اولیٰ جائز ہوگا بشرطیکہ کوئی اور حرمتِ نکاح کا سبب نہ ہو۔

غیر کتابیہ کافرہ عورت سے نکاح

سوال: حضرت محترم! سائل کو ایک شرعی مسئلہ کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی درکار ہے مسئلہ یہ ہے کہ ایک عاقل و بالغ شخص جو کہ باہوش وحواس جانتے بوجھتے ایک غیر مسلم عورت، جو کہ اہل کتاب میں بھی شمار نہ ہوتی ہو، سے ایک غیر وطن میں وہاں کے قانون کے مطابق شادی کر لیتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے آیا وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس کے ساتھ میل جول رکھنا کیسا ہے جب کہ وہ اس حرکت کو گناہ نہ سمجھتا ہو، اور پاکستان میں والدین اور 2 بیویاں جو موجود حیات ہیں کے علم میں بھی یہ بات نہ لائے اور محض مالی منفعت حاصل کرنے کے لیے ایسا کرے تو از روئے شرع وسنت ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟

آپ حضرت سے درخواست ہے کہ جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(حافظ محمد شاہد شریف۔ جامع مسجد علیمیہ نارتھ ناظم آباد)

جواب: غیر کتابیہ (یعنی وہ کافرہ عورت جو یہودی یا نصرانی نہ ہو) کافرہ عورت سے نکاح قطعی حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ (البقرہ:۲۲۱)

"اور شرک کرنے والی عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں"

شرعاً ایسا نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ایسے نکاح کے بعد مشرکہ یا کافرہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال جان کر کر رہا ہے تو یہ صریح کفر ہے اور قرآن کا انکار ہے، اور اگر وہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب اسے حرام سمجھتے ہوئے کر رہا ہے تو یہ صریح فسق و فجور ہے، گناہ اور زنا کی زندگی ہے اور گناہِ کبیرہ ہے، ایسے شخص کو فوراً اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے اس معصیت کو ترک کر دینا چاہئے۔ بہر کیف دونوں صورتوں میں جب تک وہ توبہ نہ کرے، اس کے ساتھ میل جول رکھنا شرعاً منع ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ہود: ۱۱۳)

"اور ظالموں کی طرف میلان (قلب) نہ رکھو، ورنہ تمہیں (جہنم کی) آگ چھوئے گی"

اس نکاح کے عدمِ جواز کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس شخص کے نکاح میں پہلے سے ایک یا دو بیویاں موجود ہیں یا نہیں ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب سے ڈرنا چاہئے۔

دلہن کا پالکی میں بٹھا کر لے جانا

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں ہمارے علاقہ میں جب کسی کی بیٹی یا بہن کی شادی ہوتی ہے تو نکاح کے بعد اس کے والدین یا بھائی اپنی بیٹی یا بہن کو رخصت کرتے وقت مکمل طور پر باپردہ کر کے ایک پالکی میں بٹھاتے ہیں اور پالکی کے اوپر بھی پردہ ڈالتے ہیں اور پھر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پالکی کو اٹھا کر دلہن کو شوہر کے گھر چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس سے ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری بیٹی یا بہن نے اپنی زندگی کے بیس یا پچیس سال کم و بیش اپنے والدین کے گھر میں باعزت طور پر گزارے ہیں آج اس کے احباب باعزت طور پر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر رخصت کر رہے ہیں یہ روایت ہمارے علاقہ میں برسوں سے چل رہی ہے۔

اب ہمارے علاقہ میں کچھ ایسے لوگ آئے ہیں جن کا تعلق تبلیغی جماعت سے ہے ان کا کہنا ہے کہ اس طرح لڑکی کو پالکی میں بٹھا کر رخصت کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اور حضور ﷺ کے زمانے میں کہیں سے بھی ثابت نہیں ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں فتویٰ صادر فرما کر تحریر فرمائیں کہ اس طریقے سے لڑکی کو پالکی میں بٹھا کر رخصتی کرنا شرعاً

جائز ہے یا نہیں؟ (سردار کامران اقبال، نیریاں شریف، آزاد کشمیر)

جواب: نکاح کے بعد ماں باپ کے گھر سے دلہن کو شوہر کے گھر لے جاتے ہیں، اسے ہمارے ہاں عرفِ عام میں "رخصتی" کہتے ہیں۔ اسے پیدل بھی لے جا سکتے ہیں، گھوڑے یا کسی جانور پر سوار کر کے بھی لے جا سکتے ہیں، پالکی میں بٹھا کر بھی لے جا سکتے ہیں اور آج کل کار وغیرہ میں بٹھا کر لے جاتے ہیں، یہ سب طریقے درست ہیں، اور شرعاً ان میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بس صرف اتنا لازم ہے کہ ستر و حجابِ شرعی کا اہتمام کیا جائے اور اس کا بدن کسی غیر محرم مرد سے مس نہ کرے۔ دلہن کو پالکی میں بٹھا کر لے جانے کو حرام کہنا، جبکہ اس پالکی کو مرد کندھوں پر اٹھائے ہوں، غلط ہے، کسی بات کو حرام قرار دینے کے لئے دلیلِ شرعی کی ضرورت ہوتی ہے، ہر ایک کو خود شارع نہیں بننا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اگر پالکی پر بٹھانا ثابت نہیں ہے تو کاروں پر بٹھا کر لے جانا کہاں سے ثابت ہے، کیا یہ بھی حرام ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ: ۳۱)

"انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا خدا بنا لیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انہیں فقط یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک خدا کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہ ان کے بنائے شریکوں سے پاک ہے"۔

"حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ نے فرمایا: اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو، میں نے آپ سے اس آیت کے متعلق پوچھا (یعنی سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۳۱)، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ اپنے علماء کی عبادت تو نہیں کرتے تھے لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کر دیتے تو وہ اس کو حلال کہتے اور جب وہ کسی چیز کو حرام کر دیتے تو وہ اس کو حرام کہتے"۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۰۹۵)

اسی مفہوم پر مشتمل حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تفسیر "الجامع لاحکام القرآن" میں امام قرطبی مالکی نے اسی آیت کے تحت درج کی ہے۔

قرآن مجید کی مذکورہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی مذہبی پیشوا کو حلال وحرام کی اتھارٹی بنا دینا اور یہ درجہ دینا کہ وہ جس چیز کو حرام کہیں اسے بلا دلیل شرعی حرام مان لیا جائے اور جسے وہ حلال کہیں اس کو دلیل شرع کے خلاف حلال مان لیا جائے، تو یہ درجۂ اُلوہیت دینے کے مترادف ہے۔ علاوہ ازیں یہ مسلمہ فقہی اصول ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے اور جو شخص کسی چیز کی حرمت شرعی کا دعویدار ہو، اس پر لازم ہے کہ اس کے لئے شرعی دلیل پیش کرے۔ جو لوگ دلیلِ شرعی کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے ہیں، انہیں اللہ کا خوف کرنا چاہئے۔

بھابھی اور چچی محرم نہیں

سوال: بھابھی اور چچی کے ساتھ ایک گھر میں رہنا، سلام وکلام کرنا یعنی ہاتھ ملانا، گاڑی میں ایک سیٹ پر سفر کرنا ازروئے شریعت کیسا ہے؟ (سید ذاکر شاہ۔ بگرام)

جواب: کوئی شخص اپنی بھابھی اور چچی کے لئے محرم نہیں بنتا سوائے اس کے کہ کوئی اور ایسا رشتہ ہو کہ وہ ان کا محرم بن جائے مثلاً چچی، خالہ بھی ہے یا بھابھی رضاعی بہن ہے، یا چچی کے ساتھ رضاعت کا رشتہ ہے یا چچی ساس بھی ہے وغیرہ، لہٰذا ایسی بھابھی اور چچی جن کے آپ کسی اور رشتے کے حوالے سے محرم نہیں بنتے ان کے ساتھ بے تکلف میل جول جائز نہیں ہے شرعاً وہ اجنبی عورت کے حکم میں ہیں، اگر مجبوری یا مشترکہ خاندانی نظام کے تحت کسی ایک مکان میں رہ رہے ہیں تب بھی ان کے ساتھ تنہا ایک کمرے میں نہ رہیں وہ خواتین اپنے دیور یا جیٹھ یا شوہر کے بھتیجے کے سامنے حجابِ شرعی کے بغیر نہ آئیں نہ ہی ان کے ساتھ ہاتھ ملا کر سلام کریں، ایسا شخص مشترکہ گھر میں داخل ہو جہاں ایسی عورتیں بھی رہتی ہیں جن کے لئے وہ محرم نہیں ہے تو وہ دروازہ کھٹکھٹائے اور اجازت لئے بغیر اندر نہ جائے اتنا موقع اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بعد دے کہ وہ ضروری پردہ کرلیں البتہ زبانی سلام وکلام آج کل بلوائے عام کی وجہ سے ضرورتاً مباح ہے۔ لیکن ضابطۂ شرعیہ یہی ہے کہ مرد غیر محرم عورت کو سلام نہ کرے مصافحہ تو بہت دور کی بات ہے۔

اور عورت کو بھی بلاضرورت اجنبی شخص سے گفتگو کرنا پڑے تو لہجہ لوچ دار، ملائم اور پرکشش نہ ہو بلکہ نسبتاً سخت ہو۔ گاڑی، ٹرین یا جہاز میں ایک ساتھ سفر کی نوبت آجائے تو بہتر یہ ہے کہ بھابھی اور چچی کے ساتھ نہ بیٹھے بلکہ انہیں کسی محرم کے ساتھ بٹھائے یا دوسری عورتوں کے ساتھ

بٹھائے ویسے خواتین کے لئے محرم یا شوہر کی رفاقت کے بغیر 98 رکلومیٹر سے زیادہ کا سفر شرعاً جائز نہیں ہے۔

بیوی کا شوہر سے یہ کہنا کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں

سوال: بیوی اگر شوہر سے یہ بولے کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں، اور کچھ دیر بعد راضی ہو جائے تو نکاح ٹوٹ تو نہیں جاتا۔ (طاہرہ، کراچی)

جواب: اس سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نکاح بدستور قائم رہتا ہے۔

مسئلۂ رضاعت

سوال: دو حقیقی بہنیں ہیں، ان کی دو بیٹیوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں حقیقی بہنوں کی اور اولاد بھی ہے۔ ان دو دودھ شریک بہنوں کے علاوہ دو بہنوں کی باقی اولاد نے اپنی ماں کے علاوہ کسی اور کا دودھ نہیں پیا۔ کیا ان کی باقی اولاد یعنی ایک بہن کے بیٹے اور دوسری بہن کی بیٹی کا آپس میں نکاح ہوسکتا ہے؟ (سہیل عمر۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: رضاعت (دودھ شریک) رشتہ دو طرفہ متعدی نہیں ہوتا بلکہ جانب واحد سے متعدی ہوتا ہے۔ یعنی جس بچی یا بچے نے کسی عورت کا دودھ پیا ہے اس پر رضاعی ماں باپ کی ساری اولاد حرام ہے، جبکہ رضاعی ماں باپ کی اولاد پر صرف یہ بچہ یا بچی حرام ہے، جس نے دودھ پیا ہے، اس کے باقی بہن بھائی حرام نہیں ہیں۔ (بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو) اب صورتِ مسؤلہ میں جن دو بچیوں نے اپنی اپنی خالہ کا دودھ پیا ہے، ان کی خالہ ان کی رضاعی ماں بن گئی ہے اور ان دونوں بچیوں میں سے ہر ایک کا خالہ زاد بھائی سے نکاح حرام ہے، کیونکہ وہ اس کا دودھ شریک بھائی ہوگا۔ لیکن ان دونوں حقیقی بہنوں کی بقیہ اولاد کا، جنہوں نے اپنی خالہ کا دودھ نہیں پیا، آپس میں نکاح ہوسکتا ہے، بشرطیکہ حرمت کا کوئی اور سبب نہ ہو۔

ماں کو رضاعت پر مجبور کرنا

سوال: کیا ماں کو رضاعت پر مجبور کیا جاسکتا ہے یا اس کی منشا پر ہے؟ (محمد الیاس۔ لانڈھی، کراچی)

جواب: دودھ ماں کا ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے بچے کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ درمختار میں ہے (ولیس له ذالک) یعنی الاجبار بنوعیه (مع زوجة الحرة) یعنی مرد اپنی آزاد

بیوی کو نہ دودھ چھڑانے پر مجبور کرسکتا ہے اور نہ ہی دودھ پلانے پر۔ ہاں اگر بچے کی ہلاکت کا خطرہ ہو اور متبادل انتظام نہ ہو تو ماں کو رضاعت وحضانت یعنی بچے کو دودھ پلانے اور اس کی نگہداشت پر مجبور کیا جائے گا اور اگر وہ بدستور اپنے شوہر (یعنی اس بچے کے باپ) کے نکاح میں ہے تو وہ رضاعت وحصانت کی اجرت کا الگ مطالبہ نہیں کرے گی اور نہ ہی اس کا مطالبہ منظور ہوگا، کیونکہ اس کا نان نفقہ ویسے بھی شوہر کے ذمے ہے۔

حرمت رضاعت کا ایک پیچیدہ مسئلہ

کوئٹہ سے مولانا فتح محمد صاحب زید مجدہ نے مندرجہ ذیل سوال وجواب تصویب اور تصدیق کے لئے ارسال فرمایا۔ سوال اور مولانا فتح محمد صاحب کی طرف سے تصویب کے لئے ارسال کردہ جواب ان کی اپنی عبارت میں ملاحظہ ہو:

الاستفتاء: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ عبدالرحیم کی دو بیویاں (مسماۃ حور بی بی اور مسماۃ جمال خاتون) ہیں۔ محمد اسماعیل نے مدت رضاعت میں مسماۃ حور بی بی کا دودھ پیا تھا۔ اب دریافت یہ کرنا ہے کہ محمد اسماعیل کے بیٹے مسمّی محمد امین کا اپنے والد کی رضاعی ماں کی سوکن مسماۃ جمال خاتون کی بیٹی مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بینوا بالبرھان اجرکم الرحمٰن۔ (المستفتی)۔

الجواب ماھوالصواب: محمد امین اپنے والد کی رضاعی ماں کی سوکن کی بیٹی مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح از روئے شرع کرسکتا ہے کیونکہ جب اس کے باپ محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا۔ کما فی ردالمحتار فی باب الرضاعۃ قولہ (وعمۃ ابن) فیہ الصور الثلاث ایضاً بان یکون کل منھما رضاعیا کان رضع صبی من زوجتک ورضع ایضاً من زوجۃ رجل آخر لہ اخت فھٰذہ الاخت عمۃ ابنک من الرضاع اوالاوّل رضاعیا فقط بان یکون ذالک الرضیع ابنک من النسب اوالثانی فقط بان یکون ابنک من الرضاع لہ عمۃ من النسب بخلاف مالو کان کل منھما من النسب فان العمۃ لاتحل لک لانھا اختک۔

ھٰذا ماظھر لی فی ھٰذا الباب واللہ اعلم بالصواب (الفقیر الحاج فتح محمد باروزئی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا فتح محمد صاحب نے ایک باپ کی وجہ سے رضیع کی عمہ کو دو باپ کی وجہ سے عمہ ابن پر قیاس فرما کر غلطی کی۔ چونکہ مولانا فتح محمد صاحب کے جواب کی تصویب نہیں ہوسکتی اور مولانا کا جواب غلط تھا، صورت مسئولہ کا صحیح جواب اور مولانا کے جواب کی تردید فوراً ہوسکتی تھی، لیکن جب مولانا نے ہوٹل سے فون پر فرمایا کہ میرے جواب کی تصدیق بڑے بڑے علماء کر چکے ہیں تو میں نے آپ سے کچھ وقت لے کر قدرے تفصیلی جواب بذریعہ ڈاک ارسال کرنے کا وعدہ کرلیا، تاکہ اس تفصیل سے مولانا اور ان کے مصدقین کی غلط فہمی دور ہوجائے۔ چنانچہ میری طرف سے مذکورہ صورت کا صحیح جواب یہ ہے کہ:

صورتِ مسئولہ میں محمد امین کا اپنے والد محمد اسماعیل کی رضاعی ماں (حور بی بی) کی سوکن (جمال خاتون) کی بیٹی (اشرف خاتون) سے نکاح نہیں ہوسکتا کیونکہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی رضاعی بہن اور اس کے بیٹے محمد امین کی رضاعی پھوپھی بنتی ہے، لہٰذا محمد اسماعیل اپنی رضاعی بہن سے اور نہ اس کا بیٹا محمد امین اپنی رضاعی پھوپھی سے نکاح کرسکتا ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے: ویحرم من الرضاع مایحرم من النسب یعنی ''رضاع کی وجہ سے ہر وہ رشتہ حرام ہے جو نسب کی وجہ سے حرام ہوتا ہے''۔ لہٰذا جس طرح نسبی بہن اور نسبی پھوپھی سے نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح رضاعی بہن اور رضاعی پھوپھی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔ اگر کہا جائے کہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی رضاعی بہن اور محمد امین کی رضاعی پھوپھی کس طرح بنتی ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رضیع کے لئے مرضعہ جس طرح رضاعی ماں ہوتی ہے، اسی طرح مرضعہ کا شوہر رضیع کا رضاعی باپ ہوتا ہے، لہٰذا مرضعہ کے شوہر کی اولاد چاہے وہ مرضعہ سے ہو یا مرضعہ کی سوکنوں سے ہو، رضیع کے لئے رضاعی بہن اور بھائی ہونے کی وجہ سے حرام ہوجائے گی اور جس طرح نسبی بہنیں اور نسبی پھوپھیاں عینی، علاتی اور اخیافی ہوتی ہیں اسی طرح رضاعی بہنیں اور رضاعی پھوپھیاں بھی عینی، علاتی اور اخیافی ہوتی ہیں اور تینوں قسم کی بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا محمد اسماعیل کے لئے اشرف خاتون رضاعی علاتی بہن ہوگی اور محمد امین کے لئے رضاعی علاتی پھوپھی ہوگی، دونوں باپ بیٹے کا اشرف خاتون کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوگا۔

ویثبت ابوة زوج مرضعة اذا کان لبنها منه کما سیجیی (باب الرضاع)۔ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں : یعنی اللبن الذی نزل من المرء ة بسبب ولادتها من رجل زوج وسید یتعلق به التحریم بین المرضعة وبین ذالک الرجل بان یکون ابا للرضیع فلاتحل له ان کانت صبیة لانه ابوها ولا لاخوته لانهم اعمامها ولا لابائه لانهم اجدادها ولا لاعمامه لانهم اعمام الاب ولا لاولاده وان کانوا من غیر المرضعة لانهم اخوتها لابیها ولا لابناء اولاده لان الصبیة عمتهم۔ ۳۔۴۳۰ مکتبہ بیروت

لہٰذا محمد امین اور محمد اسماعیل میں سے کسی کا اشرف خاتون سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

مولانا فتح محمد باروزئی صاحب نے ردالمحتار کی جس عبارت سے استدلال فرمایا ہے، مولانا اس کو سمجھ نہیں سکے، صرف لفظ ''عمۃ ابن'' اور علامہ شامی کی طرف سے توضیح کے ظاہر کو دیکھ کر محمد اسماعیل کے لئے رضاعی بہن کے ساتھ اور محمد امین کے لئے رضاعی پھوپھی کے ساتھ نکاح جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے (اناللہ وانا الیہ راجعون)

توضیح یہ ہے کہ رضاع کے ابواب میں وہ متعدد صورتیں جن میں نسب اور رضاع میں فرق ہوتا ہے، ان صورتوں میں ''عمۃ ابن'' بھی ہے، ان کی توضیح کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مثال ایسی صورتوں کے ساتھ دی جائے جس میں مخاطب یعنی نکاح کرنے والے کا مضاف سے مراد عورت سے نکاح جائز ہو سکے۔ جس طرح علامہ شامی نے لفظ ''عمۃ ابن'' میں تین صورتیں بیان فرمائی ہیں، ہر صورت میں ''عمۃ'' سے مراد مخاطب کے لئے ''عمۃ'' نہ بہن رضاعی بنتی ہے اور نہ پھوپھی رضاعی اور نکاح جائز ہوتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ''عمۃ'' اور ''ابن'' دونوں رضاعی ہوں اور ''عمۃ'' کے ساتھ مخاطب کا نکاح جائز ہو، وہ اس طرح کہ کسی اجنبی لڑکے نے مخاطب کی بیوی کا مدتِ رضاع میں دودھ پیا، مخاطب موصوف لڑکے کا رضاعی باپ ہوگا اور اس کی بیوی رضاعی ماں ہوگی، پھر اسی لڑکے نے دوسرے مرد کی بیوی کا دودھ پیا جس کی ایک نسبی بہن بھی تھی تو دوسرا مرد بھی موصوف لڑکے کے لئے رضاعی باپ اور اس کی بیوی ماں ہوگی اور اس کی بہن موصوف لڑکے کی رضاعی پھوپھی ہوگی لیکن لڑکے کی یہ پھوپھی لڑکے کے پہلے باپ رضاعی کے لئے نہ رضاعی بہن بنتی ہے اور نہ رضاعی پھوپھی، لہٰذا لڑکے کے پہلے رضاعی باپ کا بیٹے کی اس رضاعی پھوپھی

سے نکاح جائز ہوگا، لیکن صورت مسئولہ میں تو محمد اسماعیل کے لئے اشرف خاتون رضاعی بہن بنتی ہے تو محمد اسماعیل کا اس کے ساتھ نکاح یا اس لڑکے کا نکاح کس طرح ہوسکتا ہے، لہٰذا ''عمۃ ابن'' کی اس صورت پر قیاس غلط ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ صرف ''عمۃ'' رضاعی ہو لیکن ''ابن'' نسبی ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ یہی لڑکا مثلاً پہلے شخص کا نسبی بیٹا ہو لیکن دوسرے مرد کی بیوی کا دودھ پینے کی وجہ سے اس کا رضاعی بیٹا بن گیا۔ دوسرے مرد کی مذکورہ بہن لڑکے کے لئے رضاعی پھوپھی ہے، لڑکے کا نکاح تو اس کے ساتھ جائز نہیں ہوگا لیکن اس کے نسبی باپ کا بیٹے کی مذکورہ پھوپھی سے نکاح جائز ہوگا کیونکہ لڑکے کے نسبی والد کے لئے مذکورہ ''عمۃ'' اجنبیہ ہے، نہ رضاعی بہن بنتی ہے اور نہ رضاعی پھوپھی، کیونکہ ضابطہ یہ ہے کہ

از جانب شیر دہ ہمہ خویش شوند   واز جانب شیر خوار زوجان وفروع

لہٰذا محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت کو اس صورت پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ''عمۃ'' محمد امین اختِ محمد اسماعیل ہے، لہٰذا اشرف خاتون سے دونوں کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ فقط ''ابن'' رضاعی ہو لیکن ''عمۃ'' نسبی ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی اجنبی لڑکے نے مخاطب کی بیوی کا دودھ کا پیا، لیکن اس کے اپنے نسبی باپ کی ایک بہن ہے، یہ سگی بہن لڑکے کے باپ کے لئے تو ''عمۃ نسبی'' ہوگی لیکن اس لڑکے کے رضاعی باپ کے لئے نہ بہن بنتی ہے نہ عمۃ۔ لہٰذا موصوف لڑکے کے باپ کے لئے ''عمۃ ابن'' کے ساتھ نکاح جائز ہوگا۔ اس صورت پر بھی محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت کو قیاس کرنا غلط ہے، جیسا کہ واضح ہے، اور اگر ''عمۃ ابن'' میں ''ابن'' مخاطب کا ''نسبی ابن'' ہو اور ''عمۃ'' اس ''ابن'' کی ''نسبی عمۃ'' ہو تو مخاطب کا ''عمۃ ابن'' کے ساتھ نکاح جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہ ''عمۃ'' مخاطب کی نسبی بہن ہوگی۔ یہ ردالمحتار کی اس عبارت کی وضاحت تھی جس عبارت سے مولانا کو غلطی لگی۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس طرح ''ابن نسبی'' کی ''عمۃ نسبی'' مرد کے لئے ''اخت نسبی'' ہونے کی وجہ سے حرام ہوتی، اسی طرح مرد کے لئے ''ابن نسبی'' کی ''عمۃ رضاعی'' بھی اس وقت حرام ہوتی ہے جب وہ ''عمۃ'' مرد کے لئے ''اخت رضاعی'' بن رہی ہو، جیسے محمد اسماعیل اور محمد امین والی صورت میں ہے۔ مولانا سے اور ان کے مصدقین سے گذارش ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے مذکورہ غلطی سے رجوع فرمالیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مولانا فتح محمد کا یہ جملہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ’’ جب باپ محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا‘‘۔ مولانا فتاویٰ شامی سے جن تین مفروضہ صورتوں سے استدلال فرمارہے ہیں، ان تینوں صورتوں میں عمہ ابن کے ساتھ بیٹے کا نکاح جائز نہیں، لیکن باپ کا نکاح جائز ہے، تو مولانا کی مذکورہ عبارت بھی غلط ہوگئی۔

محمد رفیق الحسنی عفی عنہ

جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، گلستان جوہر بلاک ۱۵ کراچی

۱۱/ اکتوبر ۲۰۰۰ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قاعدہ یہ ہے کہ جو رشتے نسب سے حرام ہوتے ہیں، وہ رضاعت سے بھی حرام ہوتے ہیں، لیکن فقہاء کرام نے ان میں سے اکیس صورتوں کو مستثنیٰ کیا ہے، جن سے وہ رشتے نسباً تو حرام ہوتے ہیں، لیکن رضاعاً حرام نہیں ہیں۔ ان میں سے کسی شخص کی اپنے رضاعی بیٹے کی پھوپھی سے نکاح کے جواز کی تین صورتیں ہیں، جن کو علامہ شامی نے ذکر کیا ہے۔ علامہ فتح محمد بارو زئی نے اپنے موقف پر شامی کے تین جزئیوں سے استدلال کیا ہے، جن کی عبارت انہوں نے اپنے جواب میں پیش کی ہے، لیکن ان جزئیوں سے ان کا موقف ثابت نہیں ہوتا۔

مسئلے کی وضاحت کے لئے ہم علامہ شامی کی ذکر کردہ تین صورتوں کا اور صورت مسئولہ کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے مسئلے کو سمجھنا انتہائی آسان ہوجائے گا، انشاء اللہ العزیز!

پہلا جزئیہ یہ ہے کہ کسی شخص کا رضاعی بیٹا ہو جو کسی دوسرے کا بھی رضاعی بیٹا ہو اور اس دوسرے شخص کی بہن بھی ہو جو اس مشترک رضاعی بیٹے کی رضاعی پھوپھی ہوگی، تو وہ اس شخص کے لئے حلال ہوگی، جب کہ کسی شخص کے بیٹے کی نسبی پھوپھی اس شخص کے لئے حلال نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس کی بہن ہے، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید   (دوسرا شخص) بکر   ہند (بکر کی بہن)

کلثوم (زید کی بیوی)   زرینہ (بکر کی بیوی)

خالد   (زید اور بکر دونوں کا رضاعی بیٹا)

خالد نے کلثوم اور زرینہ دونوں کا دودھ پیا۔ ہے، لہٰذا وہ زید اور بکر دونوں کا رضاعی بیٹا ہوا، اور

زید و بکر دونوں اس کے رضاعی باپ ہوئے۔

اب اس صورت میں ہند، خالد کی رضاعی پھوپھی ہے اور زید کا ہند (یعنی اپنے رضاعی بیٹے کی رضاعی پھوپھی) سے نکاح ہوسکتا ہے۔

دوسرا جزئیہ یہ ہے کہ کسی شخص کا نسبی بیٹا ہو اور وہ کسی دوسرے شخص کا رضاعی بیٹا بھی ہو اور اس دوسرے شخص کی ایک بہن بھی ہو، جو اس مشترک (یعنی ایک کے حقیقی اور دوسرے کے رضاعی) بیٹے کی رضاعی پھوپھی ہے، وہ اس شخص کے لئے حلال ہے، جب کہ کسی شخص کے بیٹے کی نسبی پھوپھی اس پر حلال نہیں ہوتی، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید   (دوسرا شخص) بکر   ہند (بکر کی بہن)

خالد (اس کا نسبی بیٹا)   زرینہ (بکر کی بیوی)

(خالد نے زرینہ کا دودھ پیا)

خالد، زید کا نسبی بیٹا ہے اور ہند، خالد کی رضاعی پھوپھی ہے اور زید کا ہند (یعنی اپنے نسبی بیٹے کی رضاعی پھوپھی) سے نکاح جائز ہے، کیونکہ زید کا براہِ راست ہند سے حرمتِ نکاح کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کا ایک نسبی بیٹا ہو اور اس (باپ) کی ایک بہن بھی ہو، اور اس بیٹے نے کسی دوسری عورت کا دودھ پیا ہو، تو اس (رضاعی ماں) کا شوہر اس کا رضاعی باپ بن جائے گا، اب اس رضاعی باپ کے لئے اپنے اس رضاعی بیٹے کی نسبی پھوپھی سے نکاح جائز ہے، اس کی صورت یوں بنے گی۔

(ایک شخص) زید   ہند (زید کی بہن)   بکر (خالد کا رضاعی باپ)

خالد (زید کا نسبی بیٹا)   زرینہ (بکر کی بیوی)

(خالد نے زرینہ کا دودھ پیا)

اس صورت میں بکر کا اپنے رضاعی بیٹے خالد کی نسبی پھوپھی ہند سے نکاح جائز ہے، کیونکہ بکر کا ہند سے ایسا کوئی رشتہ نہیں جو حرمتِ نکاح کا سبب بنے۔ علامہ شامی کی ذکر کردہ ان تینوں جائز صورتوں کے برعکس صورت مسئولہ کا نقشہ کچھ یوں بنتا ہے:

عبدالرحیم

حور بی بی (عبدالرحیم کی پہلی بیوی)   جمال خاتون (عبدالرحیم کی دوسری بیوی)

اسماعیل (عبدالرحیم کا رضاعی بیٹا ہے کیونکہ اس نے حور بی بی کا دودھ پیا ہے)

اشرف خاتون (عبدالرحیم و جمال خاتون کی بیٹی)

محمد امین (محمد اسماعیل کا بیٹا)   (محمد امین کی علاتی رضاعی پھوپھی)

اس صورت میں اشرف خاتون سے نہ تو اسماعیل کا نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ اس کی علاتی (باپ شریک) رضاعی بہن ہے اور نہ ہی محمد امین (فرزند اسماعیل) کا نکاح جائز ہے، کیونکہ وہ اس کی علاتی رضاعی پھوپھی ہے۔ کیونکہ محمد امین کے لئے اشرف خاتون کا رضاعی پھوپھی ہونا ایک ہی رضاعی باپ کے سبب سے ہے، جب کہ علامہ شامی کے مذکورہ جزئیات میں جس پھوپھی (عمۃ الابن) کا استثناء کیا گیا ہے، اس کا جواز دو باپوں (ایک رضاعی اور ایک نسبی یا ایک نسبی اور دوسرا رضاعی) کی وجہ سے ہے، نیز علامہ فتح محمد باروزئی کا یہ کہنا بداہۃً باطل ہے کہ جب محمد اسماعیل کے لئے مسماۃ اشرف خاتون سے نکاح جائز ہے تو بیٹے کے لئے کس طرح ناجائز ہوگا؟۔ یہ اس لئے باطل ہے کہ اشرف خاتون محمد اسماعیل کی علاتی رضاعی بہن ہے اور علاتی رضاعی بہن سے نکاح نسباً بھی حرام ہے اور رضاعاً بھی۔ حضرت علامہ مفتی محمد رفیق الحسنی صاحب کا جواب بھی بالکل درست اور صائب ہے، لیکن وہ بہت زیادہ فنی، اصطلاحی اور مغلق عبارات پر مشتمل ہے، اس لئے ہم نے تفہیم کے لئے اس کو آسان اور سہل انداز میں پیش کر دیا ہے تاکہ علامہ فتح محمد باروزئی اور دیگر اہل علم پر اصل جواب واضح ہو جائے اور ان کے لئے رجوع الی الحق میں دشواری نہ ہو، فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نوٹ: یہ علامہ فتح محمد باروزئی کے بڑے پن اور عالم حق ہونے کی دلیل ہے کہ انہوں نے ہمارا جواب پڑھنے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع بھی کیا اور ہمیں تشکر کا خط بھی لکھا۔

منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کا آپس میں بلاتکلف بے حجاب ملاقاتیں کرنا

سوال: لڑکا لڑکی کی منگنی ہونے کی صورت میں اکثر دیکھا گیا ہے لڑکا اور لڑکی اکیلے باہر گھومتے

ہیں آیا منگنی والی لڑکی کا اپنے منگیتر کے ساتھ بے پردہ باہر جانا جائز ہے یا نہیں اس کو حرام مانا جائے گا یا نہیں؟ (عبدالمجید رضوی۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: منگنی وعدۂ نکاح ہے، نکاح نہیں ہے۔ لہٰذا منگنی کے بعد بھی، جب تک کہ باقاعدہ نکاح نہ ہوا ہو، لڑکی، لڑکے کے لئے بدستور اجنبی رہتی ہے جیسا کہ کوئی بھی دوسری غیر محرم بالغہ لڑکی۔ لہٰذا قبل از نکاح لڑکے لڑکی کا بلا تکلف اور حجابِ شرعی کے بغیر آپس میں ملنا، خلوت میں رہنا اور گھومنا پھرنا قطعاً جائز نہیں ہے، ممنوع ہے۔

جہیز و بری کے سامان کی ملکیت کا مسئلہ

سوال: مفتی صاحب! گذارش یہ ہے کہ میں ایک بیوہ خاتون ہوں اور میرا نام عرشی ناز (زوجہ شیخ وجاہت حسین مرحوم) ہے۔ میری شادی کے پانچ مہینے کے بعد میرے شوہر وجاہت حسین وفات پا گئے اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ میں اپنے شوہر کے انتقال کے وقت حالتِ حمل کی کیفیت میں تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام علی وجاہت ہے۔

(۱) گذارش یہ ہے کہ جہیز، بری اور تحفے تحائف کے سلسلہ میں فتویٰ عنایت فرمائیں کہ شریعتِ محمدی ﷺ کی رو سے یہ حق کس کا بنتا ہے۔

(۲) میرے شوہر وجاہت حسین مرحوم نے ترکہ میں ایک عدد فلیٹ، ایک عدد کار اور ایک عدد موٹر سائیکل چھوڑی ہے، عرض ہے کہ وجاہت حسین مرحوم کی وراثت میں ان کے ماں باپ جو کہ الحمدللہ حیات ہیں اللہ ان کو زندگی دے۔ بیوہ اور بیٹا علی وجاہت اس ترکہ کی کل قیمت میں شریعتِ محمدیہ ﷺ کی روشنی میں کیا حصہ پائیں گے۔ مرحوم کے کل ۴ وارث ہیں ان سب کے حصوں کا تعین فرمادیں، تفصیل سے فتویٰ عنایت فرمائیں۔ ممنون و متشکر فرمائیں۔

(۳) میرے مرحوم شوہر نے بیٹے کی ڈیلیوری کے سلسلے میں اپنی زندگی میں مبلغ ۵۴۰۰۰ (چون ہزار روپے) دیئے تھے جو کہ میرے پرس میں ہی سسرال میں موجود ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت بھی تحریر فرمائیں، (عرشی ناز، مکان نمبر L-248 سیکٹر 5-C/4 ۔ نارتھ کراچی)۔

جواب: شادی کے موقع پر دلہن کو اس کے والدین کی جانب سے جو زیورات، سامان، لباس اور اشیاء دی جاتی ہیں۔ خواہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ...... وہ دلہن کی ملکیت ہوتی ہیں، اس میں شوہر

یا اس کے خاندان والوں کا کوئی حق نہیں ہوتا، اور اگر کبھی قضاء الٰہی سے اس کا انتقال ہو جائے تو وہ اس کے ترکہ میں شامل ہوں گی اور شریعت کے قانونِ وراثت کے مطابق اس کے ورثاء میں تقسیم ہوں گی، فتاویٰ درمختار، ج ۱، ص ۲۳۱ مطبع مجتبائی دہلی میں ہے:

كل احديعلم ان الجهاز ملك المرأة لاحق لاحد فيه.

''ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اس میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہوتا''۔

اور فتاویٰ ردالمحتار جلد نمبر ۲، صفحہ نمبر ۲۳۵ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی میں ہے:

كل احد يعلم ان الجهاز للمرأة وانه اذا طلقها تأخذه كله و اذا ماتت يورث عنها.

''ہر شخص جانتا ہے کہ جہیز عورت کی ملکیت ہوتا ہے، اور جب شوہر اس کو طلاق دے دے تو وہ تمام جہیز لے لے گی، اور جب اس عورت کا انتقال ہو جائے تو وہ جہیز بطور ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا''۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

''جہیز ہمارے بلاد کے عرفِ عام شائع سے خاص ملک زوجہ ہوتا ہے جس میں شوہر کا کچھ حق نہیں، طلاق ہوئی تو کل لے گئی اور مرگئی تو اسی کے ورثاء پر تقسیم ہوگا''۔

(فتاویٰ رضویہ، ج ۱۲، ص ۲۰۲، رضا فاؤنڈیشن لاہور)

شادی کے موقع پر دلہن کو سسرال والوں کی جانب سے جو زیورات، لباس، سامان اور تحائف وغیرہ ملتے ہیں، اسے عرف عام میں ''بری'' کہا جاتا ہے۔ بری کے سامان کی ملکیت و استحقاق کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں نارمل حالات میں اٹھتا ہی نہیں ہے، اگر عائلی و ازدواجی زندگی خوشگوار ہے، باہم محبت ہے، سب معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں تو اس طرح کے سوالات خواب وخیال میں بھی نہیں آتے چہ جائے کہ عملی زندگی میں ان کو چھیڑا جائے۔ تاہم ان کی ممکنہ صورتیں اور ان کے احکام درج ذیل ہیں:

(۱) یہ کہ کسی علاقے، کمیونٹی یا برادری میں یہ معروف اور طے شدہ اصول ہو کہ بری کا سامان شوہر یا اس کے خاندان کی ملکیت ہوتا ہے، تو عرف بھی نصِ شرع کی طرح ہوتا ہے اور اسی پر معاملات کا

فیصلہ ہوگا اور عورت کے لئے محض تصرف و استعمال کی اجازت ہی سمجھی جائے گی اور طلاق کی صورت میں وہ سامان شوہر کا ہوگا اور اس کی وفات کی صورت میں وہ اس کے ترکے میں شمار ہوگا۔

(۲) شادی کے موقع پر باقاعدہ تحریری طور پر یا زبانی طے کرلیا جائے کہ بری کا سامان کس کی ملکیت ہوگا تو بعد میں اسی کے مطابق عمل ہوگا اور بہتر یہی ہے کہ شادی کے موقع پر نکاح نامے میں یہ درج کرادیا جائے کہ بری کے زیورات اور سامان کس کی ملکیت ہوں گے تاکہ بعد میں خدانخواستہ طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں تنازع نہ پیدا ہو۔

(۳) شادی کے موقع پر یہ سامان دلہن کو ہبہ (GIFT) کردیا گیا ہو، لیکن بعد میں زوجین میں اختلافات رونما ہونے کی بناء پر نیت میں فتور آجائے۔ ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے کو حدیثِ پاک میں ایک معیوب اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے اور یہ مکروہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

العائد فی هبته كالعائد فی قيئه.

''ہبہ کرکے اس سے رجوع کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو قے کرکے دوبارہ اسے چاٹ لے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۶۲)

مثل الذی ی رجع فی صدقته كمثل الكلب يقئ ثم يعود فی قيئه فياكله.

''جو شخص صدقہ کرکے اس سے رجوع کرتا ہے، اس کی مثال اس کتے کی ہے جو قے کرتا ہے، پھر لوٹ کر اسے کھالیتا ہے''۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۵۸)

امام احمد رضا قادری فرماتے ہیں:

''دلہن کا گہنا جوڑا جو بری میں جاتا ہے، اگر نصاً یا عرفاً اس میں بھی تملیک ہوتی ہو، جیسے شکر، میوہ، عطر پھلیل وغیرہ میں مطلقاً ہوتی ہے، تو وہ بھی قبضۂ منکوحہ، ملکِ منکوحہ ہوگا، ہمارے یہاں شرفاء کا عرفِ ظاہر یہی ہے، ولہٰذا بعد رخصت اس کے واپسی لینے کو سخت معیوب و موجبِ مطعونی جانتے ہیں، اور اگر لے لیں تو طعنہ زن یہی کہتے ہیں کہ دے کر پھیر لیا یا صرف دکھانے کو دیا تھا، جب دلہن آئی چھین لیا، یعنی یہ ان کی رسمِ معہود (UNDERSTANDABLE MARITAL CUSTOM) کے خلاف ہے، اس صورت میں تو اس کے لئے بعینہ وہی

احکام ہوں گے جو دولہا کے جوڑے میں گذرے کہ بعد ہلاک دلہن سے تاوان لینے کا اصلاً اختیار نہیں، جیسے شکر، میوہ کا تاوان بٹنے کے بعد نہیں مل سکتا، اگرچہ ہنوز کھانے میں نہ آیا ہو......

آگے چل کر لکھتے ہیں...... ہاں جہاں عرف تملیک نہ ہو بلکہ صرف پہنانے کے لئے بھیجا جاتا اور بنانے والوں ہی کی ملک سمجھا جاتا ہو، وہاں دلہن کی ملک نہیں، ایک عاریت ہے کہ بحالتِ بقا جس سے رجوع ہر وقت جائز وحلال''۔ (فتاویٰ رضویہ، ج۱۲، ص۲۰۸، رضا فاؤنڈیشن۔ لاہور)

میری دانست میں ہمارے یہاں بھی معزز خاندانوں اور شرفا کا معمول اور عرف یہی ہے کہ بری کا سامان وزیورات وغیرہ دلہن کو بطورِ ملک دیئے جاتے ہیں اور وہ ان پر مالکانہ تصرف کرتی رہتی ہے، تاہم جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اگر کسی خاندان، برادری، کمیونٹی یا علاقے کا رواج اور عرف یہی ہے کہ بری کے زیورات اور سامان دلہن کو عاریتاً محض استعمال کے لئے دیئے جاتے ہیں نہ کہ ملکیت کے طور پر، تو وہ اپنے عرف پر ان کا فیصلہ کرسکتے ہیں۔

(۲) اگر متوفی کے ورثاء کی تعداد وہی ہے جو سوال میں مذکور ہے تو ان امور کی ادائیگی کے بعد جو تقسیم ترکہ پر شرعاً مقدم ہیں، یعنی مصارفِ تجہیز وتکفین، میت کے ذمہ اگر کسی کا کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو کل ترکے کے ایک تہائی مقدار تک مؤثر ہوگی، بقیہ ترکہ کی تقسیم حسب ذیل ہوگی، کل ترکہ ۲۴ حصوں پر منقسم ہوگا اور ان میں سے میت کے والد کو چار حصے، والدہ کو چار حصے، بیوہ کو تین حصے اور بقیہ تیرہ حصے بیٹے کو ملیں گے۔

(۳) شوہر نے اپنی زندگی میں جو چوّن ہزار روپے کی رقم بیوی کو ڈلیوری کے مصارف کے لئے اس کی ملکیت میں دے دی تھی، وہ اسے ڈلیوری اور اس کے مابعد اپنے اور بچے کے علاج معالجے پر خرچ کرے۔

چونکہ سائلہ عرشی ناز اپنے شوہر کی وفات کے وقت حاملہ تھیں، اس لئے ان کی عدت وضعِ حمل تک تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ (الطلاق:۴)

'' حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہوجائے یعنی بچہ پیدا ہوجائے''۔

اصولی طور پر مطلقہ یا بیوہ عورت کو عدت اپنے سابق شوہر کے گھر پر ہی گزارنی چاہئے بشرطیکہ

کوئی عذرِ شرعی مانع نہ ہو، متوفی شوہر نے اگر اپنی زندگی میں اپنی بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو اس کے ترکے کی ورثاء پر تقسیم سے پہلے دیگر قرض کی رقوم کی طرح دینِ مہر کو بھی وضع کیا جائے گا۔ سوال میں شوہر کی جن اشیاء کا ذکر ہے (مثلاً فلیٹ، کار اور موٹر سائیکل)، یہ سب اور ان کے علاوہ وہ جو بھی مال چھوڑ کر مرا ہے (مثلاً رقم، بینک بیلنس وغیرہ)، وہ سب بھی ترکے میں شامل ہے۔ اگر سائلہ نے کسی شرعی مانع اور عذر کے بغیر عدت شوہر کے گھر پر نہیں گزاری تو وہ گنہگار ہے، اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے اور معافی مانگے، لیکن اس سے اس کے اور اس کے بچے کے حقوقِ وراثت متاثر نہیں ہوں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

نکاح کے وقت ولدیت میں سوتیلے باپ کا نام لینا

نکاح نامے میں سوتیلے باپ کا نام لکھنا، ایسے نکاح کا شرعی حکم

سوال: گزشتہ چند سال پہلے ایک نکاح انجام پایا نکاح کے وقت یعنی نکاح جو پڑھایا گیا اور نکاح نامہ جو لکھا گیا اس میں لڑکی کی اصل ولدیت نہیں لکھی گئی لڑکی کے اصل والد فوت ہوچکے تھے لڑکی کی ماں نے دوسرا نکاح کیا بچے چھوٹے تھے۔ بچوں کی پرورش سوتیلے باپ نے کی۔ لاعلمی کے سبب نکاح کے وقت ولدیت میں سوتیلے باپ کا نام درج کروایا گیا۔ اس مسئلہ پر شرعی حکم کیا ہے، (مشکور حسین قادری، ۱۵/۷۵ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)۔

جواب: اس مسئلے کا جواب جاننے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ قرآن و حدیث میں کسی شخص کا اپنے آپ کو بیٹے یا بیٹی کی حیثیت سے حقیقی باپ کے علاوہ غیر کی طرف (خواہ سوتیلا باپ ہو، مربی ہو، یا اس نے اسے گود لیا ہو اور لے پالک بنایا ہو) منسوب کرنا ممنوع اور حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ (الاحزاب:۴)

'' اور اس (اللہ تعالیٰ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ سب تمہاری اپنی خودساختہ باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ حق (بات) ارشاد فرماتا ہے اور وہ راہِ راست کی طرف رہنمائی فرماتا ہے''۔

اور فرمایا:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ (الاحزاب:۵)

"ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کے ناموں سے پکارو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہی سب سے زیادہ انصاف کی بات ہے"۔

حدیث پاک میں اس پر شدید وعید آئی ہے:

عن سعد رضی اللّٰہ عنہ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: مَنِ ادَّعیٰ اِلٰی غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنۃ علیہ حرام۔

"حضرت سعد بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے: جس نے اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا (یعنی غیر باپ کو اپنا باپ قرار دیا)، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا حقیقی باپ نہیں ہے تو جنت اس پر حرام ہے"۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث:۶۷۶۶)

جیسا کہ آپ نے سوال میں درج کیا ہے، ہمارے معاشرے میں ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ نعمتِ اولاد سے بعض محروم لوگ کسی بچے کو گود لے لیتے ہیں، اسے لے پالک اور متبنّیٰ بناتے ہیں اور شریعت سے ناواقفی کی بناء پر تعلیمی اور دیگر تمام دستاویزات میں حقیقی باپ کے بجائے اپنا نام لکھوا دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقیقی باپ اور اسے حقیقی اولاد کا درجہ دے دیتے ہیں، اسے اپنا وارثِ شرعی سمجھتے ہیں، شرعاً یہ درست نہیں ہے۔ بلکہ اگر بالفرض لے پالک بچی ہے اور اس کے اور اس مربی باپ کے درمیان کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کے بچی کے محرم بنتے ہوں، جیسے چچا، ماموں وغیرہ اور یہ بچی بالغہ ہو جاتی ہے تو شرعاً ستر و حجاب کے احکام نافذ ہوں گے۔

اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہئے کہ نکاح کی صحت کے لئے لڑکے اور لڑکی (یعنی دولہا و دلہن) کا ایک دوسرے کے لئے اور گواہانِ نکاح کے لئے شخصی طور پر معیّن ہونا ضروری ہے۔

فتاویٰ درمختار میں ہے:

ولا المنکوحۃ مجھولۃ

"اور منکوحہ مجہولہ نہیں ہونی چاہئے"۔

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"اگر ایک شخص کی دو بیٹیاں ہیں اور اس نے کسی تعین کے بغیر ایک بیٹی کا نکاح کیا (یعنی کسی سے کہا کہ میں نے اپنی بیٹی تمہارے نکاح میں دی) تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے، لیکن اگر اس کی ان دو بیٹیوں میں سے ایک پہلے سے شادی شدہ ہے، تو اس نکاح کے لئے غیر شادی شدہ ازخود متعین ہو جائے گی (اور نکاح صحیح ہو جائے گا)، جیسا کہ "بزازیہ" اور "نہر" میں ہے، اسی طرح اگر ایک کسی سبب سے اس پر ویسے ہی حرام ہے (مثلاً وہ اس شخص کی رضاعی بہن ہے تو دوسری نکاح کے لئے متعین ہو جائے گی) آگے چل کر وہ لکھتے ہیں...... میں کہتا ہوں: اس عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ اگر مقدماتِ نکاح ایک معینہ لڑکی پر جاری ہوئے (مثلاً لڑکی کی طرف اشارہ کر کے باپ نے کہا کہ میں نے اپنی یہ لڑکی تیرے نکاح میں دی) اور وہ گواہوں کے نزدیک بھی ممتاز ہوگئی تو نکاح صحیح ہے"۔ (ردالمحتار: جلد ۴ ص ۶۶، داراحیاء التراث العربی)

آگے چل کر پھر درمختار میں ہے:

"(نکاح کے وقت) لڑکی کے وکیل نے لڑکی کے باپ کا نام غلط لیا اور وہ لڑکی ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہیں ہے تو یہ نکاح صحیح نہیں ہے"۔

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"یہ دونوں مسئلوں کی طرف راجع ہے، یعنی اگر وہ لڑکی بذاتِ خود موجود ہو اور اس کی طرف تعیین کیلئے اشارہ بھی کر دیا گیا ہے، لیکن اس کا یا اس کے باپ کا نام لینے میں غلطی ہوگئی، تو یہ صحت نکاح کے لئے مضر نہیں ہے، اس لئے کہ اشارۂ حِسّیہ سے جو معرفت حاصل ہوتی ہے، وہ نام لینے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے"۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۷۹-۷۸)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

"اور فتاویٰ ابواللیث میں ہے: ایک شخص نے لوگوں سے (عورت کا نام لئے بغیر) کہا: تم گواہ ہو جاؤ، میں نے اس عورت کا، جو اس گھر کے اندر ہے، نکاح (فلاں سے) کر دیا، تو اس عورت نے (اندر سے) کہا: مجھے قبول ہے، اور گواہوں نے اس کی بات سنی حالانکہ اسے شخصی طور پر دیکھا نہیں، تو اگر گھر میں صرف وہی ایک عورت موجود تھی تو نکاح صحیح ہے (کیونکہ وہ عورت شخصی طور پر متعین ہے) اور اگر گھر میں اس کے علاوہ کوئی اور عورت بھی تھی تو پھر یہ نکاح جائز نہیں ہے

(کیونکہ اب وہ شخصی طور پر متعین نہیں ہے)"۔

(فتاویٰ عالمگیری، جلد ۱، ص ۲۶۸، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

مولانا مفتی وقار الدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی متعدد سوالات کے جواب میں لکھا:

"نسب کا دارومدار ولدیت پر ہوتا ہے، اس لئے ہر جگہ جو حقیقی باپ ہے، اس کا نام لکھنا چاہیے تھا دستاویزات میں جو سوتیلے باپ کا نام لکھا، وہ غلط ہے۔ حدیث میں باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی نسبت کرنا سخت ممنوع ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے، اس سے توبہ کرنی چاہئے۔ نکاح کی صحت کے لیے دونوں کا ایک دوسرے کے نزدیک متعارف ہونا شرط ہے۔ لہٰذا لڑکی سے جب وکالت حاصل کی جائے گی اور وکیل خاص شوہر کو بتائے گا، تو لڑکی جس نام سے مشہور ہے اور پہچانی جاتی ہے، اس نام سے بتائے گا اور سوتیلے باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس نام کی طرف نسبت کر کے ایجاب کر سکتے ہیں، پھر بھی مناسب یہ ہے کہ اس کی سوتیلی بیٹی بتا کر تعارف کروا دیا جائے اور اگر اپنے اصل باپ کی نسبت سے مشہور ہے تو اس کا نام لے کر قبول کر لیا جائے۔ نکاح نامہ میں اصل باپ کا نام لکھا جائے اور سوتیلے باپ کی پرورش کردہ بیٹی لکھ دیا جائے"۔

ایک اور موقع پر ان سے دریافت کیا گیا کہ لڑکے نے اپنی دنیوی اغراض (یعنی ہندوستانی تھا مگر پاکستانی قومیت حاصل کرنے) کے لئے تمام دستاویزات میں باپ کے بجائے چچا کا نام لکھا، اب نکاح کے وقت مجبوری ہے کہ اگر اصل باپ کا نام لکھتا ہے تو دستاویزات (پاسپورٹ، شناختی کارڈ، تعلیمی اسناد وغیرہ) میں تضاد ہوتا ہے اور بہت سے معاملات میں قانونی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ تو اب کیا کرے۔ وہ جواب دیتے ہیں:

"اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف بیٹے ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے۔ حدیث میں اس کے بارے میں لعنت آئی ہے۔ نکاح میں لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت، لڑکے کا تعین ضروری ہے۔ اگر لڑکا اسی طرح جانا پہچانا جاتا ہے کہ چچا کو باپ ہونے کے اعتبار سے لوگ جانتے ہیں، تو وکالت صحیح ہو جائے گی اور نکاح بھی صحیح ہو جائے گا۔ اور اگر لڑکی یا لڑکے کے گھر والے اس کے حقیقی باپ کے اعتبار سے جانتے ہیں اور چچا کا بیٹا نہیں سمجھتے، تو پھر وکالت چچا کا بیٹا بتا کر حاصل کرنا صحیح نہیں ہوگی اور جب وکالت صحیح نہیں ہوگی، تو نکاح بھی نہیں ہوگا۔"

اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

"(۲) نکاح صحیح ہونے کے لیے شوہر اور بیوی کے نام اس طرح لئے جائیں گے، جس طرح وہ پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں، تا کہ وہ معین ہو جائیں۔ لڑکا جب مشہور اس طرح سے ہے کہ سوتیلے باپ کا بیٹا بتا کر لوگ پہچانتے ہیں اور اس کے حقیقی باپ کو کوئی پہچانتا نہیں ہے تو لڑکی سے وکالت حاصل کرتے وقت سوتیلے باپ کا نام لے کر وکالت حاصل کی جائے تا کہ وہ معین ہو جائے۔ اس صورت میں نکاح نامہ پر یہ لکھنا مناسب ہوگا کہ وکالت میں حقیقی باپ کا نام لکھنے کے بعد یہ لکھ دیں معروف ولد فلاں۔ یعنی سوتیلے باپ کی طرف نسبت کر دیں"۔

ایک اور سوال میں جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کسی لڑکی کی پرورش ماموں نے کی اور پھر ہر جگہ ولدیت کے ریکارڈ میں اپنا نام لکھ دیا اور شادی کے موقع پر لڑکی سے اجازت بھی اس کے ماموں کی ولدیت کی نسبت سے لی گئی، حالانکہ ایک گواہ کو اصل صورت حال بھی معلوم تھی کہ اس کا حقیقی والد فلاں ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں:

"قبول کرنے کے لیے شوہر چونکہ خود ہوتا ہے، وہ خود قبول کرتا ہے، اس لئے شوہر کے نام لینے یا اس کے والد کے نام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے لڑکی سے وکالت کے لیے شوہر کو معین کر کے وکالت لینا ضروری ہے۔ لہٰذا شوہر اگر ماموں کا بیٹا ہونے سے مشہور ہے اور لوگ اس کا بیٹا سمجھتے ہیں اور لڑکی سے ماموں کا لڑکا بتا کر وکالت حاصل کی گئی ہے تو یہ وکالت صحیح ہوگئی۔ اور وکیل نے اسی کے ساتھ نکاح کر دیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا۔ اور اگر لڑکی شوہر کو ماموں کا بیٹا ہونے کے اعتبار سے نہیں جانتی تھی نیز شوہر اس طرح مشہور بھی نہ تھا بلکہ اپنے حقیقی باپ کی طرف نسبت سے مشہور تھا اور وکالت ماموں کی طرف نسبت کرنے کے ساتھ حاصل کی گئی تو جس سے نکاح کرنے کے لیے لڑکی نے وکیل مقرر کیا، وکیل نے اس کے ساتھ نکاح نہ کیا، تو یہ نکاح فضولی ہوا تھا۔

نکاح فضولی امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت صحیح ہو جاتا ہے، جب لڑکی رخصت ہو کر شوہر کے پاس چلی گئی اور اس نے نکاح کو رد نہیں کیا تھا، تو ایسا نکاح رخصتی کی صورت میں ہو جاتا ہے۔ یہ نکاح کا حکم ہے۔ مگر حدیث میں اس شخص پر سخت مذمت آئی ہے کہ جو اپنے حقیقی باپ کے بجائے دوسرے شخص کی طرف نسبت کرے"۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب من ادعی الیٰ غیر ابیہ، صفحہ ۱۸۷، قدیمی کتب خانہ کراچی)

لہٰذا زید گناہ گار ہے، اس کو توبہ کرنی چاہئے۔ (وقار الفتاویٰ جلد سوم۔ ص ۴۰ تا ۴۲)"

ان تمام تفصیلات کی روشنی میں صورت مسئولہ میں اگرلڑکی دولہا، وکیل اور گواہوں کے نزدیک متعین تھی اور اسی ولدیت کے ساتھ معروف تھی تو نکاح صحیح ہوگیا، لیکن اپنے آپ کو حقیقی والد کے بجائے دوسرے کی طرف منسوب کرنے سے جو قرآن وحدیث کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، اس کا گناہ رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنی چاہئے۔ مزید یہ کہ بلاضرورت اس گناہ پر اصرار، استمرار اور دوام بھی نہیں کرنا چاہئے۔ آج کل نئے قوانین میں اس امر کی گنجائش ہے کہ آدمی عدالت کے روبرو پیش ہو کر اپنی صحیح ولدیت کا اقرار کرکے اس پر عدالت سے توثیق کرائے اور پھر اسے تمام ممکنہ ذرائع سے مشتہر کرکے اپنی تمام تعلیمی اسناد اور قانونی دستاویزات میں ولدیت کی تصحیح کرائے اور سابقہ اسناد و دستاویزات کو منسوخ کراکے نئی تصحیح شدہ دستاویزات و اسناد حاصل کرے۔ بعض لوگ جو لے پالک اور متبنّٰی ہیں، یا ان کے مربّی اور سوتیلے باپ صحیح شرعی مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود دنیا میں اپنی آبرو اور شان قائم رکھنے یا وراثت پانے کی امید پر اصل حقیقت پر بدستور پردہ ڈالے رکھتے ہیں، حالانکہ مومن کو اُخروی نجات کی زیادہ فکر کرنی چاہئے اور اصل وارثوں کی حق تلفی کا سبب نہیں بننا چاہئے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

مَنِ اقتطع شبرا من الارض طوقه الله اياه يومَ القيٰمة من سبع ارضين۔

"جس شخص نے ایک بالشت زمین بھی ظلماً لی، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات طبقوں تک کی اس زمین کو (اس کے گلے میں) طوق بنا کر ڈالے گا"۔

(صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۴۰۲۰)

ہاں کسی کو اگر اپنے لے پالک سے محبت ہے، لگاؤ ہے، وہ اس پر شفقت کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد کرنا چاہتا ہے، تو اپنی زندگی میں جتنا چاہے، مال وجائیداد اسے ہبہ کرسکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت ورکاوٹ نہیں ہے۔ البتہ اسے ساری جائیداد دے کر حقیقی وارثوں کو (اگر کوئی ہوں) محروم کرنا، قطع رحمی ہے اور عملاً اللہ تعالیٰ کے قانونِ وراثت کو باطل کرنا ہے۔

شوہر کے انتقال کی خبر سننے کے بعد عدت گزار کر عورت کا دوسرا نکاح کرنا اور پھر پہلے شوہر کی واپسی

سوال: ایک شادی شدہ مرد جنگ کے دوران شدید زخمی ہوجاتا ہے اور سال دو سال تک اس کی کوئی خبر نہ ملنے پر سرکاری طور پر اس کی موت کی تصدیق کردی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی بیوی کسی دوسرے مرد سے شادی کرلیتی ہے۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد پہلا شوہر سلامت واپس آجاتا ہے۔ اب ایسی صورت کے لئے حکمِ شرعی کیا ہے، شوہرِ اول کا نکاح باقی ہے یا شوہرِ ثانی کا نکاح شرعی طور پر بدستور قائم رہے گا؟ (زاہد اور عادل، مانسہرہ)۔

جواب: محض شدید زخمی ہونے یا لاپتہ ہونے سے عورت کا نکاح از خود ختم نہیں ہوتا، لیکن جب سرکاری طور پر اس کے شوہر کی وفات کی تصدیق کردی گئی تو اب عورت "تاریخِ تصدیقِ وفات" سے عدتِ وفات (یعنی ۱۳۰ دن) گزارنے کے بعد نکاح سے آزاد ہے اور اپنی مرضی سے اس کا دوسرا نکاح صحیح ہے۔ لیکن اگر اس عقدِ ثانی کے کچھ عرصے بعد شوہر اول رضائے الٰہی سے صحیح سلامت واپس آجاتا ہے تو اب اس عورت کے ساتھ اس کا عقدِ اول بدستور باقی اور قائم رہنے کا حکم دیا جائے گا۔ علامہ ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

"اور جب عورت کو اس کے شوہر کی وفات کی خبر دے دی گئی اور اس نے عدت (وفات) گزار کر نکاح (ثانی) کرلیا اور اس کے ہاں بچہ بھی پیدا ہوگیا، پھر اچانک اس کا شوہر اول (صحیح سلامت) واپس آگیا تو وہ (شرعاً) اسی کی بیوی ہے، کیونکہ وہ اس کے نکاح میں تھی اور نکاح پر ایسے اسباب لاحق نہیں ہوئے جو رشتۂ نکاح کو توڑنے کا باعث ہوں، لیکن جب تک شوہر ثانی کی عدت نہ گزار لے وہ (شوہر اول) اس سے قربت نہ اختیار کرے"۔ (بدائع الصنائع ج ۴ ص ۴۹۰)

اب رہا یہ سوال کہ شوہر ثانی کے ہاں اس عورت کا جو بچہ پیدا ہوا اس کا نسب کس کی طرف منسوب ہوگا؟ تو اس سلسلے میں علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں: "رہا بچے (کے سلسلۂ نسب) کا مسئلہ تو اس میں ائمہ کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام ابوحنیفہ کہتے ہیں: وہ پہلے کا ہے

کتاب الطلاق

(۲) اور امام ابو یوسف کہتے ہیں: اگر شوہرِ ثانی سے وطی کے بعد چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ پیدا ہوا تو وہ شوہرِ اول کی طرف منسوب ہوگا اور اگر وہ بچہ چھ ماہ یا اس سے زائد عرصہ کے بعد پیدا ہوا تو اس کا نسب شوہر ثانی کی طرف منسوب ہوگا۔

(۳) امام محمد کہتے ہیں: اگر بچہ شوہرِ ثانی کی وطی کے دو سال کے اندر پیدا ہوا تو وہ شوہرِ اول کا ہے اور اگر دو سال کے بعد پیدا ہوا تو اس کا نسب شوہرِ ثانی کی طرف منسوب ہوگا"۔

(بدائع الصنائع ج ۴ ص ۴۹۱)

اس کے بعد علامہ کاسانی نے تینوں ائمہ کے دلائل کا ذکر کیا ہے، جن میں سے عقلی اعتبار سے امام ابو یوسف کا قول قوی معلوم ہوتا ہے کہ اگر شوہر ثانی کی وطی سے چھ ماہ کے اندر عورت کا بچہ پیدا ہوا تو اس کا نسب پہلے شوہر کے ساتھ متعلق ہوگا، کیونکہ چھ ماہ سے کم مدت میں کامل وتمام بچے کی ولادت متصور نہیں ہوتی، اور چھ ماہ یا اس کے بعد بچہ پیدا ہوا تو وہ شوہر ثانی کا ہوگا، کیونکہ یہ نکاح ثانی وطی بالشبہ کی مانند ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ کا قول رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں قوی معلوم ہوتا ہے کہ: "بچہ کا نسب اس سے متعلق ہے جس کے لئے (اس کی ماں) فراش ہے (یعنی نکاح صحیح کے ساتھ اس کی منکوحہ بیوی ہے) اور زانی کے لئے پتھر ہے (یعنی سوائے محرومی کے کچھ نہیں ہے)"۔

دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ امام اعظم کے قول کو زنا پر محمول کریں گے اور امام ابو یوسف کو قول "وطی بالشبہ" پر۔

☆☆☆......☆......☆......☆......☆☆☆

کورٹ میرج کے نتیجے میں رخصتی سے قبل طلاق کا حکم

سوال: روزنامہ جنگ کراچی ۴ر جنوری ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کے زیرعنوان ایک صاحب نے مفتی صاحب سے دریافت کیا کہ ان کی صاحبزادی نے جو میڈیکل کالج کی طالبہ ہے، اپنے کالج کے ایک لڑکے کے ساتھ کورٹ میرج کرلی، بعد میں لڑکے نے اپنے والد کی فہمائش پر تین مرتبہ طلاق لکھ کر دے دی، ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی، اب لڑکا اور لڑکی اس رشتے کو دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر لڑکا تین مرتبہ طلاق لکھ کر دے تو کیا طلاق واقع ہوجاتی ہے اور اس لڑکے کا دوبارہ اس لڑکی کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے، اگر ہوسکتا ہے تو کن شرائط پر؟ مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے جواب میں لکھا: ''رخصتی سے قبل طلاق دی جائے تو بھی ہوجاتی ہے، البتہ رخصتی سے قبل ہونے والی طلاق، ایک طلاق بائن شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اگر یہ لڑکا اور لڑکی دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو شرعی و اخلاقی ضابطوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دوبارہ نکاح بھی کرسکتے ہیں۔'' ہمارے ہاں اس مسئلے پر بحث ہورہی ہے، ازراہ کرم رہنمائی فرمائیں کہ کیا یہ جواب بالکل درست ہے؟

(قاری محمد حنیف طیب، خطیب جامع مسجد رحمانیہ۔ گوہر آباد، کراچی)

جواب: ہماری رائے میں مفتی صاحب کا جواب مجمل ہے اور سوال میں درج صورت مسئولہ کے تمام پہلوؤں پر مشتمل نہیں ہے، اس اجمال کی وجہ سے لوگ اس جواب کو تمام ممکنہ صورتوں پر قیاس کرسکتے ہیں، حالانکہ حلال و حرام کے مسئلے میں احتیاط از حد ضروری ہے۔ ہمارے معاشرے میں نوجوان نسل کی مخلوط تعلیم، دفاتر اور اداروں میں مرد و زن کا بلاحجاب میل جول اور ایک ہی جگہ ایک ہی جیسے حالات میں رفیق کار یا افسر و ماتحت کی حیثیت سے اکٹھے کام کرنا اور عام زندگی میں آزادانہ میل ملاپ کے مواقع عام ہیں اور نہ صرف یہ کہ انہیں معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ فیشن، تجدد پسندی اور لبرل ازم کا لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات میں ایسے حوادث و واقعات کا رونما ہونا حالات اور ماحول کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔

مزید یہ کہ ''رخصتی'' کی اصطلاح جو ہمارے معاشرے میں رائج ہے، اس کا عرف عام میں

معنی یہ ہے کہ دلہن کو نکاح کے بعد باقاعدہ والدین کے گھر سے رخصت کر کے شوہر کے گھر لے جایا جاتا ہے، حالانکہ شرعاً نکاح کے ساتھ ہی وہ اس کی منکوحہ بیوی ہو جاتی ہے اور ان کے میل ملاپ پر ازروئے شرع کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا کورٹ میرج کے بعد اگر ''زوجین'' میں ''خلوتِ صحیحہ'' قائم ہو جاتی ہے (یعنی تنہائی میں باہمی ملاپ کا ایسا موقع جس میں ازدواجی عمل میں کوئی مانع نہ ہو) تو مباشرت ہوئی یا نہ، عرفی معنی میں رخصتی عمل میں آئی ہو یا نہ، تو یہی ''خلوتِ صحیحہ'' شرعاً رخصتی کے قائم مقام ہے۔ اور موجودہ معاشرے میں جہاں لڑکی گھر سے باہر جا کر باقاعدہ نکاح یا کورٹ میرج کر سکتی ہے تو اسے ''خلوتِ صحیحہ'' کے مواقع بھی میسر آ سکتے ہیں۔ لہٰذا زوجین سے معلوم کر لیا جائے، اگر ان کے درمیان خلوتِ صحیحہ ہو گئی ہے تو وہ حکماً رخصتی ہی کے قائم مقام ہے اور ایسی صورت میں تین طلاق، خواہ تین جدا جملوں میں، باری باری بول کر یا لکھ کر دی ہوں، باہم جمع ہو کر مؤثر ہو جائیں گی اور ان پر بائن کا حکم نہیں لگے گا بلکہ مغلظہ شمار ہوں گی۔ اور اگر زوجین کے درمیان ''خلوتِ صحیحہ'' نہیں ہوئی، لیکن شوہر نے ایک ہی جملے میں تین طلاق بول کر یا لکھ کر دے دی ہیں تو وہ تینوں مؤثر ہوں گی، ان پر بائن کا اطلاق نہیں ہوگا اور ''تحلیل شرعی'' کے بغیر دونوں میں عقدِ ثانی نہیں ہو سکتا۔

مفتی صاحب نے جو ''طلاق بائن'' کا حکم لگا کر دونوں کے درمیان عقدِ ثانی کے جواز کا حکم بیان کیا ہے، وہ صرف اس صورت میں ہے کہ نکاح کے بعد زوجین میں ''خلوتِ صحیحہ'' نہ ہوئی ہو اور شوہر نے تین جملے الگ الگ بول کر یا لکھ کر تین طلاقیں دی ہوں کہ میں نے تمہیں (یا اپنی بیوی فلاں کو) طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی، میں نے تمہیں طلاق دی۔ تو اس صورت میں پہلی طلاق مؤثر ہو کر بائن ہو جائے گی اور دوسری دو لغو ہو جائیں گی اور دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ عدت کے اندر یا عدت کے بعد بھی نکاح کر سکتے ہیں اور آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا، خدانخواستہ آئندہ اس نے دو طلاق دے دیں تو یہ دو پہلی کے ساتھ جمع ہو کر مغلظہ ہو جائیں گی اور بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔

شوہر کا طلاق سے انکار، دیانت وقضا کا فرق

سوال: ایک اخبار کی جمعہ ۱۷ اگست کی اشاعت میں ایک مستفتی عاشق حسین صاحب نے مفتی

نظام الدین شامزئی صاحب سے دریافت کیا: ''میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوئی اور خاوند نے غصے میں اپنی بیوی سے تین چار مرتبہ کہا کہ میں نے تم کو طلاق دی، تم اپنے میکے چلی جاؤ، شام کو بھی یہی الفاظ دہرائے، اب شوہر کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو میکے جانے کو کہا تھا، طلاق نہیں دی، جبکہ عورت نے قرآن پر حلف اٹھایا کہ اس کے شوہر نے طلاق دی ہے۔ ان دونوں کے درمیان اس گفتگو کا کوئی گواہ بھی نہیں۔ کیا یہ طلاق واقع ہو چکی ہے؟'' مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے جواب دیا: ''تین طلاقیں واقع ہو گئیں۔ شوہر کے قول کا اعتبار نہیں۔ دونوں علیحدگی اختیار کر لیں۔'' ایک مولانا صاحب نے مفتی صاحب کے جواب پر اپنے تحفظ کا اظہار کیا ہے۔ ازراہِ کرم شریعتِ مطہرہ اور فقہ حنفی کی روشنی میں اس کا جواب تحریر فرمائیں''۔

(سعیدالرحمٰن۔ نکیال، آزاد کشمیر)

جواب: اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک دیانت اور دوسرا قضا ہے۔ ''دیانت'' سے مراد یہ ہے کہ معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے، کیونکہ ظاہراً کوئی شخص جھوٹ بھی بولے، حقیقت حال اسے معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا ''دیانت'' سے مراد ہے: ''بندے اور رب کے درمیان معاملہ۔'' لہٰذا اگر کوئی شخص جھوٹی قسم کھا کر کوئی مفاد حاصل کر لیتا ہے یا کسی کے حق کو روک لیتا ہے یا اپنی ذات سے کسی ضرر کو دفع کر لیتا ہے، تو یہ محض دفع الوقتی ہے اور خودغرضی اور مفاد پرستی ہے۔ آخرت میں فیصلہ، اللہ تعالیٰ کی عدالت میں، حقیقتِ حال پر ہوگا اور اگر وہ حقیقتاً طلاق دے چکا ہے، مگر گواہ نہ ہونے اور حلفاً انکار کرنے کے بعد بیوی کو اپنے نکاح میں روک لیتا ہے تو بقیہ عمر حرام کی زندگی گزارے گا اور آخرت میں اس کی سزا پائے گا۔ ''قضا'' سے مراد ہے کہ حاکم یا قاضی کی عدالت میں جب کوئی مقدمہ آتا ہے تو قاضی اصولِ عدل اور مقدمے کے جو شواہد اور قرائن اس کے سامنے ریکارڈ پر موجود ہیں، ان کی روشنی میں فیصلے کرے گا۔ اس میں بعض اوقات فیصلہ خلافِ واقعہ بھی ہو سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص قسم کھا کر اپنے حق کا انکار کر دیتا ہے اور مدعی کے پاس ثبوتِ حق کے لئے گواہ نہیں ہیں یا کوئی مدعی جھوٹے گواہ پیش کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرا دیتا ہے تو اس کا اخروی وبال قاضی یا حاکم پر نہیں آئے گا، بشرطیکہ اس نے اپنی پوری ذہنی اور فکری قوت واہلیت کو صرف کر کے، عدل کے تمام تقاضوں کو پورا کر کے حق تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کی ہو، لیکن حقیقت حال کے اعتبار سے اس میں ناکام رہا ہو۔ ایسی صورتحال کے

بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات واضح ہیں، مثلاً آپ نے فرمایا: ہم ظاہر حال کے مطابق یعنی معاملے کے تمام شواہد وقرائن کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں اور باطن (یعنی حقیقتِ حال) کا معاملہ اللہ کے سپرد کردیتے ہیں (یعنی آخرت میں اصل اور حق پر فیصلہ ہوگا، لہٰذا حیلہ اور مکروفریب یا اثرورسوخ سے کسی کا حق مارنے والے یا حرام کا ارتکاب کرنے والے اپنے ہولناک انجام کے لئے تیار رہیں) رسول اللہ ﷺ کو معاملات کے باطن اور اسرار کا علم اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ غیبی علم سے ہوجاتا تھا، لیکن دیگر کسی حاکم یا قاضی کے لئے تو ایسا نہیں ہے، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے عدل کا ایک عمومی اصول بیان فرمایا۔

حدیث میں ہے: ''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میرے پاس مقدمے لے کر آتے ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے موقف کو دوسرے کے بہ نسبت زیادہ زوربیان سے پیش کرے اور میں (ظاہری شواہد کی بناء پر) اس ساعت کے اعتبار سے بالفرض اس کے حق میں فیصلہ دے دوں، (حالانکہ وہ حق پر نہ ہو) سو جس شخص کو میں اس کے بھائی کا حق دے دوں، اس کو نہ لے، کیونکہ میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں''۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث:۴۳۵۹)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حقائق اور معاملات کے باطن پر مطلع فرمادیا تھا، لیکن یہ بات بھی رسول اللہ ﷺ نے ایک عمومی ضابطۂ عدل کے طور پر بیان فرمائی تاکہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ قاضی یا حاکم مقدمے کے قرائن وشواہد کی بنا پر جو فیصلہ کرتا ہے اور اجتہاد کرتا ہے، اگر اس سے حق تک پہنچنے میں خطا ہوجائے تو اگرچہ ظاہراً اور قانوناً اس کا فیصلہ نافذ ہوجائے گا، لیکن قاضی کا یہ غلط فیصلہ حقیقتِ حال کو تبدیل نہیں کرتا، ممکن ہے دنیا میں کوئی شخص چند دن عیش وعشرت کے گزارلے، مگر آخرت میں فیصلہ صرف اور صرف حق پر ہوگا اور دنیا کی اس عارضی لذت پر وہ آخرت میں سزا کا حقدار ہوگا۔

اس ضروری تمہید کے بعد اب آتے ہیں اصل مسئلے کی طرف، مفتی نظام الدین شامزئی صاحب کا فتویٰ درست نہیں ہے، شاید انہوں نے مسئلے پر پوری توجہ نہیں فرمائی، امید ہے وہ مطلع ہونے پر ضرور اپنے فتوے سے رجوع کریں گے۔ اسلامی نظامِ عدل کا اصل الاصول، جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ: ''کسی دعوے کا بارِ ثبوت مدعی پر ہے (گواہ پیش کرنا اس کی

ذمہ داری ہے) اور اگر مدعی کے پاس گواہ نہیں ہیں تو مدعیٰ علیہ کو (دعوے سے انکار کی صورت میں) قسم دی جائے گی''۔

مدعی کی قسم کا اعتبار نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں چونکہ مدعیہ (بیوی) کے پاس (ثبوتِ دعویٰ کے لئے) گواہ نہیں ہیں، کیونکہ اس کے بقول شوہر نے جب طلاق دی تو پاس کوئی بھی نہیں تھا اور شوہر طلاق دینے سے منکر ہے، تو اب شوہر کو قسم دی جائے گی، اور اگر وہ عدالت میں یا مفتی کے سامنے قسم کھا کر کہہ دیتا ہے کہ میں نے ہرگز طلاق نہیں دی تو بیوی کا دعوائے طلاق قضاءً رد ہوجائے گا اور وہ بدستور اس کی بیوی رہے گی۔ اور دنیا کی کسی بھی عدالت میں مدعی کے دعوائے محض پر (یعنی جسے وہ عدالت میں شواہد سے ثابت نہ کرسکے، نہ ویسے اور نہ ہی اسے قسم دلاکر) اس کے حق میں فیصلہ نہیں دیا جاتا۔ لیکن یہ فیصلہ دنیوی اعتبار سے نافذ ہونے کے باوجود، عنداللہ حقیقتِ حال کو تبدیل نہیں کرتا، اگر عنداللہ بیوی سچی ہے اور شوہر انکار میں جھوٹا ہے تو اس کی زندگی حرام میں گزرے گی اور وہ آخرت میں سزا کا مستحق ہوگا۔ ہماری کتب فتاویٰ میں یہی لکھا ہے جو میں نے وضاحت اور تفصیل کے ساتھ تحریر کردیا ہے۔ ہمارے فقہاءِ کرام نے اس سلسلے میں ایک مسئلہ اور تحریر فرمایا ہے کہ اگر عورت کو پورا یقین ہو کہ شوہر نے اس کو تین طلاقیں دی ہیں، لیکن اس کے پاس گواہ نہیں ہیں اور شوہر حلف اٹھا کر انکار کررہا ہے، تو اگرچہ قضاء اور قانوناً نکاح قائم ہے، لیکن اگر وہ کسی تدبیر یا خلع کے ذریعے گلوخلاصی کراسکتی ہے تو ضرور ایسا کرے۔

تفویضِ طلاق

سوال: کیا طلاق کا حق شرعاً بیوی کو تفویض کیا جاسکتا ہے؟ یہ تفویض محدود ہوگی یا غیر محدود، مشروط ہوگی یا غیر مشروط، تفصیل سے تحریر کیجئے۔ (ام کلثوم۔گلشن اقبال، کراچی)

جواب: طلاق، اصالتاً اور بالذات شوہر کا حق ہے اور وہ جب چاہے، اسے استعمال کرسکتا ہے۔ لیکن شوہر یہ ''حق طلاق'' بیوی کو تفویض بھی کرسکتا ہے، خواہ نکاح کے وقت کرے یا بعد میں کسی وقت، اگر شوہر اپنی بیوی سے یہ کہے کہ تو جب چاہے یا جب کبھی چاہے یا جس وقت چاہے یا جس وقت بھی چاہے، اپنے آپ کو طلاق دے سکتی ہے، تو یہ حقِ تفویضِ طلاق دائمی اور موقت ہوگا، جب تک وہ اس شوہر کے نکاح میں ہے، اس حق کو استعمال کرسکتی ہے۔ البتہ اگر بیوی کسی خاص موقع پر

ناہمی تکرار کے دوران شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اور وہ جواباً کہے کہ: ”تم اپنے آپ کو طلاق دے دو“، یا یہ کہے کہ ”تمہارا معاملہ تمہارے اختیار میں ہے“، یا یہ کہ ”تم اپنا فیصلہ خود کرلو وغیرہ اور یہ کلمات طلاق کی نیت سے کہے تو اگر بیوی اسی مجلس میں یہ حق استعمال کرلے، یعنی یوں کہے کہ ”میں نے اپنے آپ کو طلاق دی“، ”میں نے اپنے نفس کا خود فیصلہ کرلیا“ وغیرہ تو طلاق واقع ہوجائے گی اور اگر اس مجلس میں یہ حق استعمال نہ کیا تو بعد میں اسے یہ حق حاصل نہیں رہے گا۔

عدالتی طلاق

سوال: عدالتی طلاق اور شرعی طلاق میں کیا فرق ہے؟ (عطیہ۔ناظم آباد)

جواب: عدالت کے ذریعے جج یا قاضی زوجین کے درمیان جو تفریق (SEPARATION) کرتے ہیں، وہ طلاق نہیں کہلاتی، وہ نکاح کا فسخ (DISSOLUTION OF MARRIAGE) کرنا کہلاتا ہے۔ ہماری عدالتیں جو عدالتی تنسیخ نکاح پر خلع کا اطلاق کرتی ہیں، یہ بھی درست نہیں ہے، کیونکہ خلع فریقین کی رضامندی سے ہوتا ہے، بیوی اپنے مہر یا مالی حق سے دستبردار ہوتی ہے اور اس کے عوض شوہر اسے طلاق دیتا ہے جو طلاق بائن ہوتی ہے۔ عدالت تو اپنے اختیار سے شوہر کی مرضی کے خلاف نکاح کو فسخ کرتی ہے۔ اگر اس عدالتی فسخ نکاح میں شرعی حدود کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو یہ شریعت کے مطابق ہے، ورنہ نہیں۔

ارادۂ طلاق، طلاق نہیں

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ مورخہ ۱۶ ر مارچ ۲۰۰۱ء بروز جمعہ ”آپ کے مسائل اوران کا حل“ (روزنامہ جنگ کراچی) میں درج ذیل سوال شائع ہوا ہے:

”زید کی شادی زینب سے ہوئی، پھر زید نے فاطمہ سے نکاح کرنے کی کوشش کی مگر فاطمہ نے یہ شرط رکھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے۔ زید نے جھوٹ کے طور پر فاطمہ سے کہا کہ میں نے پہلی بیوی کے لئے طلاق لکھ کر رکھ دی ہے جبکہ اس نے لکھ کر نہیں رکھی اور زید نے فاطمہ سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا، میری طرف سے مطمئن ہوجاؤ، میں اس کو طلاق دے دوں گا اور آپ سمجھ لیں کہ میں نے اس کو طلاق دے دی۔ یہ الفاظ زید نے کئی مرتبہ دہرائے شریعت زید کے ان الفاظ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ کیا ان الفاظ سے اس کی پہلی بیوی کو طلاق

واقع ہوگئی یا نہیں؟“

ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب نے اس کے جواب میں لکھا کہ طلاق واقع ہوگئی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”صورتِ مسئولہ میں زید نے کئی مرتبہ اپنی بیوی کے بارے میں یہ الفاظ کہے کہ ”میں نے اس کو طلاق دے دی“ لہٰذا زید کی بیوی پر تین طلاق واقع ہوچکی ہیں اور وہ زید پر حرمت مغلظہ کے ساتھ حرام ہوچکی ہے اب رجوع کی کوئی صورت نہیں اور بغیر تحلیل شرعی کے زید اور زینب کا آپس میں نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔“ (روزنامہ ”جنگ“ کراچی)

صورت مسئولہ میں از روئے شریعت کیا واقعی طلاق واقع ہوچکی ہے؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرما کر ممنون و ماجور ہوں۔ (کامران قریشی۔گلشن اقبال، کراچی)

جواب: ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب کا جواب درست نہیں ہے، غالباً انہوں نے سرسری انداز میں جواب دے دیا ہے اور مسئلے کی باریکی پر توجہ نہیں فرمائی۔ شوہر کا یہ کہنا کہ: ”میں اس کو طلاق دے دوں گا“، یہ مستقبل میں طلاق دینے کے ارادے کا اظہار ہے، اور شرعاً ارادۂ طلاق، طلاق نہیں ہے۔ طلاق انشاءات میں سے ہے یعنی شوہر واضح طور پر ارادۂ طلاق سے کہے کہ: میں تمہیں طلاق دیتا ہوں (بصیغۂ حال) یا ”میں نے تمہیں طلاق دی“ (بصیغۂ ماضی)۔ اور شوہر کا یہ کہنا کہ: ”آپ سمجھ لیں کہ میں نے اس کو طلاق دے دی“، اس سے بھی طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ یہ انشاء طلاق نہیں ہے۔ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ العزیز سے ایک طویل استفتاء میں دریافت کیا گیا کہ شوہر نے لکھا: ”اس خط کو بطور طلاق نامہ کے تصور فرمائیں“، انہوں نے جواب دیا: ”صالح ایقاع طلاق نہیں کہ بطور طلاق نامہ تصور فرمائیں“ کے صاف یہ معنی کہ حقیقت میں ”طلاق نامہ“ نہیں، آگے انہوں نے فتاویٰ قاضی خان کی عبارت سے استدلال کیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ”(ترجمہ) ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا: مجھے طلاق دے دو، شوہر نے کہا: سمجھو دے دی (دادہ انگار او کردہ انگار)، طلاق واقع نہیں ہوئی، خواہ اس نے نیت بھی کی ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے عربی زبان میں کہا ہو: ”احسبی انت طالق“ (یعنی سمجھو کہ تمہیں طلاق دے دی)، خواہ اس نے یہ الفاظ کہے ہوں اور طلاق کی نیت بھی کی ہو“۔

(فتاویٰ قاضی خان، کتاب الطلاق، ج ۱ ص ۳۱۰، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، فتاویٰ رضویہ ج ۱۲ ص ۶۳۱

مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن لاہور)

طلاق ثلاثہ کا مسئلہ

سوال: آپ سے ازدواجی زندگی کے ایک مسئلے کے متعلق معلوم کرنا ہے میری شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں میرے دو لڑکے ہیں، ایک لڑکا 7 سال کا ہے اور دوسرا لڑکا 4 سال کا ہے۔ میرے شوہر غصے کے بہت تیز ہیں، میں نے ہمیشہ ہر معاملے میں ان کے ساتھ صبر وتحمل کے ساتھ وقت گذارا ہے۔ میں اپنے شوہر کا ساتھ دینے کے لئے اسکول میں ٹیچر کے طور پر پڑھا رہی تھی لیکن کچھ دنوں سے ان کے ذہن میں میرے متعلق شکوک وشبہات آ رہے ہیں جس کی وجہ سے میں نے اسکول کی نوکری چھوڑ دی، لیکن پھر بھی سکون نہیں تھا۔ تقریباً 15 دن پہلے ہفتہ کی رات کو 2:50 کے وقت میں سو رہی تھی، میرے شوہر نے مجھے پکڑ کر اٹھایا اور مختلف الزامات لگا کر کہا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، تقریباً 8 مرتبہ انہوں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا اور جب میں بہت رونے لگی تو کہنے لگے کہ میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا اور میں قرآن پاک اٹھانے کو تیار ہوں، مجھے کچھ یاد نہیں اور نہ میں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ طلاق واقع ہو گئی ہے یا نہیں، کیونکہ میرے شوہر اس بات سے انکاری ہیں کہ انہوں نے طلاق کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اللہ اور رسول ﷺ کے مطابق آپ یہ بتائیں کہ یہ طلاق واقع ہوئی کہ نہیں۔ میں اس سلسلہ میں بہت پریشان ہوں، اپنی والدہ کے گھر آ گئی ہوں۔ میرے شوہر مجھے بہت تنگ کر رہے ہیں۔ آپ کتاب وسنت کی روشنی میں میرا مسئلہ حل کریں۔ (فرحین عظیم رضوی، R-618 بلاک 14 ایف بی ایریا کراچی)

جواب: جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے، خواہ ارادتاً سنجیدگی سے دے یا بطورِ مذاق دے، کوئی گواہ ہو یا نہ ہو، عنداللہ طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

ثلث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة۔

"تین چیزیں ایسی ہیں (کہ وہ ہر بہر طور نافذ اور مؤثر ہوتی ہیں) سنجیدگی سے کہی جائیں تب بھی اور مذاق میں کہی جائیں تب بھی، یعنی نکاح، طلاق اور رجعت"۔

(ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

اگر کوئی شوہر تین طلاقیں دے کر منکر ہو جاتا ہے اور طلاق کے وقت کوئی گواہ موجود نہیں تھے

اور اس کے بعد بدستور اسی مطلقہ عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہے تو یہ شرعاً حرام اور زنا کی زندگی ہے، کیونکہ خلق کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے، خالق کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

صورتِ مسئولہ میں سائلہ طلاقِ ثلاثہ کی مدعیہ ہے اور شوہر منکر ہے اور مدعیہ کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے گواہ نہیں ہیں، وہ اسے قائل کریں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کے عذاب سے ڈرو، اگر انہیں خوفِ خدا آ جائے تو شریعت پر عمل کریں، اور اگر خدانخواستہ وہ بدستور انکار پر ڈٹے رہیں تو شوہر کے انکار اور گواہوں کے نہ ہونے کی وجہ سے قضاءً حرمت اور تفریق کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، لہٰذا بظاہر حکماً نکاح قائم رہے گا۔ اگر سائلہ کو کامل یقین ہے کہ تین طلاقیں دے دی گئی ہیں تو جب تک اس کے بس میں ہے، اسے اپنے نفس پر قابو نہ دے، اور اگر وہ عاجز د بے بس ہو جائے تو عنداللہ گناہگار نہیں ہوگی۔

طلاق کا مسئلہ

سوال: میرے شوہر نے پہلے مجھ کو ایک مرتبہ طلاق دے دی اس کے بعد جب میں قاری صاحب سے اس مسئلے کے بارے میں معلوم کرنے گئی تو انہوں نے کہا کہ اپنے شوہر کو بھیج دیں تاکہ میں ان سے بھی معلوم کر لوں دو دن کے بعد جب میں نے ان سے کہا کہ آپ کو قاری صاحب نے یاد کیا ہے تو غصے میں آ گئے اور کہا کہ تم ان ہی چکروں میں پڑی رہو تم کیا چاہتی ہو جو باقی طلاق ہے وہ بھی دے دوں میں تم کو بہت جلد طلاق دے دوں گا، میں نے کہا کہ میں نے تو صرف آپ سے یہ کہا ہے کہ قاری صاحب نے آپ کو بلایا ہے پھر کہا کہ جا اب تو میں نے ہزار مرتبہ دے دیا لاکھ مرتبہ دے دیا جا اب تو ہو گیا پھر دو یا پانچ منٹ کے بعد کہا کہ میں نے تم کو طلاق نہیں دیا ہے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی...... صورت مسئولہ میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اور کتنی واقع ہوئیں۔

(ایک خاتون معرفت مولانا علی عمران صدیقی، خطیبِ مسجد بیت المحمود۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

جواب: پہلی مرتبہ آپ کے شوہر نے آپ کو ایک طلاق دی جو واقع ہو گئی، اس میں انہیں رجوع کا حق حاصل تھا، آپ دونوں اس کے بعد بدستور میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے رہے تو رجوع ہو گیا۔ بعد میں مذاکرہ طلاق کے موقع پر کہا کہ: "جا اب تو میں نے ہزار مرتبہ دے دیا، لاکھ

مرتبہ دے دیا، جا اب تو ہوگیا''۔ تو اس سے بقیہ دو طلاق بھی واقع ہوگئیں۔ اب آپ دونوں کا ازدواجی تعلق ختم ہوگیا ہے۔ حدیث پاک میں ہے طلاق، نکاح اور عتاق (یعنی غلام کو آزاد کرنا، جب تک غلامی کا رواج تھا) کے الفاظ سنجیدگی سے کہے جائیں یا مذاق کے طور پر، بہرصورت نافذ العمل اور موثر ہوجاتے ہیں، بعد میں نادم ہونے یا واپس لینے سے واپس یا غیر موثر نہیں ہوتے، اسی لئے حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ: ''مباح کاموں میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے'' یہ ایسے ہی ہے جیسے بندوق یا ریوالور کا ٹریگر سنجیدگی سے دبایا جائے یا محض مذاق کے طور پر، اگر اس میں گولی ہے تو چل جائے گی اور جس نشانے پر لگے گی، اسے ضرب لگے گی۔ اردو زبان میں غیظ و غضب اور غصے کے اظہار کے لئے لفظ طلاق کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں، یہ لوگوں کی کم علمی، نادانی اور جہالت ہے کہ انہیں اظہارِ مردانگی کے لئے صرف لفظ طلاق ہی یاد رہتا ہے، غصہ تو ویسے بھی شرعاً ناپسندیدہ ہے، اس لئے حدیث پاک میں ہے کہ غصہ آئے تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہوا ہو تو لیٹ جائے۔ غصے سے مغلوب ہوجانا محض نفس امارہ کی اطاعت ہے، اللہ تعالیٰ غصہ ضبط کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

لکھ کر دینا ''طاق دیا ہوں''

سوال: میں نے بقائمی ہوش و حواس اپنی بیوی کو لکھ کر دیا ''طاق دیا ہوں، طاق دیا ہوں، طاق دیا ہوں''۔ ایک مفتی صاحب نے اس پر فتویٰ دیا ہے کہ ''لفظ طلاق بولنے میں عالم جاہل سب برابر ہیں، لہٰذا بیوی پر تین طلاق واقع ہوگئیں، اور وہ بحرمتِ صریحہ مغلظہ حرام ہوگئی اور اب اس کے ساتھ تحلیل شرعی کے بغیر نکاح جائز نہیں ہے۔'' دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ فتویٰ درست ہے یا شریعت میں دونوں کے دوبارہ ملاپ کی گنجائش ہے؟ (منظور حسین۔ عزیز آباد، کراچی)

جواب: مفتی صاحب کا یہ فتویٰ درست نہیں ہے۔ اپنی بیوی کو تین مرتبہ ''طاق دیا ہوں'' کہنے یا لکھنے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوئی اور وہ بدستور آپ کے نکاح میں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ ج۱ ص۳۵۷ پر ہے'' اور اگر (لفظ طلاق میں سے) صرف ل کو حذف کرکے کہا کہ: ''تجھے طاق ہے'' تو طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ اس نے نیت بھی کی ہو اور اگر کہا: تجھے طاق ہے تو کچھ واقع نہیں ہوگا، خواہ نیت بھی کی ہو، کیونکہ عرب میں کلام کے آخری حرف کو حذف کرنا عادت

ہے، اور فقیہ ابوالقاسم نے کہا: اگر کوئی عجمی شخص فارسی میں آخری حرف کو حذف کرکے (طلا) کہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ نیت بھی کی ہو، کیونکہ لفظ کے آخری حرف کو حذف کرنے کی عجم میں عادت ہی نہیں ہے۔

کسی شرط کے ساتھ معلق کی گئی طلاق سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟

سوال: آپ کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ میں نے اپنی بیوی کو یہ الفاظ ادا کردیئے ہیں کہ ''اگر تمہاری والدہ میری غیر موجودگی میں میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں آئی تو تمہیں تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔'' برائے مہربانی اس سلسلے کا حل تحریر فرمادیں تاکہ میری بیوی کی والدہ میرے گھر آسکے۔ (ع۔ن، کراچی)

جواب: موجودہ صورتحال میں اگر آپ کی بیوی کی والدہ (ساس) آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے گھر آئیں تو ان پر تین طلاق واقع ہوجائیں گی۔

اگر آپ اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ تو یہ تدبیر کریں کہ اپنی بیوی کو ایک طلاق رجعی دے دیں اور دورانِ عدت ان سے عملاً یا قولاً رجوع نہ کریں، عدت گزرتے ہی یہ طلاق بائن ہوجائے گی۔ عدت وہ آپ ہی کے مکان پر گزاریں گی اور اگر آپ نے اب تک ان کا مہر ادا نہیں کیا تو مہر بھی آپ کو ادا کرنا ہوگا۔ عدت گزرنے کے بعد آپ کی ساس آپ کی عدم موجودگی میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے گھر آجائیں۔

چونکہ اس وقت آپ کی بیوی آپ کے نکاح سے خارج ہوں گی اس لئے یہ شرط غیر موثر ہوجائے گی۔ بعد ازاں آپ دونوں باہمی رضامندی سے عقدِ ثانی کرسکتے ہیں اس عقد کے لئے آپ کو مہر بھی باہمی رضامندی سے مقرر کرنا ہوگا، اس عقدِ ثانی کے بعد آپ کی ساس آپ کی موجودگی یا غیر موجودگی میں بلا روک ٹوک آپ کے گھر آسکتی ہیں۔ لیکن اب آئندہ کے لئے آپ کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا۔

عدالتی خلع کا شرعی حکم

سوال: زید کی بیوی نے خلع حاصل کرنے کے لئے زید کو عدالت کے ذریعے نوٹس بھیجا، لیکن زید نے کوئی جواب نہ دیا، آخر کار عدالت نے عورت کو خلع دے دیا اب زید اور اس کی بیوی جس

نے خلع لے رکھا ہے دوبارہ ازدواجی تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں کیا حلالہ شرعی کے بغیر دوبارہ ازدواجی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں؟ (احسان احمد۔شاہ فیصل کالونی، کراچی)۔

جواب: عدالت اپنے اختیار سے جس نکاح کو فسخ کرتی ہے اسے فقۂ اسلامی میں ''فسخِ نکاح'' یا ''تنسیخِ نکاح'' کہا جاتا ہے۔ خلع ''رشتۂ ازدواج کے اس انقطاع کو کہتے ہیں جو زوجین اپنی رضا مندی سے کرتے ہیں اس میں شوہر مالی بدل کے عوض طلاق پر راضی ہوتا ہے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ بیوی شوہر سے یہ کہے کہ میں اپنے مہر کے مطالبے سے کلی یا جزوی طور پر دستبردار ہوتی ہوں، میری گلوخلاصی کردو، اور دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے پاس سے کوئی مالی معاوضہ ادا کرے۔ اس کا ذکر قرآنِ مجید میں اس طرح ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ

(البقرہ:۲۲۹)

''اور تمہارے لئے اس (مہر یا حصہ) سے کچھ بھی لینا جائز نہیں ہے جو تم ان کو دے چکے ہو۔ مگر جب دونوں فریقوں کو یہ خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، سو (اے مسلمانو) اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ یہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت نے (اپنی گلوخلاصی کے لئے) جو بدل خلع دیا ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے''۔

عدالتی فسخ نکاح ہو یا زوجین کی باہمی رضامندی سے مالی بدل کے مقابل خلع، یہ دونوں ایک طلاق بائن کے حکم ہیں بشرطیکہ ان میں تین طلاق کے الفاظ صریح استعمال نہ کئے گئے ہوں، اور دونوں صورتوں میں وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور ایسی صورت میں آئندہ شوہر کے پاس صرف دو طلاق کا حق باقی رہے گا اور کسی بھی وقت خدانخواستہ شوہر نے دوبارہ حقِ طلاق استعمال کیا تو یہ پہلی طلاق بائن اس کے ساتھ جمع ہو کر موثر ہو جائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ شریعت میں جہاں بھی سابق زوجین کے لئے عقدِ ثانی کی گنجائش رکھی گئی ہے وہاں مہر کا تعین اور ادائیگی از سرِ نو ہوگی باقی ہم فیملی کورٹس کے فیصلوں کے بارے میں کوئی عمومی حکم یا رائے نہیں دیتے جب تک مقدمے کی ساری کارروائی کا مطالعہ نہ کرلیں اور جن وجوہِ قانونی پر فیصلہ صادر کیا گیا ہے اس کا انفرادی کیس کے طور پر مطالعہ نہ کرلیں کیونکہ وجوہ واسباب

اور دلائل وشواہد مقدمات میں مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے مشاہدے میں ہے کہ ماتحت فیملی کورٹس کے بعض جج تنسیخ نکاح کے مقدمات میں فقہی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے بلکہ وہ کما حقہ ان سے واقف بھی نہیں ہوتے۔

خاتون کا نکاح ہوا، رخصتی نہیں ہوئی اور اسے طلاق ہوگئی یا شوہر کا انتقال ہوگیا، عدت ومہر کے احکام

سوال: ایک خاتون کا نکاح ہوا ابھی رخصتی نہیں ہوئی کہ اسے طلاق ہوگئی یا شوہر کا انتقال ہوگیا تو اس کی عدت اور مہر کے شرعی احکام کیا ہوں گے۔ (اکرام اللہ۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: کسی خاتون کا نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے ہی طلاق ہوگئی تو وہ نصف مہر کی حقدار ہوگی اور اس پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، وہ طلاق ہوتے ہی آزاد ہے اور اپنی آزادانہ مرضی سے کہیں بھی نکاح کر سکتی ہے، اور اگر اس کے شوہر کا قضاء الٰہی سے انتقال ہوگیا ہے تو وہ پورے مہر کی حقدار ہوگی اور اسے عدت وفات گزارنی ہوگی، قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا (البقرہ:۲۳۴)

''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور (اپنی) بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک روکے رکھیں''۔

درمختار میں ہے:

اَلنِّكَاحُ يَتَاَكَّدُ عِنْدَ وَطْئٍ اَوْ خَلْوَةٍ صَحَّتْ اَوْ مَوْتِ اَحَدِهِمَا

''وطی یا خلوت صحیحہ یا زوجین میں کسی ایک کی وفات سے نکاح مؤکد ہو جاتا ہے''۔

رخصت سے محض ''رخصتِ عرفی'' ہی مراد نہیں ہے بلکہ زوجین کے درمیان اگر ایسی تنہائی (Privacy) قائم ہو جائے جس میں عملِ ازدواج میں رکاوٹ نہ ہو تو اسے خلوتِ صحیحہ کہتے ہیں اور یہ رخصت ہی کے قائم مقام ہے۔ شوہر کی وفات کی صورت میں رخصتی نہ ہونے کے باوجود بیوی پر چار ماہ دس دن عدت وفات گزارنا لازم ہے اور عورت پورے مہر اور ایامِ عدت کے نان نفقہ اور وراثت کی بھی حقدار ہوگی۔ اسی طرح اگر رخصتی سے قبل بیوی کا انتقال ہوگیا تو اس کا پورا مہر شوہر

کے ذمہ ہے اور وہ اس خاتون کے ترکے میں شامل ہوگا، اور اسی طرح مرد بھی اس کے ترکے میں سے وراثت پائے گا۔

طلاق نامے پر جعلی یا فرضی دستخط سے طلاق واقع نہیں ہوتی

سوال: (خلاصہ) میری بیٹی سسرال کے ہاں سے ناراض ہوکر میرے گھر آ گئی۔ چند روز بعد ہمیں رجسٹرڈ ڈاک سے "طلاق نامہ" موصول ہوا، جب اس سلسلے میں ہم نے اپنی بیٹی کے شوہر سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے حلفیہ بیان کیا کہ میں نے طلاق ہرگز ہرگز نہیں دی، ہمارے کہنے پر، اسٹامپ پیپر پر ایک حلفیہ اقرار نامہ لکھ کر دیا کہ میں نے اپنی بیوی کو کبھی طلاق نہیں دی، وہ بدستور میری بیوی ہے اور یہ طلاق نامہ جعلی ہے، یہ کسی نے فتنہ انگیزی کی ہے، ان کے شناختی کارڈ اور دیگر دستاویزات پر جوان کے دستخط ثبت ہیں، وہ اس طلاق نامے والے دستخط سے بالکل مختلف ہیں۔ اب میرے شوہر کے والد صاحب کا مطالبہ ہے کہ فتویٰ لاکر دو کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اور نکاح باقی ہے، لہٰذا آپ بتائیں کہ شرعی حکم کیا ہے؟ (م۔ن۔ص، دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: صورتِ مسئولہ میں چونکہ شوہر اپنے حلفیہ بیان میں طلاق دینے یا مذکورہ طلاق نامے پر دستخط کرنے سے منکر ہے اور زبانی یا تحریری طلاق کا کوئی گواہ بھی نہیں ہے، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی اور طلاق نامے پر دستخط کا بدلا ہوا ہونا بھی اس بات کا قرینہ ہے کہ اس کا بیان درست ہے، لہٰذا شرعاً ان کا نکاح حسبِ سابق قائم ہے اور وہ دونوں میاں بیوی ہیں۔ البتہ بالفرض کوئی شخص شوہر کے اصلی دستخط کے ہم شکل دستخط کر بھی لیتا اور صورتِ مسئولہ یہی ہوتی جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ تب بھی طلاق واقع نہ ہوتی، کیونکہ خط، خط کے مشابہ ہوسکتا ہے۔ جعلی دستاویزات وطلاق نامے تحریر کرکے، فتنہ انگیزی کرکے، شروفساد برپا کرکے یا جادوٹونے کرکے میاں بیوی میں تفریق کی کوشش کرنا، یہ ناپاک شیطانی کام ہے، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا خوف کرنا چاہئے اور اس طرح کے شیطانی کاموں کے اخروی عذاب اور وبال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ ایسے لوگوں کو فرصت ملے تو سورۂ بقرہ آیت:۱۰۲ کا ترجمہ اور اس کی تفسیر پڑھ لیں۔

کیا ماں کے کہنے پر شرعاً بیوی کو طلاق دینا ضروری ہے؟

سوال: اسلام میں ماں کا کیا مقام ہے اس کے کہنے پر بیٹا اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے یا طلاق دے

سکتا ہے۔ اس بات کا پس منظر کیا ہے اور کس نوعیت اور نوبت پر ایسا کرنا جائز ہے۔ کیونکہ حالات یہ ہیں کہ ہم دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے اور دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے حتیٰ کہ بیرون ملک ملازمت بھی چھوڑ کر پاکستان واپس آگیا ہوں صرف اس وجہ سے کہ میاں بیوی ساتھ رہیں۔ میری والدہ نے میری بیوی کی ذاتی ڈائری ہماری غیر موجودگی میں پڑھ لی اور اس کے بعد سے تو انہیں بالکل برداشت نہیں ہوا اور جھگڑا کرنے کے بعد بیوی کو اس کے ماں باپ کے گھر بھیج دیا ہے۔ میری بیوی کی ڈائری لکھنے کی عادت پرانی ہے اور اس نے میرے گھر والوں کے ساتھ جو روز مرہ ہونے والی باتیں ہیں، وہ سب تحریر کرتی رہتی تھی جس میں گھر والوں کا سلوک اور ان کا رویہ شامل ہے، یہ باتیں وہ مجھے بھی بتاتی رہتی تھی۔ میری والدہ اس پر اٹل ہیں کہ میری بیوی کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتیں اور کہتی ہیں تم چاہو تو اس کے ساتھ رہو اور تم بھی چلے جاؤ۔ جبکہ میری والدہ مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کررہی ہیں اور وہ کہتی ہیں کہ یہ میری طرف سے فائنل ہے۔ جبکہ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا اور میں اپنی بیوی سے یہ وعدہ بھی کرچکا ہوں کہ میں اس کو ہرگز طلاق نہیں دوں گا۔ مہربانی فرماکر اسلامی فقہ کی روشنی میں اس مسئلہ کا تفصیلی حل بیان فرمائیں نیز ہم دونوں کے حق میں بہتری کی دعا بھی فرمائیں۔

(فرمان عزیز c-4 بومبیا ولاز بلاک نمبر2 گلستان جوہر کراچی نزد کراچی یونیورسٹی)

جواب: بلاشبہ اسلام میں والدین کا بڑا مقام اور مرتبہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمان:۱۴،۱۵)

"کہ میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو، (تم سب کو) میری ہی طرف لوٹنا ہے، اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو (اس مطالبہ معصیت میں) ان کی اطاعت ہرگز نہ کرو، (لیکن اس کے باوجود) دنیا میں ان سے حسن سلوک کرتے رہو"۔

اس آیت میں اولاد کو پابند کیا گیا ہے کہ اگر بدقسمتی سے کسی کے والدین اس پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے لئے دباؤ ڈالیں، تو معصیت الٰہی میں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اولاد کو دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی

مشرک والدین کے ساتھ بھی دنیا میں حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔غور کا مقام ہے کہ جب مشرک والدین کے ساتھ بدسلوکی سے منع کیا گیا ہے تو مومن والدین کی تکریم وتعظیم اور اطاعت کس درجہ شریعت کو مطلوب ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات گرامی ہیں:

عن ابی هريرة قال :قال رجل يا رسول الله :من احق بحسن صحابتی ،قال :امک ،قال: ثم من ؟ ،قال امک ،قال ثم من؟:،قال امک، قال ثم من؟، قال ابوک، (الصحيح البخاری، رقم الحديث: ۵۹۷۱،مسلم، رقم الحديث:۲۵۴۸مشکوٰۃ :رقم الحديث، ۴۹۱۱)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟، آپ نے فرمایا: تمہاری ماں، اس نے عرض کیا: پھر کون؟، فرمایا: تمہاری ماں، اس نے عرض کیا: پھر کون؟، فرمایا: تمہاری ماں، اس نے (چوتھی بار) دریافت کیا: پھر کون؟، فرمایا: تمہارے باپ"۔

عن ابی هريرة قال:قال رسول الله ﷺ: رغم انفهٗ رغم انفهٗ رغم انفهٗ، قيل: من يا رسول الله! قال من ادرک والديه عند الكبر احدهما اوكلاهما ثم لم يدخل الجنة ،(مسلم رقم الحديث: ۲۵۵۱، مشکوٰۃ،رقم الحديث: ۴۹۱۲)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا، وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا، وہ شخص ذلیل ورسوا ہوا، عرض کیا گیا: کون یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیک وسلم)؟، آپ نے فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ دونوں یا کسی ایک کو بڑھاپے میں پایا اور پھر (ان کی خدمت کرکے) دخولِ جنت کا حق دار نہ بن سکا"۔

عن عبد الله بن عمرو قال :قال رسول الله ﷺ: رضى الرب فی رضی الوالدين وسخط الرب فی سخط الوالدين

(ترمذی، رقم الحدیث:۱۸۹۹مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۴۹۲۷)۔

"عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ کی رضا میں رب کی رضا اور ماں باپ کی ناراضگی رب تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے"۔

عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: من اصبح مطيعا لله فی والديه اصبح له بابان مفتوحان من الجنة وان كان واحدا فواحدًا ومن اصبح عاصيا لله فی والديه اصبح له بابا ن مفتوحان من النار وان كان واحد فواحدا ،قال رجل :وان ظلماه؟،قال وان ظلماه ان ظلماه ،وان ظلماهٗ (مشکوٰۃ:رقم الحديث : ۴۹۴۳،البيهقی فی الشعب ،رقم الحديث : ۷۹۱۶)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جوشخص اس حال میں صبح کرے کہ والدین کی فرماں برداری کے بارے میں اللہ کا حکم ماننے والا ہو تو اس کیلئے جنت کے دو دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی حیات ہے، تو اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اور جوشخص اس حال میں صبح کرے کہ اطاعت والدین کے بارے میں اللہ کا حکم نہ مان رہا ہو تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی زندہ ہے تو اس کے لئے جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے، اس شخص نے عرض کیا اگر چہ وہ (دونوں) ظلم کریں؟، آپ ﷺ فرمایا: اگر چہ وہ ظلم کریں، اگر چہ وہ ظلم کریں، اگر چہ وہ ظلم کریں"۔

عن ابی امامة قا ل رجل: يا رسول الله: ما حق الوالدين علٰى ولدهما؟ قال هما جنتک ونارک، (ابن ماجه، رقم الحديث: ۳۶۶۲ مشکوٰۃ، رقم الحديث: ۴۹۴۱)

"حضرت ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟، آپ نے فرمایا: وہ (اطاعت کی صورت میں) تمہاری جنت ہیں، اور (نافرمانی کی صورت میں) تمہاری دوزخ ہیں"۔

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ قال: ما من ولد بار ينظر الٰى والديه نظرة رحمة الا كتب الله بكل نظرة حجة مبرورة، قالوا؛ او ان نظر

كل يوم مائه مرةٍ، قال: نعم الله اكبر او اطيب، (مشكوٰة، رقم الحديث: ۴۹۴۴، البيهقى فى الشعب، رقم الحديث: ۷۸۵۹)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بھی نیک اولاد اپنے ماں باپ کے چہرے کی طرف رحمت (ومحبت) سے ایک نظر دیکھ لے، تو اللہ تعالیٰ (اس کے نامہ اعمال میں) ایک حج مقبول کا ثواب لکھ دیتا ہے، (صحابہ کرام نے) عرض کیا: اگر وہ ہر روز سو بار دیکھے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اللہ سب سے بڑا ہے اور (اس کی ذات) بہت پاک ہے، (یعنی اس کے خزانوں میں کیا کمی ہے اور اس کا فیضان کرم بھی فراواں ہے)"۔

ان آیات مبارکہ واحادیث کریمہ سے یہ امر تو ثابت ہوتا ہے کہ والدین اولاد پر ظلم وزیادتی بھی کریں تو اولاد کو ان کے ظلم وزیادتی کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہے، بلکہ انہیں سراپا اطاعت ونیاز بنے رہنا چاہیے، جھڑکنا تو درکنار، انہیں اف تک کہنے کی اجازت نہیں ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ والدین کو اولاد پر ظلم وزیادتی کا کھلا لائسنس دیا جارہا ہے۔صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب حضرت نعمان بن بشیر کے والد حضرت بشیر نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے اپنے بیٹے نعمان کو ایک غلام ہبہ کیا ہے، آپ اس پر گواہ بن جائیے، تو آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: کیا تم نے اپنی دیگر اولاد کو بھی اسی طرح ہبہ کیا ہے، انہوں نے عرض کیا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: "فانی لا اشهد علیٰ جور" تو میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا یا آپ نے فرمایا: لا تشهدنی علیٰ جور: مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ۔
(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۷۰، ۴۰۷۲)۔اس حدیث میں باپ کی طرف سے اولاد کے درمیان عدم مساوات کے سلوک کو ظلم قرار دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ اور جب (قیامت میں) زندہ درگور کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں قتل کی گئی، (التکویر: ۸، ۹)"۔یعنی ماں باپ کو اپنے ناروا ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔

اب آتے ہیں زیر بحث مسئلہ کی جانب کہ آیا از روئے شریعت بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دیدے، تو اولاً گذارش یہ ہے کہ طلاق اگر چہ ناگزیر صورت حال میں ایک مشروع ومباح امر ہے، لیکن یہ تمام مباح امور میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عن ابن عمر ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: ابغض الحلال الی الله تعالیٰ الطلاق (سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۲۱۷۸)

"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (تمام) حلال امور میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے ناپسندیدہ امر طلاق ہے"۔

عن معاذ بن جبل قال: قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم ولا خلق الله شیئاً علیٰ وجه الارض ابغض الیه من الطلاق
(رواہ الدار قطنی، رقم الحدیث: ۳۹۳۹)

"حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی چیز پیدا نہیں فرمائی جو اس کے نزدیک طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ ہو"۔

عن ثوبان قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ایما امرأة سألت زوجها طلاقاً فی غیر ما بأسٍ فحرامٌ علیها رائحة الجنة، (ترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۸۷، ابو داؤد، رقم الحدیث: ۲۲۲۱، ابن ماجه ۲۱۳۴)

"حضرت ثوبان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو عورت بغیر کسی ناگزیر مجبوری (اور ناقابل برداشت صورت حال) کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے"۔(نوٹ: ناگزیر صورت حال سے مراد ایسے حالات کا رونما ہوجانا جن کے تحت حدود شرع کے اندر رہتے ہوئے زوجین کا آپس میں نباہ ممکن نہ رہے"۔

رسول اللہ ﷺ نے صرف باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اس کے مطالبے پر بیٹا اپنی بیوی کو طلاق دیدے، چنانچہ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عمر قال: کانت تحتی امرأة أُحبها وکان ابی یکرهها، فامرنی ابی ان اطلقها فابیتُ، فذکر ذالک للنبی صلی الله علیه وسلم فقال: یا عبدالله بن عمر اطلق امرأتک، (ابوداؤد، کتاب

الادب، باب فی بر الوالدین ،رقم الحدیث: ۱۱۸ ، ابن ماجه، کتاب الطلاق ،باب یامره ابوه بطلاق امرأته، رقم الحدیث ۲۰۸۸)

"حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک بیوی تھی جس سے میں (بے انتہا) محبت کرتا تھا، تو میرے باپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں ، میں نے (تعمیل ارشاد سے) انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما)! اپنی بیوی کو طلاق دے دو"۔

اس حدیث کی شرح میں امام حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفیٰ ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

پہلا شخص جس نے اپنے بیٹے کو طلاق کا حکم دیا، حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام تھے، روایت صحیح میں ہے کہ جب وہ اپنے بیٹے اسماعیل اور ان کی ماں (یعنی اپنی بیوی ہاجرہ) کو (مکہ مکرمہ میں) زمزم کے نزدیک دوحہ کے مقام پر چھوڑ کر چلے گئے، تو چند سال تک وہ رکے رہے، پھر انہوں نے اپنے رب تبارک وتعالیٰ سے اپنے ان پسماندگان کا حال معلوم کرنے کی اجازت مانگی، وہ اپنی (بیوی) ام اسماعیل کے پاس آئے تو پتا چلا کہ وہ انتقال کر چکی ہیں اور اسماعیل نے شادی کر لی ہے لیکن وہ اس وقت اپنے مکان پر موجود نہیں تھے، تو آپ نے ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے ملامت کی (یعنی تنگیٔ حالات کا شکوہ کیا)، اس پر آپ نے فرمایا: جب اسماعیل آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دو، پھر جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا، حضرت اسماعیل نے (بیوی سے) فرمایا: وہ میرے باپ تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں، لہٰذا اپنے گھر والوں کے پاس چلی جاؤ، انہوں نے ان کی گفتگو کا حوالہ دیا اور فرمایا: ان کا نمونہ عمل اتباع کیلئے کافی ہے، اور بیٹے کے اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک میں سے ایک یہ ہے: جس چیز کو باپ ناپسند کرے، (چاہیے کہ) اسے بیٹا بھی ناپسند کرے، خواہ وہ اس کی پسندیدہ چیز (ہی کیوں نہ) ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس چیز کو اس کا باپ پسند کرے، وہ بھی اُسے پسند کرے، خواہ اس سے پہلے (طبعی طور پر) وہ اس کو ناپسند ہی (کیوں نہ) ہو، ظاہر بات یہ ہے کہ (بہرصورت باپ کی تعمیل ارشاد کا) یہ حکم اس صورت میں ہے کہ (یہ امر یقینی ہو کہ) باپ،

(دینی) بصیرت کا حامل ہے، لیکن اگر صورت حال اس کے برعکس ہے (یعنی باپ دینی بصیرت کا حامل نہیں ہے) تو باپ کی رضا کیلئے بیوی کو طلاق دینا (واجب نہیں بلکہ) پہلے مرحلے میں صرف مستحب ہے، کیونکہ امور حق میں باپ کی اطاعت (درحقیقت) اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کے ساتھ نیکی اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے، اور اگر بیوی کی شوہر کے ساتھ (طبعی) موافقت ہی نہیں ہے تو (باپ کے حکم پر) اسے چھوڑ دینا مستحب ہے، کیونکہ زوجیت کے معنی ہی شوہر اور اس کی اولاد کی نگہداشت، کیا تو نے حضرت جابر کے اس قول پر غور نہیں کیا کہ جب نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ تو نے کنواری لڑکی سے شادی کی ہے یا ثیب سے، (ثیب سے مراد ایسی مطلقہ یا بیوہ عورت جو اس سے پہلے شوہر کے تجربے سے گذر چکی ہے)۔ تو انہوں نے عرض کیا: ثیب سے شادی کی ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کنواری لڑکی سے شادی کیوں نہ کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے (وفور محبت میں خوش طبعی، ہنسی مذاق اور) چھیڑ خوانی کرتے، حضرت جابر نے عرض کیا : میرے (چھوٹے چھوٹے) نو بہن بھائی ہیں، تو مجھے یہ مناسب نہ لگا کہ اپنی جیسی (ناتجربہ کار بیوی IMMATURE) بیاہ لے کر آؤں، میں نے تو یہ سوچ کر (ثیب عورت سے نکاح کیا کہ) وہ ان کی صحیح نگہداشت (اور تربیت) کر سکے"۔ (عارضۃ الاحوذی ج ۵، ص ۱۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت نے باپ کے حکم پر بیٹے کو بیوی کے طلاق دینے کا جو وجوبی حکم دیا ہے، وہ دینی مصلحت پر مبنی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ باپ کے مزاج پر دین داری کا غلبہ ہو اور دینی مصلحتوں کا صحیح ادراک رکھتا ہو، اس پر نفسانی خواہشات، ہیجانی کیفیت، انتقامی جذبے اور غیظ وغضب کا غلبہ نہ ہو بلکہ وہ متحمل مزاج ہو، اور ہمارے سامنے دو مثالیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام تو ابو الانبیاء، اولوالعزم رسول، ملت ابراہیم کے مؤسس، وحی ربانی اور فطرت سلیم کے حامل تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی "مُحَدَّث خیر الامم"، مُلہم من اللہ اور "موفَّق من اللہ" تھے، بعض اوقات منشائے وحی ربانی کو ان کی فطرت سلیم نزول وحی سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی، چنانچہ ایسی آیات قرآنی، جن کے منشاء کا انہوں نے نزول وحی پہلے ہی ادراک کر لیا تھا، کو مُوَافَقاتِ عمر کہا جاتا ہے۔ آج کل عام طور پر ہم میں اصابتِ فکر، مزاج میں توازن واعتدال، منشائے شریعت معلوم ہونے پر اس کے سامنے سپر انداز (SURRENDER) ہونے کا رجحان اور مغلوب الغضب نہ ہونے کا تناسب

کتنا ہے ہم سب جانتے ہیں، لہٰذا موجودہ حالات میں اگر باپ بیٹے کو حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو، تو بیٹے کو چاہیے کہ ٹھنڈے دل سے شرحِ صدر کے ساتھ باپ کی فرمائش پر غور کرے، اگر ان کے فرمان کی وجوہِ شرعی موجود ہیں تو کھلے ذہن کے ساتھ نہ صرف ان کے حکم کی تعمیل کرے بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت عبداللہ بن عمر کی طرح اسے اپنی سعادت سمجھے۔ اور اگر اس پر یہ امر واضح ہو کہ باپ کا حکم شرعی مصلحت کے تابع نہیں بلکہ اس پر نفسیات کا غلبہ ہے، ظلم اور صریح ناانصافی کا باعث ہے، تو اس پر اس کی تعمیل واجب نہیں ہے۔ تاہم باپ کا احترام قائم رکھے اور تمام جائز امور میں ان کی فرماں برداری جاری رکھے اور نہایت نرمی اور تواضع کے ساتھ انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرے، شاید کسی مرحلے پر اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو قبولِ حق پر آمادہ فرمالے۔ کیونکہ شریعت کے جو عمومی احکام ہیں، وہ یہ ہیں کہ:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:۲)

"نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو"۔

لا طاعة فی معصية الله ،انما الطاعة فی المعروف (صحیح مسلم، رقم الحدیث:۱۸۴۰)

"یعنی کسی ایسے امر میں مخلوق کی اطاعت لازم نہیں ہے (خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی بڑا ہو)، جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لزومِ اطاعت تو بس صرف نیک کاموں میں ہے"۔

ماں کے حکم پر بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں کوئی حدیثِ صحیح موجود نہیں ہے، ایک حدیثِ ضعیف اس سلسلے میں مذکور ہے جس پر فنی بحث آگے آرہی ہے، اگر اس سے استدلال کر کے کوئی ماں کے لئے یہ حکم ثابت بھی کرے تو وہ بھی مصلحتِ دینی اور بصیرتِ دینی پر ہی محمول ہوگا۔ اگر ماں کے لیے یہ حکم علی الاطلاق مان لیا جائے تو نہ جانے صبح سے شام تک کتنے بستے بساتے گھر اجڑ جاتے، ساس بہو کا بیر تو ضرب المثل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماں کی تکریم کو بیان کرنے میں کوئی کسر چھوڑی ہے، اس سلسلے میں قرآن کی آیات مقدسہ اور احادیث کریمہ بہت ہیں۔

البتہ یہ سوال کہ جب حدیث پاک میں ماں کا حق باپ سے تین درجے زیادہ بتایا گیا ہے تو جو حق باپ کو حاصل ہے، وہ ماں کو کیوں نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلے کا تعلق عقل سے نہیں ہے، کتاب وسنت کے صریح احکام سے ہے، اور کوئی شرعی حکم ہمارے لئے ماورائے عقل تو ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی حکمت کو نہ سمجھ سکیں، خلافِ عقل ہرگز نہیں۔ آپ سوچیں کہ شریعت نے بچے کی پرورش ونگہداشت کا حق تو ماں کو دیا ہے، لیکن نابالغ بیٹی کے نکاح کا اختیار صرف باپ کو دیا ہے، اس صورت میں کہ جب آپ دونوں میاں بیوی باہم محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرتے ہیں، حدودِ شرع کی پاس داری کرتے ہیں تو محض ماں کی خواہش پر آپ پر اپنی بیوی کو طلاق دینا لازم نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی خاص مسئلے میں ماں کی رائے کی وجوہِ شرعی ہوں، تو ان پر ضرور غور کرنا چاہیے، اور جب ماں کی رائے مصلحتِ شرعی کے موافق ہو جائے تو ان کی تعمیل ارشاد میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر آپ کی والدہ مطالبہ کرتی ہیں کہ بیوی کو الگ رکھو، تو ان کی اس فرمائش پر ضرور عمل کریں تاوقتیکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ آپ کی بیوی کو خوش دلی سے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

آپ نے بیوی سے جو یہ وعدہ کیا ہے کہ میں تمہیں ہرگز طلاق نہیں دوں گا، یہ وعدہ، چونکہ منشائے شریعت کے مطابق ہے، اس لیے اس کا پورا کرنا لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (الاسراء:۳۴)

"اور عہد کو پورا کرو، بیشک (قیامت کے دن) عہد کے بارے میں (لازمی) باز پرس ہوگی"۔

آپ کے گھر والوں کا آپ کی بیوی کی ڈائری کو خفیہ طور پر پڑھنا درست نہیں ہے، شریعت نے دوسروں کے ذاتی امور اور اَسرار کی کھوج لگانے سے منع فرمایا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۖ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات:۱۲)

"اے اہلِ ایمان! بہت سی بدگمانیوں سے بچتے رہو، بلاشبہ بعض بدگمانیاں گناہ کا سبب بنتی

ہیں اور (دوسروں کے ذاتی امور کی) ٹوہ میں نہ لگا کرو"۔

حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث ولا تحسسو اولا تجسسو ا

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۰۶۷، مسلم، رقم الحدیث: ۲۵۶۰، مشکوٰۃ، رقم الحدیث ۵۰۲۸)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بدگمانیوں سے بچا کرو، کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے اور (دوسروں کے پوشیدہ احوال کی) ٹوہ میں نہ لگ جاؤ اور ان کی جاسوسی نہ کرو"۔

مندرجہ بالا سطور میں، جو کچھ میں نے لکھا، اس کے بارے میں اکابر علماء کرام شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم العالی، مفتی محمد رفیق حسنی صاحب اور مفتی محمد یوسف بندیالوی سے استصواب کیا، تو انہوں نے میری رائے اور اخذ کردہ نتیجے سے اتفاق کیا کہ دور حاضر میں بہو کے بارے میں والدین کی رائے بالعموم کسی دینی مصلحت پر مبنی نہیں ہوتی، نہ ہی ان میں وہ شفقت پدری ہوتی ہے جس کی اولین ترجیح دینی اصلاح ہو، بلکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بہو سے نفرت سارے محرکات نفسانی ہوتے ہیں، اگر کوئی بہو نماز بالکل نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، دین دار نہ ہو، تو اس سے اس بنیاد پر کوئی گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔

تاہم اعلیحضرت عظیم البرکت امام احمد رضا قادری قدس سرہم العزیز کا ارشاد عالی اس سے مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:

آیت کا وہ حکم اور احادیث کے یہ ارشادات انہی وجہین حل وبغض پر ہیں، اگر عورت پر کوئی شبہ ہو یا وہ عاصیہ ہو یا نماز نہ پڑھتی ہو یا بوڑھی ہوگئی ہو اور اسے قسم بین النساء سے بچنا ہو تو ان سب صورتوں میں طلاق بلا کراہت جائز ومباح ہے بلکہ بعض صورتوں میں مستحب۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر عورت نماز نہ پڑھے اور یہ ادائے مہر پر قادر نہ بھی ہو جب بھی طلاق دے دینی چاہیے کہ:

"اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی میں بیوی کا مہر شوہر کے گلے میں پڑا ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ بے نماز عورت سے معاشرت جاری رکھے، جیسا کہ خانیہ، غنیہ وغیرہما میں ہے"۔

نوٹ: اس مقام پر "فتاویٰ رضویہ" کی تحقیق وتخریج کرنے والے مولانا نذیر احمد نے لکھا ہے:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول عبارت کے اصل الفاظ یہ ہیں:

لان القی اللہ وصداقھا بذمتی خیر من ان اعاشر امرأۃ لا تصلی

بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہوتی ہے، جیسے اس کو اس کے ماں باپ عورت کو طلاق دینے کا حکم دیں اور نہ دینے میں ان کی ایذا اور ناراضی ہو، واجب ہے کہ طلاق دے دے، اگرچہ عورت کا قصور نہ ہو: "لان العقوق حرام والاجتناب عن الحرام واجب" (کیونکہ نافرمانی حرام ہے اور حرام سے بچنا واجب ہے)"۔

حدیث میں فرمایا:

"وان امراک ان تخرج من اھلک ومالک فاخرج، (اگر والدین بیوی اور مال سے علیحدگی کا حکم دیں تو ایسا ہی کرو)۔ (الترغیب والترہیب، مصطفی البابی مصر ۱/ ۳۸۳)۔

نوٹ: فتاویٰ رضویہ کے محقق نے اس حدیث کا مزید حوالہ السنن الکبریٰ ۷/ ۳۰۴، سے دیا ہے، (فتاویٰ رضویہ، رضا فاؤنڈیشن لاہور ج۱۲ ص ۳۳۲-۳۳۱)۔

اس حدیث پر ہم نے غور کیا، حافظ نور الدین الہیثمی کی مجمع الزوائد میں حدیث کے الفاظ مبارکہ یہ ہیں:

"ولا تعقن والدیک وان امراک ان تخرج من اھلک ومالک"۔ اس کے تحت حافظ ہیثمی لکھتے ہیں:

رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر، رجال احمد ثقات الا ان عبدالرحمٰن بن جبیر بن مفیر لم یسمع من معاذ، واسناد الطبرانی متصل وفیہ: عمرو بن الناقد القرشی، وھو کذاب (۴/۳۹۱، دار الفکر بیروت)۔

یعنی امام احمد کی سند میں انقطاع ہے، کیونکہ عبدالرحمٰن بن جبیر کا معاذ سے سماع ثابت نہیں ہے، اور طبرانی کی سند تو متصل ہے لیکن اس میں ایک راوی عمرو بن ناقد کذاب ہے، جب کہ "مجمع الزوائد" کے محقق عبداللہ محمد الدرویش نے لکھا ہے کہ امام احمد کی سند میں اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے، تو اس طرح اس میں دو علتیں ہوگئیں، اور طبرانی کی "المعجم الکبیر" میں یہ الفاظ سرے سے ہیں ہی نہیں۔ (۲۰/۸۳، حدیث نمبر ۱۵۶، دار احیاء التراث العربی، بیروت)۔

الترغیب والترہیب کی حدیث نمبر ۸۰۹ میں الفاظ یوں ہیں:

ولا تعص والدیک وان امراک ان تتخلیٰ من اھلک ودنیاک فتخله

”اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو اور اگر وہ تجھے حکم دیں کہ اپنے اہل اور اپنی دنیا سے علیحدگی اختیار کر و تو کرلو“۔

اس کے تحت بھی مؤلف امام حافظ زکی الدین المنذر متوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں یزید بن سنان الھر وی ہے، کتاب کے محقق کے مطابق اکثر ماہرین رجال نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، (۱۴۳۸)۔

لہٰذا اس حدیث سے استدلال روایتاً اور درایتاً دونوں طرح سے صحیح نہیں ہے، روایتاً تو اس لئے کہ یا تو سند متصل نہیں ہے اور یا اس میں بعض راوی ضعیف و کذاب ہیں، اور درایتاً اس لئے کہ بے قصور کو سزا دینا از روئے قرآن منع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ

”اور کسی قوم کی عداوت تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل کا دامن چھوڑ دو، عدل کرو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے“۔ (المائدہ: ۲)

اور حدیث پاک کی رو سے جب طلاق عند اللہ مبغوض فعل ہے، تو اگر چہ وہ بلا جوازِ شرعی بھی نافذ ہو جائے گی، لیکن شرعاً ناپسندیدہ ہوگی، اور محظورِ شرعی سے بچنا عقوق والدین کے ضمن میں نہیں آتا۔ ہاں، ہم یہ صراحت کے ساتھ تحریر کر چکے ہیں کہ والدین کا حکم جوازِ شرعی و مصلحتِ شرعی پر مبنی ہو تو اس کی تعمیل کو اپنے لیے سعادت سمجھنا چاہیے۔

ہم نے پوری شرح وبسط کے ساتھ احقاق حق کر دیا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی صاحب اسی موقف پر رہیں کہ ہر حال میں والدین کے کہنے پر بیوی کو طلاق دینا واجب ہے، خواہ بیوی بے قصور ہو تو وہ اپنی رائے پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔

☆☆☆..........☆☆☆..........☆☆☆

١

كتاب الفرائض

اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات

سوال: عرض ہے کہ میں نے اپنا مکان بیچا، ایک لاکھ پچانوے ہزار کا۔ میری پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، ان میں سے ہر ایک کو کتنا حصہ آئے گا، (ظہور محمد۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: آپ اپنی زندگی میں، اپنے مال میں سے کسی کو بلا معاوضہ کچھ دینا چاہیں، خواہ وہ شخص آپ کا قرابت دار ہو یا اجنبی، اسے شرعاً وراثت یا ترکہ نہیں کہتے، بلکہ اسے ہبہ، ہدیہ، تبرع اور فضل واحسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ چونکہ الحمدللہ بقیدِ حیات ہیں اور دعا ہے اللہ جل شانہٗ آپ کو صحت وسلامتی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ اولاد کے درمیان ترکے کی تقسیم کا قرآنی اصول تو یہ ہے کہ: ''لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دگنا حصہ ملے گا۔'' لیکن اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اولاد کو کچھ مال ہبہ کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ سب کو برابر حصہ دے۔ ارشادِ رسول ہے: ''حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (نعمان) کو ہبہ کردیں، میرے والد نے ایک سال تک یہ معاملہ ملتوی رکھا، پھر انہیں اس کا خیال آیا، میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ تم میرے بیٹے کے ھبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ کرلو، میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے، اور اس وقت میں نوعمر لڑکا تھا، انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ بنالوں، جو میں نے اپنے اس لڑکے کو ھبہ کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ (ﷺ) نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اتنا حصہ دیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی نہیں، آپ (ﷺ) نے فرمایا: تو پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۰۷۰)۔'' اسی موضوع پر صحیح مسلم کی حدیث نمبر ۴۰۶۹ کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو! اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو۔'' حدیث نمبر ۴۰۷۳ میں فرمایا: ''(جاؤ) میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ'' پھر فرمایا: ''کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ (تمہارے سب بیٹے) تمہارے

ساتھ حسن سلوک میں ایک جیسا رویہ اختیار کریں'' اس نے عرض کیا: ''کیوں نہیں'' آپ (ﷺ) نے فرمایا: ''پھر تم بھی ایسا نہ کرو (یعنی عدم مساوات نہ کرو)۔''

انسان اپنی زندگی میں اپنے مال میں سے جس کو جتنا حصہ دینا چاہے، دے سکتا ہے، اسے اپنے مال پر تصرف کا پورا اختیار ہے۔ لیکن مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں کسی شخص کو اپنی اولاد کے درمیان ہبہ اور عطیہ کے طور پر مال تقسیم کرنے میں سب کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنا چاہئے۔ حتیٰ کہ بیٹے اور بیٹی میں بھی فرق نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن یہ ''مساوات بین الاولاد'' کا حکم واجب کے درجے میں نہیں ہے بلکہ مستحب ہے اور کسی ایک کو زیادہ دینا مکروہ تنزیہی ہے۔ صحیح مسلم کے شارح امام نووی نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ 'اس پر کسی اور کو گواہ بناؤ' اس بات کی دلیل ہے کہ ''عدم مساوات'' حرام اور باطل نہیں ہے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کیسے فرماتے کہ: 'اس پر کسی اور کو گواہ بناؤ'۔ امام ابو یوسف، امام مالک اور امام احمد کا قول یہ ہے کہ وراثت کی طرح ہبہ میں بھی لڑکے کو لڑکی سے دگنا دینا چاہئے۔ اگر ماں باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو، اس کی مالی کمزوری، دماغی کمزوری، جسمانی نقص یا بہت زیادہ خدمت گزار ہونے کی وجہ سے تلافی (Compensation) کے طور پر کچھ زیادہ دینا چاہیں اور اس پر باقی اولاد کو خوش دلی سے راضی کرلیں، تو پھر یہ بالاتفاق جائز ہے۔ سوال میں یہ درج نہیں ہے کہ آپ کے اور حقدار ورثاء یا قرابت دار بھی ہیں یا نہیں، جیسے ماں باپ، بیوی وغیرہ اور یہ کہ آپ ان کو بھی کچھ دینا چاہتے ہیں یا نہیں، اپنے لئے بھی کچھ پس انداز کرنا چاہتے ہیں یا نہیں، اور یہ کہ آپ کے پاس کچھ اور مال بھی ہے یا نہیں، ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر رقم تقسیم کریں، شرعی حکم آپ کو بتادیا ہے۔

وراثت کے متفرق مسائل

سوال: (۱) میرا بیٹا مشیت ایزدی سے دو سال ہوئے انتقال کر گیا شادی نہیں ہوئی تھی اس کی پنشن کمپنی کے قانون کے مطابق ایک چھوٹی رقم بطور والد مجھے ملتی ہے۔ میری اہلیہ کا نام شامل نہیں کیا گیا ہے، مجھے پانچ سال تک بشرطِ زندگی ملتی رہے گی بعد میں بند ہو جائے گی، مرحوم کی کچھ رقم بھی مجھے ملی ہے اس میں سے آدھی رقم اب تک خرچ کر چکا ہوں میرے پانچ بیٹے ہیں۔ دو شادی شدہ ہیں۔ چھ بیٹیوں میں سے صرف دو کی شادی ہو چکی ہیں۔ یہ مجبوری حصولِ رشتہ چار گھر میں

ہیں، پانچوں بھائی اور دونوں بہنوں نے مرحوم کی رقم نہ لینے کا عہد کیا ہے ان سب کا کہنا ہے کہ چار بہنوں کی شادیوں میں خرچ کی جائے، اس درمیان میں ماہانہ رقم کفالت کی مد میں خرچ ہو رہی ہے۔ قانونِ وراثت کے تحت کیا والد کا اس کی میراث میں پورا حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے خرچ کرے کسی کو کم کسی کو زیادہ دے یا مرحوم کی وقتاً فوقتاً نصیحت کے مطابق بقیہ رقم (چار بہنوں میں) مساوی تقسیم کردی جائے شرعاً کیا حکم ہے۔

سوال: (۲) بینک کے مقابلہ میں NIT وغیرہ کے شیئر لینے بہتر ہے یا نہیں گھر میں رقم رکھی نہیں جاسکتی ہے اور زیادہ خرچ ہوتی رہے گی، واضح رہے کہ مرحوم بیٹا دورانِ زندگی اپنی پوری تنخواہ لاکر مجھے (والد کو) دیا کرتا تھا۔

سوال: (۳) سسر صاحب نے میری بیوی کو اپنی جائیداد (مکان وغیرہ) کے حصہ سے دست بردار ہونے کا تحریراً عندیہ دے رکھا ہے، ان کی دوسری بیوی سے چھ بیٹے بیٹیاں ہیں جبکہ میری بیوی پہلی سے اکیلی ہیں۔ سسر صاحب حیات ہیں، کیا یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟۔ انتقال کے بعد کیا یہ تحریر کالعدم نہیں ہوسکتی ہے اور جائیداد میراث کے قانون کے تحت تقسیم کی جائے۔

سوال: (۴) گیارہ بچوں میں دو ایک کی خواہش ہے کہ میں اپنا مکان اپنی زندگی میں فروخت کرکے سب کے حصے تقسیم کردوں کسی کا اصرار نہیں ہے، اگر میں ایسا کرتا ہوں تو وہ سب کرایہ کے مکان میں رہیں گے اپنا مکان کبھی بھی نہیں بنواسکتے، رقم بہت ہی قلیل ہونے کی صورت میں شرعاً کیا حکم ہے، ابھی تو وہ میرے ہی مکان میں رہتے ہیں۔

سوال: (۵) میری بیوہ بھتیجی نے اپنے شوہر کے حکم و رضامندی سے غیر شخص (جو رشتہ دار نہیں اس) کی ایک بچی کو متبنیٰ بنالیا ہے (گود لے رکھا ہے)، وہ درجہ نہم میں پڑھتی ہے، اس بچی نے ماں باپ کو تقریباً چھوڑ رکھا ہے، کبھی سال میں ایک دو دفعہ ماں یا والد (غریب ہیں) دیکھنے آجاتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ کیا بیوہ اس لے پالک بچی کی تعلیم ڈاکٹر تک شرعاً کرسکتی ہے معہ کفالت کے اخراجات وغیرہ، جبکہ بیوہ کے چچازاد بھائی یا اور رشتہ دار (قریبی) کے ایک یا دو بچوں کو لے پالک لے سکتی ہے مالی حالت بہتر ہے مگر پہلے والی لے پالک بچی کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے۔

(ایس اے سلام..... ناظم آباد، کراچی)

جواب: (۱) آپ کے فوت شدہ بیٹے کا ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا، کل چھ حصے ہوں

گے، ان میں باپ کو پانچ حصے ملیں گے اور ماں کو ایک حصہ، بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ کمپنی کی طرف سے آپ کے لیے پانچ سال تک جو پنشن منظور کی گئی ہے، اگر وہ کمپنی اپنی طرف سے فضل و احسان کے طور پر دیتی ہے اور اپنے قانون کے مطابق صرف باپ ہی کو دیتی ہے، یہ بیٹے کا استحقاق نہیں تھا تو آپ ہی اس کے حق دار ہیں، اور اگر یہ بیٹے کا استحقاق تھا، شرائطِ ملازمت میں سے تھا اور اس کی حیثیت مرحوم کے ترکے اور وراثت کی ہے تو پھر آپ اور آپ کی اہلیہ میں پانچ اور ایک کے تناسب سے شرعاً تقسیم ہوگی۔ یہی حکم اس رقم کا ہے جو کمپنی نے یکمشت آپ کو دی ہے، اگر یہ آپ کے بیٹے کا استحقاق اور ترکہ ہے تو اسی طرح آپ اور آپ کی بیوی (یعنی مرحوم کے ماں باپ) میں پانچ اور ایک کے تناسب سے تقسیم ہوگا اور بہن بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور اگر یہ آپ کے بیٹے کا استحقاق، کیے از شرائط ملازمت اور ترکہ نہیں ہے بلکہ کمپنی رضا کارانہ طور پر حسنِ سلوک اور فضل واحسان کے طور پر اپنے قانون کے مطابق صرف باپ کو دیتی ہے تو پھر یہ آپ کا حق ہے۔ اب چونکہ مرحوم کے بہن بھائیوں کا شرعاً ترکے میں حصہ نہیں ہے، تو آپ خود مختار ہیں، اس رقم میں جیسا چاہیں تصرف کریں۔

جواب: (۲) ہماری معلومات کے مطابق این آئی ٹی (N.I.T) کا کاروبار بھی مکمل طور پر غیر سودی (Intrest free) نہیں ہے اس لیے بینک ڈیپازٹس اور اس کا حکم شرعاً ایک ہی ہے۔

جواب: (۳) آپ کی بیوی کے حق میں آپ کے سسر (یعنی ان کے والد کی تحریر) وصیت کے درجے میں ہے، اور شرعاً وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے، البتہ اگر وہ زندگی میں مکان یا کوئی چیز اپنی بیٹی کو ہبہ (Gift) کرکے باقاعدہ قبضہ دے دیں اور مالک بنادیں تو وہ جائیداد ان کی ملکیت ہوجائے گی لیکن شرعاً مستحب امر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولاد کو کچھ ہبہ کرنا چاہے تو تمام اولاد کو مساوی طور پر دے، تاہم اگر کسی مساوات کا لحاظ کیے بغیر اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ ہبہ کردیا تو شرعاً یہ عمل مکروہ ہونے کے باوجود نافذ ہوجائے گا۔ البتہ اگر کوئی مکان یا جائیداد آپ کی بیوی کی ماں (آپ کی مرحومہ ساس) کے نام پر تھی (یعنی ان کی ملک تھی) تو آپ کی بیوی اس میں شرعاً نصف کی حق دار ہے۔

جواب: (۴) آپ زندگی میں اپنی جائیداد کے مالک ہیں، آپ کو حق ہے اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں، آپ کی زندگی میں آپ کی اولاد نہ آپ سے تقسیم جائیداد کا مطالبہ کرسکتی ہے،

نہ آپ کو اس پر مجبور کرسکتی ہے، کیونکہ زندگی میں کوئی اپنی اولاد کو کچھ دینا چاہے تو یہ ہبہ کہلاتا ہے اور یہ دینے والے کی مرضی پر موقوف ہے، البتہ اگر اولاد کو ہبہ کرنا ہو شرعاً تمام اولاد میں مساوات کا سلوک مستحب ہے، ہاں اگر کوئی بہن بھائی خوش دلی سے رضا کارانہ طور پر اپنا حق دوسروں کے لیے چھوڑنا چاہیں تو وہ ترکے میں بھی ایسا کرسکتے ہیں، یہ تو ایثار ہے اور مستحسن امر ہے۔

جواب: (۵) اگر کوئی شخص کسی بچے کی کفالت اور نگہداشت رضا کارانہ طور پر اپنے ذمے لیتا ہے تو یہ ایک عملِ خیر ہے اور اگر زیرِ کفالت بچہ نادار ہے تو بہت بڑے اجر وثواب کی بات ہے۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے مالی استطاعت اور توفیق دی ہے تو ایک سے زائد بچوں کی کفالت بھی کرسکتا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ متبنّٰی یا لے پالک کا حکم نسبی اولاد کا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَاۗىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ

''اور اس (اللہ) نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تمہارے اپنے مونہوں کی بات ہے اور اللہ حق فرماتا ہے اور وہی (سیدھی) راہ دکھاتا ہے ان (لے پالکوں) کو ان کے باپ ہی کی نسبت سے پکارا کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت ہی انصاف کی بات ہے''۔ (الاحزاب: ۴،۵)

''تفسیر الجامع لاحکام القرآن'' میں امام ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبی نے جلد نمبر ۱۴، صفحہ ۱۲۱ پر انہی آیات کی تفسیر میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:

عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِیْ وَقَّاصٍ وَ اَبِیْ بَکْرَۃَ کِلَا ھُمَا قَالَ: وَ سَمِعَتْہُ اُذُنَایَ وَوَعَاہُ قَلْبِیْ محمداً ﷺ یَقُوْلُ: "مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ غَیْرُ اَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ"

''حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابوبکرہ رضی اللہ عنہما دونوں بیان کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے کانوں سے سنا اور دل میں اس بات کو محفوظ رکھا کہ حضرت محمد ﷺ فرمارہے تھے۔ جس نے اپنے آپ کو اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف منسوب کیا (یعنی اسے اپنا باپ کہا) حالانکہ وہ جانتا ہے کہ درحقیقت وہ اس کا باپ نہیں ہے تو جنت

اس پر حرام ہے"۔ (صحیح بخاری کتاب المناقب، صحیح مسلم کتاب الایمان)

لہٰذا لے پالک یا متبنّٰی کا حکم حقیقی اولاد کا نہیں ہے، نہ ہی وہ اپنے مربی کے وارث بنتے ہیں بلکہ ترکہ شریعت کے احکام کے مطابق اصلی اور حقیقی وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنے پروردہ منہ بولے بیٹی یا بیٹے کو اپنی زندگی میں کوئی مال یا جائیداد ہبہ کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

ترکے کے مسائل

سوال: مؤدبانہ گذارش یہ ہے کہ فدوی راشد حسین جو کہ مکان نمبر H-144/4 سیکٹر 2-C لائنز ایریا جیکب لائن میں رہائش پذیر ہے۔ مجھ کو ایک مسئلہ درپیش ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

جس مکان میں والدہ، راشد حسین اور بیوی رہتے ہیں، دو چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد بھائی نے حصہ لینے کا دعویٰ کردیا۔ اس مکان کو میں نے دوبارہ سے مسمار کرکے تعمیر کروایا جس پر تقریباً پچاس ہزار روپے لاگت آئی، اس لاگت میں کسی بھائی یا بہن کا کوئی حصہ نہیں، والد صاحب کے انتقال کا خرچہ، دو بہنوں کی شادی، اپنی شادی، والدہ کی بیماری کا شروع سے ابھی تک مجھ کو ہی خرچہ برداشت کرنا پڑا۔ والد صاحب کے نام مکان ہے، ان کے حصے داروں کی تعداد سات ہے۔ والدہ تین بھائی تین بہنیں (تمام شادی شدہ)۔

میرے سوالات

(۱) ناظم صاحب کو دی ہوئی درخواست اور مندرجہ بالا مسئلہ کی روشنی میں اس کو فروخت کرسکتا ہوں۔ مجھ کو تعمیر کے پچاس ہزار روپے مل سکتے ہیں یا نہیں؟

(۲) مکان میں پچاس ہزار روپے لگائے اس کو ہٹا کر حصہ ہوگا یا نہیں۔

(۳) مندرجہ بالا اخراجات تقریباً ۲ لاکھ ۳۲ ہزار روپے میں سے کتنا کون حصے دار بنے گا؟

(۴) راشد حسین اپنی مرضی سے مکان کو مسمار کرسکتے ہیں اس کی اجازت ہے۔ پھر فروخت ہونے کے بعد جو بھی حصہ آئے یعنی زمین کی قیمت۔

(۵) اس مکان کو راشد حسین کرائے پر دے سکتے ہیں یا نہیں۔

(راشد حسین...... بلاک نمبر H-144/4، نزد جھگی سیکٹر 2-C، جیکب لائن لائنز ایریا)

جواب: آپ کے والد مرحوم کا ترکہ بعد ادائیگی حقوق متقدمہ علی الارث (یعنی وہ امور

جن کی ادائیگی ترکے کی تقسیم سے پہلے ضروری ہے) کے بعد کل 72 رحصص میں منقسم ہوگا اور ہر وارث کو حسب ذیل شرح سے حصہ ملے گا۔

مرحوم کی بیوی (یعنی آپ کی والدہ) کا حصہ =9/72

ہر بیٹے کا حصہ = 14/72، تین بیٹوں کا مجموعی حصہ =42/72

ہر بیٹی کا حصہ = 7/72، تین بیٹیوں کا مجموعی حصہ =21/72

آپ نے والد کی جھگی اگر تمام ورثاء کی مرضی سے گرائی تھی تو فبہا، ورنہ اس وقت اس اسٹرکچر کی جو مالیت تھی، وہ آپ پر آئے گی۔ آپ نے جھگی یا والد کے متروکہ مکان پر جو رقم لگائی ہے، جائیداد کے ماہرین اور منصفین موجودہ مکان کی جو قیمت لگائیں، اس میں سے اپنے پچاس ہزار روپے وضع کرلیں، باقی والد کا ترکہ ہے جو مندرجہ بالا شرح کے مطابق آپ سمیت سب وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

آپ نے بہنوں کی شادی پر جو رقم خرچ کی ہے، اگر تمام ورثاء نے آپ کو اس کا اختیار دیا تھا اور ان مصارف کا بوجھ برابر یا کسی خاص تناسب سے اپنے ذمہ لینے کا وعدہ کیا تھا تو وہ ان سے آپ وصول کرسکتے ہیں، اور اگر ایسا نہیں ہے تو آپ خود ان مصارف کے ذمہ دار ہیں، یا دیگر ورثاء چاہیں تو حسب منشا رضاکارانہ طور پر اس میں جتنا حصہ ڈالنا چاہیں ڈال سکتے ہیں۔

والدہ کی جو آپ نے خدمت کی ہے یہ آپ کی سعادت ہے اور اس پر آپ عنداللہ ماجور ہوں گے، دیگر وارث بھی رضاکارانہ طور پر اس میں آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیں تو ان کے لیے بھی سعادت کی بات ہوگی۔ اور اگر انہوں نے پہلے آپ کو اختیار دیا تھا کہ ہم سب کی طرف سے ماں کا علاج کرو تو وہ اس عہد کے شرعاً پابند ہوں گے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک خاتون کے خاوند کا انتقال ہوگیا، مذکورہ شخص کا ایک بھائی، ایک بہن اور والدہ بقید حیات ہیں۔ مرحوم کے نام پر ایک پلاٹ ہے اور ایک کارخانہ ہے جس میں دونوں بھائی شریک ہیں۔ مرحوم کے بھائی کا اپنا مکان موجود ہے، مرحوم کی والدہ بھی الگ مکان میں رہتی ہیں اور مرحوم کی بہن بھی شادی شدہ ہیں اور اپنے

مکان میں رہتی ہیں، مرحوم کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ صورت مذکورہ میں بیوہ مرحوم کی تمام وراثت کی اکیلی حقدار ہوں گی یا اور بھی افراد مثلاً بھائی بہن وغیرہ شریک ہوں گے اگر اور بھی لوگ شریک ہوں گے تو بیوہ کا حصہ کتنا ہوگا۔ زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ازروئے شریعت جواب عنایت فرما کر عنداللہ مامون و ماجور ہوں، (عبدالجبار۔ اورنگی، کراچی)۔

جواب: صورت مسئولہ میں ان امور کی ادائیگی کے بعد جو تقسیم وراثت پر مقدم ہوتے ہیں، مرحوم کا ترکہ اس کے مذکورہ شرعی وارثوں میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ ۳۶ حصص میں تقسیم ہوگا اور ورثاء کے حصے مندرجہ ذیل ہوں گے:

والدہ=۶ حصے بیوی=۹ حصے بھائی=۱۴ حصے بہن=۷ حصے کل=۳۶

ورثہ کی تقسیم

سوال: ایک عدد مکان جس کی قیمت ۶ لاکھ روپے ہے، کس طرح تقسیم ہوں گے۔ ورثاء ۴ بھائی، ایک بہن اور والدہ۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمادیں، شکریہ۔

(انصار احمد، کراچی)

جواب: میت کے ترکہ میں سے دیگر حقوق ضروریہ لازمہ، جو تقسیم ترکہ پر مقدم ہوتے ہیں، کی ادائیگی کے بعد بقیہ ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ ۵۴ حصوں پر منقسم ہوگا اور ان میں سے ورثاء کے حصے اس تناسب سے ہوں گے:

والدہ......۹ حصے چار بھائی......۴۰ حصے (فی کس ۱۰ حصے) ایک بہن......۵ حصے

مسئلۂ وراثت

سوال: میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے ان کا حق مہر ۲۵ ہزار روپے تھا، نہ میں نے ان کی زندگی میں ادا کیا اور نہ ہی اس نے معاف کیا تھا۔ اب میں اس کے بارے میں فکرمند ہوں، اس کی ادائیگی کی شرعی صورت کیا ہوگی، مرحومہ کے ورثاء میں میرے علاوہ، ان کی والدہ زندہ ہیں اور ہمارے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے؟ (مسعود الرحمٰن۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: یہ دَینِ مہر، آپ کے ذمے بیوی کا قرض ہے اور یہ مجموعی ترکے میں شامل ہوگا۔ ان کی ملکیت میں وفات کے وقت نقد، زیورات اور مالِ منقولہ وغیر منقولہ جو کچھ بھی ہو، ان کا ترکہ

ہے اور یہ دَینِ مہر بھی اسی ترکے کا حصہ ہے۔ اور ان کا ترکہ ان کے شرعی ورثاء میں (مصارفِ تجہیز وتکفین وتدفین، وضع کرنے، ان کے ذمے اگر قرض ہو تو اس کی ادائیگی، اگر انہوں نے کوئی وصیت کی ہو تو کل ترکے کی تہائی مالیت تک اس کے نفاذ کے بعد جو کچھ بچے گا) حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ 120 حصوں میں تقسیم ہوگا اور ہر ایک وارث کا حصہ حسب ذیل ہوگا:

والدہ=20 شوہر......15، دو بیٹے=68 (فی کس3) بیٹی=17

وارث کون ہیں؟

سوال: میں غیر شادی شدہ خاتون ہوں، میرے بھائی بہن بھی ہیں اور ایک فوت شدہ بھائی اور ایک فوت شدہ بہن کی اولاد یعنی بھتیجے بھتیجیاں اور بھانجے بھانجیاں بھی ہیں، تو شرعی وارث کون ہوں گے، (شاہدہ خاتون۔ نارتھ ناظم آباد)۔

جواب: آپ کی وفات کے وقت جو بہن بھائی زندہ ہوں گے، وہ وارث ہوں گے، بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ بھتیجے بھانجے وغیرہ محروم رہیں گے، کیونکہ قریب کا وارث دور کے وارث کو محروم کردیتا ہے۔ البتہ اگر آپ اپنی زندگی میں اپنے مرحوم بھائی اور مرحومہ بہن کی اولاد کو کچھ ہبہ کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں اور وفات سے پہلے ان کے حق میں کل ترکے کے ایک تہائی حصے تک کی وصیت بھی کرسکتی ہیں۔

مسئلۂ وراثت

سوال: مؤدبانہ عرض ہے کہ میرے والدین وفات پاچکے ہیں انہوں نے اپنی زندگی میں کچھ رقم ادھار دی تھی، جواب مجھے ملے گی، وہ رقم تقریباً ۹۷ ہزار ہے۔ اس لئے التماس ہے کہ اس رقم کی تقسیم کے بارے میں میری مدد فرمائیں اور اس رقم میں سے کچھ رقم میں اپنے والدین کے صدقہ جاریہ کے لئے بھی دینا چاہتی ہوں۔ برائے کرم آپ میرا یہ کام جلد از جلد کردیں تاکہ میں اپنے فرائض پورے کرسکوں، (رخسانہ زبیر، فائیو اسٹار کمپلیکس بلاک نمبر ۲ گلشن اقبال۔ کراچی)۔

جواب: سوال میں مذکورہ رقم باپ کی ہو یا ماں کی، یہ ان کا ترکہ ہے اور ان کے بقیہ ترکے یعنی مالِ وراثت میں شامل ہوکر ان کے شرعی وارثوں میں اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم ہوگا، کوئی ایک وارث دوسرے ورثاء کی رضامندی کے بغیر یک طرفہ طور پر اس رقم کو ایصال ثواب

کے لئے صدقہ جاریہ میں نہیں لگا سکتا بصرف اپنا حصہ لگا سکتا ہے، یا ان وارثوں کا جو خوش دلی سے اس پر راضی ہوں، ہاں اگر سب ورثاء باہمی رضامندی سے اس رقم کو اپنے ماں باپ کے ایصال ثواب کیلئے صدقۂ جاریہ میں لگانا چاہیں تو جائز ہے، یہ ان کی سعادت مندی ہے، انہیں بھی ثواب ملے گا اور ان کے مرحوم والدین کو بھی ثواب ملے گا۔

مسئلۂ وراثت

سوال: عرض یہ ہے کہ میرے والدین کی وفات ہو چکی ہے، انہوں نے کچھ رقم ورثے میں چھوڑی ہے جس کی تقسیم کرنی ہے، وہ رقم تقریباً ۳ لاکھ ۲۵ ہزار ہے اور ہم تین بہنیں اور دو بھائی ہیں یہ رقم ان سب میں تقسیم کرنی ہے آپ سے گزارش ہے کہ قانونی اور شرعی لحاظ سے اس کی تقسیم میں میری مدد فرمائیں۔ (رخسانہ زبیر FL-2 فائیو اسٹار کمپلیکس بلاک نمبر ۲ گلشن اقبال، کراچی)

ہم پانچ بہن بھائی ہیں جن کے نام یہ ہیں

تین بیٹیاں : (۱) فہمیدہ بیگم (۲) شاہانہ تبسم (۳) رخسانہ تبسم

دو بیٹے : (۴) پرویز خلیل (۵) جاوید خلیل

جواب: اگر ورثاء کی تعداد یہی ہے جو سوال میں مذکور ہے تو ترکہ کی تقسیم سے قبل کے جملہ ضروری امور نمٹانے (یعنی مصارفِ تجہیز و تکفین، متوفی کے ذمہ اگر کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو ایک تہائی ترکے کی حد تک اس کے نفاذ) کے بعد ترکے کی تقسیم یوں ہوگی کہ ترکے کے کل سات حصے ہوں گے، ان میں سے ہر بیٹے کو دو دو حصے اور ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا۔

ورثہ کی تقسیم

سوال: ورثہ کی تقسیم میں ہماری رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ والدہ مرحومہ کی ملکیت میں ایک الاٹ شدہ مکان ہے جس میں والدہ کے ساتھ ہم دونوں بھائی رہائش پذیر تھے، والدہ مرحومہ کے صرف ہم دو ہی بیٹے تھے۔ بڑے بھائی کی شادی والدہ مرحومہ کی حیات ہی میں ہو چکی تھی، جبکہ میری شادی والدہ کی وفات کے بعد ہوئی- میری شادی کے بعد گھریلو حالات کی شراکت کے سبب مجھے یہ مکان چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ بڑے بھائی صاحب اپنے بیوی بچوں

کے ساتھ اسی مکان پر قابض و متصرف رہے۔ والدہ مرحومہ کی حیات ہی میں، مَیں نے اس مکان میں اپنی ذاتی کمائی سے ایک کمرہ بنوایا تھا، میرے وہاں سے نکل جانے کے بعد بھائی نے بھی ایک کمرہ اور بنوایا ہے- بھائی کا انتقال حال ہی میں یعنی فروری 2003ء میں ہوا ہے، ان کی پہلی بیوی جس سے علیحدگی (طلاق) ہو چکی ہے، سے چھ بچے، ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں۔ دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے ایک بیٹی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔

کافی عرصہ پہلے والدہ کی وفات کے بعد محلے کے چند بزرگوں کی موجودگی میں طے پایا تھا کہ دونوں بھائیوں کے نام مکان منتقل کر دیا جائے، کیونکہ اس مکان کے دو ہی وارث ہیں، اس سلسلہ میں ضروری قانونی کارروائی بھی کر لی گئی تھی لیکن یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

محترم! شریعت کی رو سے بتائیں کہ والدہ مرحومہ کے مکان کی ملکیت کی تقسیم کس طرح ہوگی کیونکہ بھائی کی اولاد کا مطالبہ ہے کہ ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے جب کہ بھائی صاحب مرحوم کی بیوہ ابھی اسی گھر میں عدت گزار رہی ہیں۔ (محمد غفران، 345/16، فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: بر تقدیر صدقِ سائل و انحصارِ ورثاء در مذکورین و بعد ادائیگی حقوقِ متقدمہ علی الارث (یعنی مصارفِ تجہیز و تکفین، مرحومہ کے ذمہ قرض اگر کوئی ہو تو اس کی ادائیگی اور اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی ترکے پر اس کے نفاذ کے بعد) بقیہ ترکہ کے کل 16 حصص کئے جائیں گے اور ورثاء میں حسب ذیل تناسب سے تقسیم ہوں گے۔

بیٹا (سائل محمد غفران)	=	8 حصے
بڑے بیٹے کی زوجۂ ثانی جو اس کی وفات کے وقت نکاح میں تھی	=	1 حصہ
بڑے بیٹے کا بیٹا یعنی مرحومہ کا پوتا	=	2 حصے
بڑے بیٹے کی پانچ بیٹیاں یعنی مرحومہ کی پوتیاں	=	5 حصے
(ہر بیٹی کو ایک حصہ ملے گا) کل حصص	=	16 حصے

بڑے بیٹے کی سابقہ مطلقہ بیوی اور دوسری بیوی کی پہلے شوہر سے بیٹی کو ترکے میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ سائل (محمد غفران) اور ان کے بڑے بھائی نے مکان میں ایک ایک کمرے کا اضافہ کیا ہے، اگر ان دونوں کمروں کے سٹرکچر کی مالیت برابر ہو تو تناسب یہی رہے گا، ورنہ منصفین سے فیصلہ کرادیں۔ مرحومہ کے وفات شدہ بڑے بیٹے کی بیوہ عدت اسی مکان میں

گزاریں گی، اس کے بعد وہ اس مکان میں سوہویں (1/16) حصے کی حقدار ہیں اور اگر ان کے مرحوم شوہر کا اس مکان میں نصف حصے کے علاوہ اور بھی کوئی ترکہ ہے (منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی صورت میں) تو وہ اس میں سے بھی آٹھویں حصے (1/8) کی حقدار ہیں، اگر اس وارث بیوہ کا مہر ان کے مرحوم شوہر نے اپنی زندگی میں ادا کر دیا تھا تو فبہا، ورنہ مرحوم کے ترکے کی تقسیم سے پہلے ان کے ترکے میں سے بیوہ کا دینِ مہر بھی ادا کرنا ہوگا۔

عقدِ ثانی سے سابق شوہر کے ترکے میں بیوہ کا حق وراثت ساقط نہیں ہوتا

سوال: میری شادی شدہ بیٹی رضوانہ محسن کے شوہر کا ۱۴ر اپریل ۱۹۹۷ء کو انتقال ہوا، سابق شوہر سے اس کے بچے بھی ہیں، اپریل ۱۹۹۸ء میں میری بیوہ بیٹی نے عقدِ ثانی کر لیا، ابھی تک اسے سابق شوہر کے ترکہ سے حصہ نہیں ملا، اب ان کے سابق شوہر کے گھر والے (یعنی سابق سسرالی رشتہ دار) کہتے ہیں کہ چونکہ اس نے عقدِ ثانی کر لیا ہے، اس لئے اب وہ متوفی شوہر کے ترکے سے وراثت کی حق دار نہیں رہی اور اسے اب مرحوم کی منقولہ وغیر منقولہ متر وکہ جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ ازراہِ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں بتائیں کہ کیا بیوہ عقدِ ثانی کرنے سے سابق شوہر کے ترکے سے محروم ہو جاتی ہے، (فہمیدہ رحیم والدہ رضوانہ محسن، معمار پلازہ، گلشن اقبال)۔

جواب: آپ کی بیٹی رضوانہ محسن کا اپنے سابق شوہر کے ترکے میں آٹھواں حصہ ہے۔ عقدِ ثانی سے اس کا سابق شوہر کے ترکے میں حق وراثت متاثر نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور قائم رہتا ہے جب تک کہ اسے ادا نہ کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ اگر خدانخواستہ اپنے مرحوم ومتوفی شوہر کے ترکے سے حصہ پائے بغیر کسی بیوہ کا انتقال ہو جائے تو یہ حق وراثت اس کے ورثاء کو منتقل ہو جائے گا اور وہ اس کے جائز دعویدار ہوں گے اور اگر اس دنیا میں کسی نے کسی کا حق غصب کر لیا تو اسے آخرت میں اس کا حساب دینا ہوگا۔ ''حقوق العباد'' کا مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ شہید سے بھی اس کی باز پرس ہوگی۔ حدیث مبارک میں ہے:

> ''حضرت ابو قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ فضیلت جہاد پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! مجھے بتایئے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں تو کیا میرے

سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں، اگر تم صبر واستقلال اور اخلاص کے ساتھ دشمن کو پیٹھ دکھائے بغیر (میدان جہاد میں) پیش قدمی کرتے ہوئے شہید ہو جاؤ (تو تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے)، مگر کسی کا قرض اگر تمہارے ذمہ ہے تو وہ معاف نہیں ہوگا، جبریل امین نے مجھے اس مسئلے میں یہی کہا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الجہاد)۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہادت سوائے قرض کے ہر گناہ کا کفارہ بن جاتی ہے''۔ (مشکوٰۃ، کتاب الجہاد)

اور جو لوگ خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے بے نیاز ہو کر دوسروں کا مال ہڑپ کر لیتے ہیں، انہیں مندرجہ ذیل حدیث پاک پڑھ کر عبرت حاصل کرنی چاہئے اور اپنی عاقبت وآخرت کی اصلاح کی فکر کرنی چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم جانتے ہو کہ (سب سے بڑا) مفلس کون ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ہمارے نزدیک تو جس کے پاس مال و دولتِ دنیا نہ ہو، وہی (سب سے بڑا) مفلس ہے، آپ نے فرمایا: (نہیں) میری امت کا (سب سے بڑا) مفلس وہ ہوگا، جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا ذخیرۂ عمل لے کر آئے گا، لیکن اس نے (اس دنیا میں) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بدکاری کی تہمت لگائی ہوگی، کسی کا (ناحق) مال کھایا ہوگا، کسی کا خونِ (ناحق) بہایا ہوگا، کسی کو (ظلماً) مارا پیٹا ہوگا، تو ان سب (مظلومین اور حق داروں) کو ایک ایک کر کے اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، اگر ان ساری حق تلفیوں اور مظالم کے عوض اس کی نیکیاں کم پڑ جائیں گی، تو ان کے گناہ لے کر اس کے کھاتے میں ڈال دیئے جائیں گے، اور پھر (انجام کار) اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، (مشکوٰۃ باب الظلم بحوالہ صحیح مسلم)''

مسئلۂ وراثت

سوال: میں مسماۃ شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) سکنہ مکان نمبر ۹۳-۳-آر بلاک نمبر ۱۵ دستگیر کالونی فیڈرل بی ایریا کراچی میں رہتی ہوں۔ عرض کرتی ہوں کہ میرے شوہر محمد طاہر کا انتقال مورخہ ۶-۷-۱۲-۱۶ کو کراچی میں ہوا تھا۔ میرے شوہر نے ۱۲۰ مربع گز کا پلاٹ تعمیر شدہ چھوڑا

ہے۔ وراثت حق ہر ایک کا کتنا ہے۔ جبکہ وارثوں میں ایک بیوی (شہناز بیگم) دو بیٹیاں، ایک بہن، ایک چچا، دو پھوپھیاں ہیں۔ میرے شوہر کا نہ کوئی بھائی ہے اور نہ ہی والدین حیات ہیں۔ میں شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) ایک بے سہارا عورت ہوں میرا ایک بھائی ہے جو ہماری کفالت کرتا ہے اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ برائے مہربانی آپ قرآن و سنت کی روشنی میں وراثت کا حق تجویز فرمائیں"۔

(شہناز بیگم زوجہ محمد طاہر (مرحوم) ۳۹۳۔ آر بلاک نمبر ۱۵ دستگیر کالونی۔ کراچی)

جواب: اگر سائلہ کے بیان کردہ واقعات درست ہیں اور متوفی کے شرعی وارث وہی ہیں جو سوال میں بیان کئے گئے ہیں، تو تقسیم ترکہ سے پہلے کے ضروری مالی حقوق ادا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کل ۲۴ حصوں میں منقسم ہوگا اور ہر وارث کا حصہ درج ذیل ہوگا۔

بیوہ	=	3 حصے	(یعنی 1/8 حصہ)
دو بیٹیاں	=	16 حصے	(یعنی 2/3 حصے) ہر ایک بیٹی کو آٹھ آٹھ حصے ملیں گے
بہن	=	5 حصے	(بقایا حصے بہن کو ملیں گے)

چچا اور پھوپھیاں محروم رہیں گے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: ایک شخص جو انتقال کر گئے اور اس نے تین بیٹے، تین بیٹیاں اور ایک بیوہ چھوڑے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں مذکور ورثاء کو کتنے کتنے حصے ملیں گے۔ کیا شریعت میں یہ ضروری ہے کہ ان افراد کو بتایا جائے کہ کل ترکہ کتنا ہے۔ (سائل محمد ادریس قادری۔ کراچی)

جواب: متوفی کے ترکہ میں سے مصارف تجہیز و تکفین وضع کرنے اور اگر اس کے ذمے کسی کا قرض ہے تو اس کی ادائیگی کرنے کے بعد بقایا ترکے کے ایک تہائی حصے پر اس کی وصیت جاری ہوگی (اگر کی ہو)۔ اس کے بعد جو ترکہ بچے گا وہ اس کی وفات کے وقت موجودہ ورثاء میں حسب ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل 72 حصے ہوں گے اور ہر وارث کا حصہ مندرجہ ذیل ہوگا:

بیوہ = 9 حصے، تین بیٹے = 42 حصے (ہر بیٹے کو 14 حصے ملیں گے)، تین بیٹیاں = 21 حصے (ہر بیٹی کو

7 حصے ملیں گے)

چونکہ ترکہ میں تمام ورثاء کا حق ہے، اس لئے ہر ایک کو معلوم ہونا چاہئے کہ کل ترکہ کتنا ہے اور از روئے شریعت اس کا حصہ کتنا ہے۔

فوت شدہ قرض خواہ کی رقم کو وارثوں کی مرضی کے بغیر ایصالِ ثواب میں لگانا

سوال: میں نے اپنی رشتہ دار خاتون سے ۲ لاکھ روپے قرض لئے، لیکن قرض کی ادائیگی سے پہلے ہی مذکورہ خاتون کا انتقال ہوگیا۔ مذکورہ خاتون کے قریبی وارثوں میں صرف ایک لڑکا اور لڑکی ہیں، دونوں بالغ ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں مذکورہ رقم میں سے ایک لاکھ روپے مرحومہ کے نام پر کسی خیراتی ادارے کو دے دوں اور باقی ایک لاکھ روپے دونوں بہن بھائی میں تقسیم کردوں۔ کیا ایسا کرنا از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ مذکورہ رقم دونوں بھائی، بہن میں کس تناسب سے تقسیم کروں اور ان دونوں میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہوگا۔ یہ دونوں بہن بھائی مجھ سے رقم کا تقاضہ کر رہے ہیں؟

نوٹ:- یہ رقم میں نے مرحومہ خاتون سے تین مہینے کے لئے نفع و نقصان کی شراکت پر کاروبار کے لئے لی تھی، (افتخار اللہ۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)۔

جواب: آپ نے مرحومہ خاتون سے جو ۲ لاکھ روپے قرض لئے تھے، اب وہ ان کا ترکہ ہے، چونکہ یہ رقم آپ نے نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد پر لی تھی جسے اصطلاح شریعت میں مضاربت کہتے ہیں تو اب تک آپ نے جو نفع کمایا ہے، اور اس منافع میں ان کا جو حصہ طے تھا، وہ بھی ان کی رقم میں جمع ہو کر ان کے مجموعی ترکے میں شامل ہوگا۔ آپ کی یہ خواہش کہ "آپ مرحومہ کی رقم میں سے (ایصال ثواب کے لئے) ایک لاکھ روپے کسی خیراتی ادارے کو دے دیں"، اس کا شرعاً آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے، یہ اردو محاورے کے مطابق "حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ" والی بات ہوگی۔ یہ سارا مال اب مرحومہ کا ترکہ ہے اور اس کے وارثوں کا حق ہے دوسروں کے مال میں تصرف کرنے کا آپ کو قطعاً اختیار نہیں ہے، باقی سوال میں درج صورتحال اگر درست ہے اور مرحومہ خاتون کے شرعی ورثاء صرف دو ہی ہیں یعنی ان کا صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی، ان کے

علاوہ اس کی وفات کے وقت اگر ان کے والدین اور شوہر حیات نہیں تھے، بلکہ اس سے پہلے وفات پاچکے تھے تو مرحومہ کے مجموعی ترکے میں سے (جس میں آپ کے پاس موجود ۲ لاکھ روپے بھی شامل ہیں) دو حصے بیٹے کو ملیں گے اور ایک حصہ بیٹی کو ملے گا۔ آپ کے سوال میں ایک تضاد بھی ہے شروع میں آپ نے لکھا ہے آپ نے دو لاکھ روپے مرحومہ سے قرض لئے تھے، اگر آپ کے بیان کا یہ حصہ درست ہے تو وہ ۲ لاکھ روپے مرحومہ کا ترکہ اور اس کے وارثوں کا حق ہے۔ سوال کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے وہ رقم کاروبار کے لئے نفع ونقصان میں شراکت کی بنیاد پر لی تھی، جسے شرعاً مضاربت کہتے ہیں۔ اگر آپ کے بیان کا پہلا حصہ غلط ہے اور یہ حصہ درست ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آپ دونوں کے درمیان نفع میں شراکت کا تناسب کیا طے پایا تھا، جو بھی حقیقی صورتحال ہو، عنداللہ آپ بہتر جانتے ہیں کہ آپ کو اس تجارت میں کتنا نفع ہوا، اس نفع کی رقم میں سے مرحومہ کا طے شدہ حصہ ان کی اس اصل رقم میں جمع کرکے آپ کو اس کے وارثوں کو دینا ہوگا۔ اور اگر خدانخواستہ آپ کو تجارت میں کچھ نقصان ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہی کے تصور اور شرعی دیانت وامانت کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے کل رقم (۲ لاکھ روپے) میں سے وہ نقصان وضع کرکے باقی واجب الادا رقم اس کے وارثوں کو دے دیں۔

فاتحہ کس کے مال سے دی جائے؟

سوال: میت کے ایصالِ ثواب کی غرض سے جو کھانا وغیرہ تیار کیا جاتا ہے، وہ کس کے مال سے دیا جانا چاہئے، آیا میت کے ترکہ سے دیا جائے یا ورثاء اپنے مال میں سے دیں؟

(عمران اشرف۔ گلشن اقبال، کراچی)

جواب: اگر میت نے اپنی موت سے پہلے اپنے ایصالِ ثواب یا صدقۂ جاریہ کے لئے کوئی وصیت کی ہے تو یہ اس کی وصیت کے مطابق اس کے ترکے میں سے دیا جائے گا، لیکن اگر اس کی وصیت کی مقدار اس کے ایک تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو اسے تہائی تک محدود رکھا جائے گا۔ اگر کوئی وارث یا چند ورثاء عاقل وبالغ ہیں اور میت کی ایک تہائی سے زائد وصیت کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے مال میں سے یا میت کے ترکے میں سے انہیں جو حصہ ملے گا، اس میں سے ایسا کرسکتے ہیں۔ کسی نابالغ وارث کے حصے پر کسی کو کوئی تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ اور اگر میت

نے موت سے پہلے اپنے ایصالِ ثواب یا صدقۂ جاریہ کے لئے کوئی وصیت نہیں کی، لیکن ورثاء مالی ایصالِ ثواب کرنا چاہتے ہیں تو عاقل وبالغ ورثاء اپنے مال میں سے یا ترکے میں سے انہیں جو حصہ ملے گا وہ اس میں سے ایسا کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، لیکن نابالغ وارث کے حصے میں کوئی تصرف نہیں کرسکتے۔ وصیت کے بغیر میت کے ترکے میں جو تصرفات لازمی طور پر کرنے ضروری ہیں اور جس سے نابالغ وارثوں کا حصہ بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ صرف دو طرح کے مصارف ہیں، ایک کفن دفن کے مصارف اور دوسرا اس کے ذمے اگر کسی کا کوئی قرض ہو تو اس کا ادا کرنا ضروری ہے۔ امام شافعی کے نزدیک میت کے ترکے میں سے حقوق العباد کی طرح حقوق اللہ کے مالی واجبات بھی وضع کرنے لازمی ہیں، لیکن امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک حقوق اللہ کے مالی واجبات (مثلاً زکوٰۃ کے بقایا جات، صدقۂ فطر کے واجبات، فدیہ صوم کے واجبات اور کفارات کے واجبات وغیرہ) لازماً وضع نہیں ہوں گے بلکہ اگر اس نے وصیت کی ہے تو ایک تہائی ترکے کی حد تک وہ مؤثر ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے واجبات وصیت کی صورت میں ایک تہائی ترکے سے زیادہ بنتے ہیں تو عاقل وبالغ ورثاء، رضاکارانہ طور پر اپنے مال میں سے یا ترکے کے حصہ میں سے ادا کرسکتے ہیں، لیکن نابالغ وارثوں کے حصے میں سے یہ تصرف نہیں ہوگا، یہی مسئلہ بصورتِ وصیت یا عدمِ وصیت فرض حج بدل کا ہے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: جناب عالی میرے والد نے انتقال کے وقت ایک کوارٹر چھوڑا تھا اس کوارٹر کو فروخت کرنے کے بعد ہم کو ۲ لاکھ ۸۲ ہزار روپے کی رقم حاصل ہوئی ہے۔ اس رقم کے وارثوں میں ہماری ایک بیوہ ماں اور ۶ لڑکے ۳ لڑکیاں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لڑکی کا انتقال ہمارے والد کی موجودگی میں ہوگیا تھا۔ لیکن ان کی اولاد موجود ہے برائے مہربانی ہماری رہنمائی فرمائیں کہ کس کے حصے میں کتنی رقم بنتی ہے۔ ہماری والدہ کی خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی میں تمام اولادوں کو ان کا حصہ دے دوں برائے مہربانی اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں قرآن وسنت کے مطابق ہماری رہنمائی فرمائیں۔ (عمران الحق، نیو کراچی)

جواب: شرعی اصول یہ ہے کہ کسی شخص کے انتقال کے بعد اگر اس نے کوئی ترکہ چھوڑا ہے تو اس میں سے سب سے پہلے اس کی تجہیز وتکفین کے مصارف وضع کئے جائیں گے، اس کے

بعد اس کے ذمے اگر کسی کا قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر اس نے کوئی وصیت کر رکھی ہو تو بقیہ ترکے کی ایک تہائی تک وہ شرعاً مؤثر اور نافذ العمل ہوگی، لیکن اس میں بھی یہ امر ملحوظ رہے کہ وارث کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہوگی۔ اس کے بعد ترکہ موجود ورثاء میں تقسیم ہوگا، موجود ورثاء سے مراد یہ ہے کہ جو شرعی وارث متوفی شخص کی وفات کے وقت بقیدِ حیات ہوں، اب صورتِ مسؤلہ میں آپ کے والد مرحوم کا ترکہ حسبِ ذیل شرح سے تقسیم ہوگا۔ ترکہ کے کل حصص ۱۲۰ ہوں گے۔ ان میں سے:

زوجہ (یعنی آپ کی والدہ) = ۱۵ حصے، ۶ بیٹے (فی کس ۱۴ حصے) کل = ۸۴ حصے، ۳ بیٹیاں (فی کس ۷ حصے) کل = ۲۱ حصے

جو بیٹی مرحوم کی زندگی میں وفات پا چکی تھی اس کی اولاد وراثت سے محروم رہے گی لیکن بقیہ ورثاء اگر تبرع اور فضل واحسان کے طور پر اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کو کچھ دے دیں تو یہ بڑے اجر و ثواب اور صلۂ رحمی کی بات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا (النساء:8)

"اور جب (ترکہ کی) تقسیم کے موقع پر (غیر وارث) رشتے دار اور یتیم اور محتاج آ جائیں تو انہیں (بھی) اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے اچھی بات کہو"۔

اس آیت میں قرآن نے وجوباً تو نہیں بلکہ ایک مندوب و مستحب امر کے طور پر یہ تعلیم دی ہے کہ ایسے موقع پر ان لوگوں کی دلداری کے لئے جو شرعاً وارث نہیں بنتے، کچھ نہ کچھ مدد کر دی جائے تو یہ ایک اعلیٰ اخلاقی قدر ہوگی، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ تقسیمِ وراثت کا عمل شروع کرنے سے پہلے تمام ورثاء رضا کارانہ طور پر اور باہمی اتفاق رائے سے ان کے لئے کچھ مال الگ کر دیں، دوسری یہ کہ تقسیم کے بعد ہر ایک وارث اپنے حصے میں سے حسبِ توفیق ان لوگوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرے، لیکن تبرع واحسان کا یہ حکم بالغ ورثاء کے لئے ہے۔ نابالغ وارث کے حصے میں سے کسی کو ایسے تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

مسئلۂ وراثت

سوال: ایک صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، ان کے پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے اور تین

بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں شادی شدہ ہیں، لہٰذا اس صورت میں ترکے کی تقسیم کس طرح ہوگی، (بیوہ غلام حسین۔ دستگیر کالونی، کراچی)۔

جواب: صورتِ مسئولہ میں متوفی کے ترکے سے (۱) مصارفِ تجہیز و تکفین وضع کرنے (۲) ادائیگی قرض (اگر کوئی ہو) (۳) ایک تہائی ترکے کی حد تک نفاذِ وصیت (اگر کی ہو) کے بعد جو ترکہ بچے گا، وہ مندرجہ ذیل تناسب سے تقسیم ہوگا۔ کل ترکہ کے ۸ حصے کئے جائیں گے۔ ان میں سے بیوہ کو ایک حصہ، دو بیٹوں کو چار حصے (فی کس دو حصے) اور تین بیٹیوں کو تین حصے (فی کس ایک حصہ) ملیں گے۔ وراثت کی تقسیم میں اولاد میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔

مسئلۂ وصیت

سوال: اگر کسی شخص نے مرنے سے پہلے یہ وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرے ورثے میں سے "۳۳" فیصد اللہ کی راہ خرچ کرنا کیا اس کی وصیت میں کمی یا زیادتی جائز ہے یا نہیں یا ۳۳ فیصد ہی دینا پڑے گا، (محمد ادریس قادری۔ کراچی)۔

جواب: اگر کسی نے وصیت کی ہو کہ میری موت کے بعد میرے ترکے میں سے ایک مقررہ رقم یا حصہ یا معینہ چیز فلاں کارِ خیر میں صرف کرنا یا فلاں شخص کو دے دینا۔ تو کل ترکے کی ایک تہائی مالیت (۳/۱ یا ۳۳ء۳۳ فیصد) تک اس پر عمل کرنا اور اسے نافذ کرنا واجب ہے۔ اگر وصیت کی مالیت کل ترکے کی ایک تہائی کے برابر یا اس سے کم ہو تو پوری نافذ ہو جائے گی، ایک تہائی سے زیادہ ہو تو ایک تہائی تک موثر ہوگی اور باقی لغو ہو جائے گی۔ ہاں اگر تمام وارث متفقہ طور پر اسے نافذ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، ورنہ جو وارث راضی ہو صرف اس کے حصے سے ادا ہوگی، نابالغ وارثوں کے حصہ سے ادا نہ ہوگی، اگر وصیت کسی ایسے شخص کے حق میں کی ہے جو خود بھی وارث بن رہا ہو، تو اس کے حق میں وصیت معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

لا وصیۃ لوارث

"وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے"۔

مسئلۂ امانت

سوال: عرض یہ ہے کہ بندہ جدہ میں کپڑے کی تجارت کرتا ہے، کراچی سے مال لے جا کر جدہ فروخت کرتا ہے، ہوا یہ کہ بندے نے اپنے عزیز کو دس ہزار ریال اپنے دوست سے دلوائے اور کہا کہ یہ رقم ''ٹی۔ٹی'' یا ''حوالے'' کے ذریعے دبئی بھیج کر والد کو پاکستان میں حوالہ کر دے، میں پاکستان میں تمہارے والد سے وصول کرلوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ میرے دوست آصف اقبال نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ رقم اپنے تایا کے ہاتھ روانہ کردی۔ لیکن جب وہ شخص پاکستان آیا تو اس نے کہا کہ وہ رقم مجھ سے گم ہوگئی ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ آصف اقبال یہ کہتا ہے کہ یہ نقصان مجھ پر نہیں آتا، بلکہ محمد انیس یونس (یعنی سائل) پر عائد ہوتا ہے۔ جبکہ میں نے یہ رقم اپنے دوست کو جو دبئی میں رہتا ہے، بھیجنے کے لئے کہا تھا، تاکہ اس کے حوالے کر کے پاکستان میں آصف کے والد اقبال لالا سے وصول کرلیتا۔ ازروئے شریعت بتائیں کہ اس نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے، یہ میرا نقصان ہے یا میرے دوست آصف اقبال کا، جس نے میری ہدایت کے برعکس کام کیا''۔ (محمد انیس یونس قادری، صدیق آباد، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی)

جواب: اگر معاملے کے حقائق و واقعات یہی ہیں جو بیان کئے گئے ہیں، تو آصف اقبال پر لازم ہے کہ وہ ضائع ہونے والی رقم آپ کو ادا کرے، خواہ وہ یہ رقم اپنے تایا سے وصول کر کے ادا کرے یا اپنے پاس سے ادا کرے، کیونکہ آپ (محمد انیس) نے آصف اقبال کو یہ کہہ کر رقم کا ذمہ دار بنایا تھا کہ وہ T.T یا حوالے کے ذریعے اس رقم کو براستہ دبئی اپنے والد کو کراچی (پاکستان) بھیج دے، لیکن آصف اقبال نے محمد انیس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی اور محمد انیس کی مرضی کے خلاف طریقہ اختیار کر کے رقم ارسال کی، لہٰذا آصف اقبال اس رقم کے نقصان کے لئے ذمہ دار اور مسئول ہوگا، حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

کسی نے ایک شخص کو مثلاً ایک ہزار روپے دیئے کہ فلاں شخص کو جو فلاں شہر میں ہے دے دینا، اس نے دوسرے شخص کو دے دیئے کہ تم فلاں کو دے دینا، اور راستہ میں روپے ضائع ہوگئے، تو دیکھیں گے کہ اگر دینے والا مرگیا ہے تو مُوْدَع (یعنی جس کو تفویض امانت کی ذمہ داری سونپی تھی) پر تاوان نہیں ہے کہ یہ وصی ہے، اور اگر دینے والا زندہ ہے تو تاوان ہے کہ وہ وکیل ہے، ہاں اگر وہ

شخص جس کو روپے دیئے ہیں، وہ اس (دینے والے) کی عیال میں ہے تو ضامن نہیں ہے۔

(بہارِ شریعت جزء: ۱۴۔ ص: ۳۸۔ موضحاً)

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

دفع الیٰ رجل الف درهم وقال ادفعها الیٰ فلان بالریّ فمات الدافع فدفع المودع المال الیٰ رجل لیدفعه الیٰ فلان بالریّ فاخذفی الطریق لایضمن المودع لانه وصی المیت، فلوکان الدافع حیاضمن الموّدع لانه وکیل، الاان یکون الآخر فی عیاله فلایضمن حینئذٍ "خانیه".

''ایک شخص نے ایک (دوسرے) شخص کو (مثلاً) ایک ہزار روپے دیئے کہ ''رے'' کے مقام پر فلاں شخص کو دے دینا، (بعد میں) دینے والا وفات پا گیا، پھر اس شخص نے (جسے امانت پہنچانے کی ذمہ داری تفویض ہوئی تھی) وہ مال ایک اور شخص کو دے دیا تاکہ وہ ''رے'' کے مقام پر متعلقہ شخص کو پہنچا دے، وہ راستے میں لٹ گیا، تو وہ مُودِع (نقصان کا) ضامن نہیں ہوگا، کیونکہ اب وہ میت کا وصی ہے، اگر دافع (اصل دینے والا) زندہ ہے تو مُودَع ضامن ہے، کیونکہ وہ وکیل ہے، سوائے اس کے کہ وہ دوسرا (یعنی مودع) اس رقم دینے والے کے عیال میں سے ہے تو پھر وہ ضامن نہیں ہوگا، ''بزازیہ''۔ (ردالمحتار ج ۸۔ ص ۴۰۶)

بعینہٖ یہی مسئلہ فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۳۵۳ پر فتاویٰ قاضی خان کے حوالہ سے درج ہے۔

میں (بیوہ) آپ سے مدد اور تعاون کی طلب گار

سوال: میری عمر ۳۲ سال ہے اور میرے ۶ بچے ہیں سب سے بڑے بچے کی عمر ۹ سال ہے اور سب سے چھوٹے بچے کی عمر ایک سال ہے۔ میرا خاوند محمد حنیف عمر ۳۵ سال مورخہ ۲۰ دسمبر ۲۰۰۰ کو شارع نور جہاں تھانے کی حدود میں عبداللہ کالج اور نارتھ ناظم آباد تقریباً ڈھائی بجے دن نامعلوم گاڑی کی ٹکر سے ہلاک ہوگیا ہے جس کی ایف۔ آئی۔ آر نمبر ۲۰۰۰/۱۷۱ بتاریخ ۲۰۰۰۔۱۲۔۲۰ تھانے میں درج ہے۔ (کاپی منسلک ہے) دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے اب تک میرے شوہر کے قاتل نہیں پکڑے جاسکے اور نہ ہی مجھے کہیں سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ ملا۔ معاوضے کے مقدمے کے لیے مختلف وکلاء سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ کیونکہ مارنے

والے نامعلوم ہیں اس لیے معاوضے کا دعویٰ کس کے خلاف ہوگا؟ مجھ بیوہ پر جو چھ معصوم بچوں کی کفالت کر رہی ہے یہ جواب بہت ہی قیامت کے طور پر ٹوٹ پڑا ہے! جناب محترم جناب عالی آپ سے مؤدبانہ میری درخواست ہے کہ جب اسلامی جزیات کا اصول ہے کہ کوئی بھی قتل بغیر ہرجانے کے نہیں جائے گا تو اس صورت میں جبکہ مارنے والے قاتل نہ پکڑے جائیں یا نامعلوم ہوں تو کیا حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ وہ اپنے بیت المال سے کسی شہری کے قتل کا معاوضہ اس کے لواحقین کو دے۔

دوئم یہ کہ اگر حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے تو معاوضے کے تعین کے لیے کیا اصول متعین ہوں گے اور معاوضے کی رقم کس حد تک دی جاسکتی ہے اگر مناسب تحریر اور حوالوں سے اس پر روشنی ڈالی جائے تو مجھ بیوہ اور یتیم بچوں پر احسان عظیم ہوگا کیونکہ آپ کا جواب ہی ہمارے لیے امید کی آخری کرن ہوگی جس کا مثبت ہونے کی صورت میں ہمیں مزید کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوگا،

آمنہ حنیف (بیوہ محمد حنیف) فیڈرل بی ایریا، کراچی

جواب: آپ کے شوہر کی ہلاکت ''قتل بالسبب'' کے تحت آتی ہے۔ چنانچہ علامہ غلام رسول سعیدی شرح صحیح مسلم جلد چہارم، صفحات ۶۷۷۔۶۷۶ پر المبسوط سرخسی، جلد ۲۶، صفحہ ۶۸ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قتل بالسبب: علامہ سرخسی لکھتے ہیں کہ جو قتل عمد ہے نہ خطا نہ قائم مقام خطا (یعنی قتل بالسبب) وہ یہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص راستہ میں کنواں کھودے یا راستہ میں پتھر وغیرہ رکھ دے اور کوئی شخص کنوئیں میں گر کر ہلاک ہوجائے یا پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرے اور مرجائے۔ یہ شخص قتل کرنے کا مرتکب نہیں ہے کیونکہ اس نے مقتول پر کوئی فعل واقع نہیں کیا، اس کا فعل تو زمین کے ساتھ متصل تھا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ عمد، شبہ عمد، خطا یا قائم مقام خطاء قتل کی کسی قسم کا مرتکب نہیں ہے بلکہ اس کے ایک سبب سے قتل ہوا ہے جو سبب متعدی ہے پس ہم اس کے عصبات پر دیت واجب کرتے ہیں تاکہ انسانی جان رائیگاں جانے سے بچ جائے اور اس شخص پر نہ کفارہ واجب ہوگا اور نہ وہ مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا۔ حسب ذیل صورتیں بھی قتل بالسبب میں داخل ہیں:

۱۔ کوئی شخص کسی جانور کو ہانک کرلے جارہا ہو اور وہ جانور کسی شخص کو ہلاک کردے۔
۲۔ کوئی شخص تیز رفتار گاڑی چلائے اور اس کی جھپٹ میں آکر کوئی شخص ہلاک ہوجائے۔

۳۔ کوئی اناڑی شخص گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے کوئی آکر ہلاک ہوجائے۔
۴۔ کوئی شخص نشہ میں آکر گاڑی چلائے اور اس کی گاڑی کے نیچے آکر کوئی شخص مرجائے۔''

اب مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے شوہر کے قاتل کا پتا نہیں ہے جس کی گاڑی کی ٹکر سے ان کا انتقال ہوا ہے، اگر قاتل کا پتا ہوتا تو دیت اس کی عاقلہ یعنی عصبہ وارثوں پر عائد ہوتی، یہ مسئلے کی شرعی نوعیت ہے، ورنہ ہمارے معاشرے میں اسلام کی مکمل حکمرانی نہ ہونے کی وجہ سے عاقلہ کا تصور اب مفقود ہے۔ موجودہ صورت میں جب کہ قاتل کا پتا نہ ہو، بلاشبہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان کا خون رائیگاں نہ جائے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ''کتاب القسامہ والمحاربین والدیات'' میں احادیث نمبر ۴۲۲۹ تا ۴۲۳۶ میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ عبداللہ بن سہل بن زید اور محیصہ بن مسعود بن زید (دو چچازاد بھائی) یہود کے علاقے خیبر میں گئے اور کسی وجہ سے ایک دوسرے سے بچھڑ گئے، پھر محیصہ کو عبداللہ کی لاش (Dead Body) ملی، انہیں کسی نے قتل کردیا تھا، محیصہ نے اپنے چچازاد بھائی عبداللہ کو دفن کردیا۔ پھر محیصہ، حویصہ (مقتول کے چچازاد) اور عبدالرحمٰن بن سہل (مقتول کے بھائی) نے یہ مقدمہ رسول اکرم ﷺ کے حضور پیش کیا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہارے پچاس آدمی قسم کھائیں گے کہ فلاں شخص ہمارے بھائی کا قاتل ہے تاکہ قاتل تمہارے حوالے کردیا جائے، انہوں نے عرض کیا: ''جس واقعے کو ہم نے دیکھا نہیں، اس بارے میں ہم کیسے قسم کھا سکتے ہیں۔'' اس پر حضور نے فرمایا: ''پھر (اس بستی کے) پچاس یہودی تمہارے سامنے (اس کی بات کی) قسم کھا کر (کہ نہ ہم نے عبداللہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی ہمیں قاتل کے بارے میں کچھ علم ہے) اپنی براءت ثابت کرلیں گے۔'' اس پر مدعیان نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) کفار کی قسموں کا کیا اعتبار؟، چنانچہ آخرکار رسول اللہ ﷺ نے خود دیت ادا فرمادی، حدیث مبارک کے الفاظ یہ ہیں:

فلما رأی رسول اللہ ﷺ ذالک اعطیٰ عقلہ.

''جب رسول اللہ ﷺ نے یہ صورت حال دیکھی تو خود مقتول کی دیت ادا فرمادی''۔

دوسری روایت میں ہے:

فَوَدَاہ رسول اللہ ﷺ مِنْ قِبَلِہٖ

''تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی جانب سے دیت ادا فرمادی''۔

تیسری روایت میں ہے:

فکرہ رسول الله ﷺ ان یبطلِ دمَہ فوداہ مائۃ ابل من الصدقۃ۔

”تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے خون کا رائیگاں ہونا گوارا نہ فرمایا اور صدقہ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دے کر اس کی دیت ادا فرما دی“۔

یہاں ”قسامت“ کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے، صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ جب ایک مقتول کا شہادت یا اعترافِ جرم کے ذریعے قصاص بھی نہ لیا جاسکا اور دیت کی بھی کوئی صورت نہ نکلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ ایک مسلمان کا خون رائیگاں ہو جائے، لہٰذا آپ نے بیت المال سے دیت ادا فرما دی۔ چنانچہ علامہ عبدالقادر عودہ اپنی تصنیف ”التشریع الجنائی الاسلامی“ الجزء الثانی صفحات ۳۲۷، ۳۲۸ پر لکھتے ہیں:

الاصل فی القسامة انما شرعت لحفظ الدماء وصیانتها فالشریعة الاسلامیة تحرص اشد الحرص علی حفظ الدماء وصیانتها وعدم اهدارها ولما کان القتل کان یکثر وکان یقل قیام الشهادة علیه لأن القاتل یتحری بالقتل مواضع الخلوات جعلت القسامة حتی لا یفلت المجرمون من العقاب و حتی تحفظ الدماء و تصان۔(بدایة المجتهد ۳۵۸/۲)

ولقد کان من حرص الشریعة علی حیاطة الدماء ما دعا احمد إلی القول بأن من مات من زحام الجمعة أو فی الطواف فدیته فی بیت المال وبمثل هذا قال اسحاق وقال عمر وعلی، فان سعیدا یروی عن ابراهیم أن رجلا قتل فی زحام الناس بعرفة فجاء أهله إلی عمر فقال بَیِّنَتُکُمْ علی من قتله فقال علی یا أمیر المؤمنین لا یطل دم امریء مسلم إن علمت قاتله والا فاعطه دیته من بیت المال وقال الحسن والزهری فیمن مات من الزحام دیته علی من حضرت لان قتله حصل منهم (المغنی ج۱۰ ص۹-۱۰) و لعل فی حدیث الرسول ﷺ الذی قرر القسامة مایؤید هذا النظر ففی روایة متفق علیها أن رسول الله ﷺ قال لهم تاتون بالبینة علی من قتله فقالوا مالنا من بینة قال فتحلفون قالوا لا نرضی بأیمان الیهود فکره رسول الله ﷺ أن یطل دمه فودا بمائة من ابل

لصدقة (نیل الاوطار: ج ٦ ص ٣١٢)۔

”قسامت میں اصل یہ ہے کہ انسانی جان کی حفاظت کے لئے مشروع ہوئی ہے، کیونکہ شریعت انسانی جان کی حفاظت اور اس کے رائیگاں نہ ہونے کی شدت سے خواہش مند ہے، اور چونکہ قتل کے واقعات کثیر تھے اور ان پر شہادت کا قائم ہونا بہت کم تھا، کیونکہ قاتل قتل کرنے کے لئے ایسی جگہوں کو تلاش کرتا تھا جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے، تو قسامت کا قانون وضع کیا گیا تاکہ مجرم سزا سے نہ بچ سکیں، اور انسانی جانیں محفوظ رہیں“۔ (بدایۃ المجتہد: ج ۲ ص ۳۲۱)

اور انسانی جانوں کی حفاظت کے لئے شریعت کا تقاضا ہی تھا کہ امام احمد کو یہ کہنا پڑا کہ جو شخص جمعہ کے موقع پر یا دوران طواف اژدحام میں کچل کر مر گیا ہو تو اس کی دیت بیت المال پر ہے، اور ایسا ہی قول امام اسحاق، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے روایت ہے، کیونکہ سعید نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص عرفہ کی بھیڑ میں کچلا گیا اس کے ورثاء نے حضرت عمرؓ کے پاس آ کر شکایت کی، حضرت عمر نے فرمایا: تم اس کے قاتلین کے خلاف گواہ لاؤ۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے امیر المومنین مسلمان کا خون رائیگاں نہیں جاتا اگر آپ کو اس کے قاتل کا علم ہے تو فبہا ورنہ بیت المال سے اس کی دیت ادا کیجئے۔ اور حسن اور زہری نے کہا جو شخص بھیڑ میں کچلا جائے، اس کی دیت حاضرین پر ہے، کیونکہ انہی کی وجہ سے وہ قتل ہوا ہے، اور حدیث قسامت میں بھی اس نظریے کی تائید ہے۔ کیونکہ متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کہا کہ قاتل کے خلاف گواہ پیش کرو۔ عرض کیا: ہمارے پاس تو کوئی گواہ نہیں ہے، آپ نے فرمایا تو تم یہود کو قسمیں دلاؤ گے؟ انہوں نے عرض کیا: ہمیں یہود کی قسموں پر اعتبار نہیں ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو ناپسند کیا کہ مقتول کا خون رائیگاں چلا جائے، تو آپ نے صدقے کے اونٹوں سے سو اونٹ دیت کے طور پر دیئے“۔

لہٰذا آپ عدالت سے رجوع کریں یا ارباب اقتدار سے اپیل کریں کہ وہ سرکاری خزانے یا بیت المال سے آپ کے شوہر کی دیت ادا کریں۔ قتل خطا کی دیت ایک ہزار دینار جو 4.374 کلو گرام سونے کے برابر ہے یا دس ہزار درہم جو 30.618 کلوگرام چاندی کے برابر ہے۔

باپ کا اولاد کے درمیان مساوات کا رویہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین متین مندرجہ ذیل چار سوالوں کے بارے میں، قرآن کریم، حدیث

اور فقہ حنفی کی روشنی میں جوابات زیرِ قلم فرمائیے:

سوال: (۱) کیا ایک باپ کو اپنی زندگی میں اس کا اختیار ہے کہ اپنی جائیداد کی تقسیم میں اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور بیویوں میں امتیاز برتتے کسی کو زیادہ حصہ کسی کو کم اور کسی کو بالکل محروم کر کے ناانصافی کرے، اور دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اپنی اولاد میں فتنہ وفساد کی ایک بڑی بنیاد ڈالے۔

سوال: (۲) کیا کوئی باپ اپنی زندگی میں اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو عاق کر کے مکمل طور پر جائیداد کے حصے سے محروم کر سکتا ہے؟ والد کے مرنے کے بعد عاق کیا ہوا بیٹا دوسرے بھائیوں سے حصہ لینے کا حقدار ہے، اگر وہ فتنہ وفساد اور جان کے خطرے کا باعث بن جاتا ہے تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال: (۳) کیا اسلام میں صرف اولاد پر ماں باپ کے ہر حکم کی تعمیل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ماں باپ پر اپنی اولاد کے بارے میں کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، کیا کوئی باپ اپنی تمام اولاد یا کسی ایک کے ساتھ غلاموں جیسا حقیر سلوک یا برتاؤ کر سکتا ہے، اسلام نے اس کی کہاں تک اجازت دی ہے۔

سوال: (۴) کیا ایک باپ اپنی جائیداد کے علاوہ اپنے ایک بیٹے کی محنت سے کمائی ہوئی جائیداد کو بھی ہڑپ کر کے اپنے دوسرے بیٹوں میں تقسیم کر سکتا ہے اگر کوئی باپ ایسے عمل کا مرتکب ہو جاتا ہے تو اس کی آخرت میں کیا سزا ہوگی، (محمد علی۔ میٹرو ول، کراچی)۔

جواب: (۱) اپنی زندگی میں والد یا والدہ اپنی جائیداد اور مال میں سے اولاد کو جو کچھ دینا چاہیں، وہ ترکہ یا وراثت نہیں کہلاتا بلکہ ''ھبہ'' کہلاتا ہے۔ ھبہ کرنے میں وہ مختار ہیں، ان پر کوئی شرعی لزوم یا پابندی نہیں ہے، البتہ شریعت میں یہ ہدایت ضرور ملتی ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی اپنی اولاد کو ہبہ کرنا چاہے تو وہ اولاد کے درمیان مساوات کرے۔ چند احادیث مبارکہ ملاحظہ کیجیے:

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ اَنَّ اُمَّهٗ بِنْتَ رَوَاحَةَ سَئَلَتْ اَبَاهُ بَعْضَ الْمَوْهِبَةِ مِنْ مَّالِهٖ لِابْنِهَا فَالْتَوٰى بِهَا سَنَةً ثُمَّ بَدَا لَهٗ فَقَالَتْ لَا اَرْضٰى حَتّٰى تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى مَا وَهَبْتَ لِابْنِيْ فَاَخَذَ اَبِيْ بِيَدِيْ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ غُلَامٌ فَاَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ: اِنَّ اُمَّ هٰذَا بِنْتَ رَوَاحَةَ اَعْجَبَهَا اَنْ اُشْهِدَكَ عَلَى الَّذِيْ وَهَبْتُ لِابْنِهَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَا بَشِيْرُ اَلَكَ وَلَدٌ سِوٰى هٰذَا، قَالَ نَعَمْ، قَالَ اَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهٗ

مِثْلَ هٰذَا۔ قَالَ لَا، قَالَ فَلَا تُشْهِدْنِيْ اِذًا فَاِنِّيْ لَا اَشْهَدُ عَلٰى جَوْرٍ۔

''حضرت نعمان بن بشیر بیان کرتے ہیں کہ ان کی والدہ حضرت بنت رواحہ نے ان کے والد (یعنی اپنے شوہر) سے درخواست کی کہ وہ اپنے مال میں سے کچھ ان کے بیٹے (یعنی حضرت نعمان) کو ہبہ کریں، میرے والد ایک سال تک اس معاملے کو ٹالتے رہے، پھر انہیں اس کا خیال آیا، تو میری والدہ نے کہا: میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک کہ آپ میرے بیٹے کے ہبہ پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ نہ بنالیں، تو میرے والد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے اور میں اس وقت نوعمر لڑکا تھا، تو انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس کی ماں بنت رواحہ یہ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو اس چیز پر گواہ بنالوں جو میں نے اپنے اس بیٹے کو ھبہ کی ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: اے بشیر! کیا اس کے علاوہ تمہاری اور بھی اولاد ہے تو انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، حضور نے فرمایا: کیا تم نے سب کو اس جیسا ھبہ دیا ہے، انہوں نے عرض کیا: نہیں، آپ نے فرمایا:

تو پھر مجھے گواہ نہ بناؤ، کیونکہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۰)

قَالَ: اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوْا فِيْ اَوْلَادِكُمْ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۶۹)

قَالَ: فَاِنِّيْ لَا اَشْهَدُ اِلَّا عَلٰى حَقٍّ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: کیونکہ میں حق کے سوا کسی اور چیز پر گواہ نہیں بنتا''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۵)

قَالَ: فَاَشْهِدْ عَلٰى هٰذَا غَيْرِيْ۔

''حضور ﷺ نے فرمایا: پھر اس پر میرے علاوہ کسی اور کو گواہ بناؤ''۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۷۳)

ان احادیث کریمہ کی روشنی میں فقہاء احناف کا مذہب یہ ہے کہ اگرچہ اولاد کے درمیان غیر مساویانہ ھبہ قانوناً نافذ العمل ہو جائے گا، لیکن یہ شرعاً ناپسندیدہ اور مکروہ عمل ہے اور حضور ﷺ نے اسے پسند نہیں فرمایا، جبکہ بعض دیگر ائمہ کے نزدیک ایسا غیر مساویانہ ھبہ باطل ہے اور اس سے

رجوع واجب ہے۔

جواب: (۲) اولاد کی جانب سے والدین کی نافرمانی بہت بڑی شقاوت، بدبختی اور گناہِ کبیرہ ہے اور آخرت میں یہ عذاب کا باعث ہے۔ لیکن والدین کی جانب سے اولاد کو "عاق" کرنے کے یہ معنی مراد لیناکہ "وہ وراثت سے محروم ہوجائے"، یہ شرعاً معتبر نہیں ہے، اور ایسا اعلان کرنے کے باوجود کوئی اولاد اپنے والدین کی وراثت سے محروم نہیں ہوتی۔ وراثت یا ترکہ اس مال یا جائیداد کو کہتے ہیں جو بندہ دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑ کر وفات پا جائے۔ اس کی وفات کے بعد وہ ترکہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہوتا ہے، کسی بندے کو اس میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

جواب: (۳) صحیح مسلم حدیث نمبر: ۴۰۷۳ میں ہے کہ حضور ﷺ نے اولاد کے درمیان ہبہ میں مساوات کی تعلیم وترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً قَالَ بَلَى، قَالَ فَلَا إِذًا.

"(رسول اللہ ﷺ نے حضرت بشیر سے فرمایا:) کیا تمہیں یہ بات اچھی لگتی ہے کہ تمہارے ساتھ حسن سلوک میں تمام اولاد کا رویہ یکساں ہو (اور وہ سب تمہارے تابعدار ہوں)، انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں، (اس پر) آپ نے فرمایا: تو پھر تم بھی اولاد میں عدم مساوات کا برتاؤ نہ کرو۔"

اس حدیث پاک کی رو سے والدین کو نفیس اور اعلیٰ چیزوں میں یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اولاد میں مساوات برتیں، سب کے ساتھ یکساں طور پر مودت، محبت، شفقت، تبرع واحسان اور صلہ رحمی کا برتاؤ کریں۔ اگر خدانخواستہ کسی اولاد کے ساتھ اس کے والدین کا رویہ ظلم وزیادتی کا ہو، تب بھی اولاد کو ہمیشہ اطاعت شعار اور پیکرِ وفا بن کر رہنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک اطاعت والدین کی تاکید فرمائی ہے کہ:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ (العنکبوت: ۸)

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، اور (اے مخاطب!) اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرا جس کا تجھے علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان"۔

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ (لقمان: ۱۵)

"اور اگر وہ (والدین) تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے کچھ علم نہیں، تو ان کی اطاعت نہ کرنا اور (اس کے باوجود) دنیوی امور میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ"۔

ان آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کے والدین کافر یا مشرک بھی ہوں تو ان امور میں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو، لیکن عام معاملاتِ دنیا اور معاشرت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک پھر بھی لازم ہے۔ البتہ اگر کسی کے ماں باپ اولاد پر ظلم وزیادتی کرتے ہوں تو قرآن وحدیث میں ان کے ظلم کو ظلم ہی کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸،۹)

"اور جب (دنیا میں) زندہ درگور کی جانے والی بچی سے پوچھا جائے گا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں مارڈالا گیا"۔

ظاہر ہے جب مظلوم مقتولہ بچی سے پوچھا جائے گا اور اس کی دادرسی ہوگی تو اس کے قاتل والدین سے بازپرس بھی ہوگی اور انہیں ان کے کیے کی سزا بھی ملے گی۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ أَصْبَحَ مُطِيعاً لِلّٰهِ فِي وَالِدَيْهِ أَصْبَحَ لَهُ بَابَانِ مَفْتُوحَانِ مِنَ الْجَنَّةِ وَإِنْ كَانَ وَاحِداً فَوَاحِداً وَمَنْ أَصْبَحَ عَاصِياً لِلّٰهِ فِي وَالِدَيْهِ أَصْبَحَ لَهُ بَابَانِ مَفْتُوحَانِ مِنَ النَّارِ، إِنْ كَانَ وَاحِداً فَوَاحِداً قَالَ رَجُلٌ: وَإِنْ ظَلَمَاهُ، قَالَ وَإِنْ ظَلَمَاهُ، وَإِنْ ظَلَمَاهُ وَإِنْ ظَلَمَاهُ.

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اس حال میں صبح کی کہ والدین (کی فرمانبرداری) کے بارے میں اللہ کے حکم کو ماننے والا ہو تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہوں گے، اور اگر (ماں باپ میں سے کسی) ایک کا اطاعت گزار ہو تو جنت کا ایک دروازہ اس کے لئے کھلا ہوگا، اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ والدین (کی اطاعت) کے بارے میں اللہ کا نافرمان ہو، تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں

کتاب البیوع

گے اور اگر (ماں باپ میں سے) ایک کا نافرمان ہوا تو ایک دروازہ کھلا رہے گا، ایک شخص نے عرض کیا: (یارسول اللہ!) اگر وہ (ماں باپ) دونوں اس پر ظلم کریں (تو بھی ان کی نافرمانی پر وعید صادق ہوگی)، آپ نے (تین بار) فرمایا: اور (ہاں) اگر وہ دونوں اس پر ظلم کریں (تب بھی اس کے لئے یہی سزا ہے)''۔ (مشکوٰۃ باب البر والصلۃ)

اس حدیث مبارک سے دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ اولاد کو والدین کے ظلم وزیادتی کا بدلہ ظلم وزیادتی یا نافرمانی کی صورت میں دینا جائز نہیں ہے، دوسری یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے والدین کے ظلم کو تین بار اپنے کلمات مبارکہ دہرا کر ظلم ہی کہا ہے، اور ظلم ایسا گناہ ہے جو باعث عذاب ہے۔

جواب: (۴) شریعت کی رو سے جب انسان عاقل وبالغ ہوجاتا ہے تو وہ اپنے نفع ونقصان کا خود ذمہ دار ہے، اپنے افعال کے لئے خود جوابدہ ہے اور اپنے مال کا خود مالک ہے، کسی دوسرے کو اس کے مال میں ناروا تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے، خواہ اس کا والد ہی کیوں نہ ہو، ماں باپ کو بھی شرعاً یہ حق نہیں کہ ایک بیٹے کا مال اس کی رضامندی کے بغیر دوسری اولاد کے درمیان تقسیم کردیں یا تلف کردیں یا حیلہ وتدبیر سے اسے ہڑپ کرلیں۔ البتہ شریعت نے ماں باپ کو یہ حق دیا ہے کہ اپنی جائز ضروریات کے لئے اپنی اولاد کے مال میں سے لیں اور وہ اپنی جائز ضروریات کے لئے اولاد کی رضامندی اور اجازت کے بغیر بھی لے سکتے ہیں،

عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: اَتٰى اَعْرَابِيٌّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: اِنَّ اَبِيْ يُرِيْدُ اَنْ يُّجْتَاحَ مَالِيْ، قَالَ اَنْتَ وَمَالُكَ لِوَالِدِكَ، اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، وَاِنَّ اَمْوَالَ اَوْلَادِكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ، فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا۔

''حضرت شعیبؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: بیشک میرا باپ میرے مال کو تباہ وبرباد کرنا چاہتا ہے، آپؐ نے فرمایا: تو اور تیرا مال، تیرے والد کا ہے، بلاشبہ سب سے پاکیزہ مال جو تم کھاتے ہو، وہ تمہاری اپنی کمائی کا مال ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری اولاد کا مال (بھی) تمہاری کمائی (کا مال) ہے پس اسے خوشگوار (سمجھ کر) کھاؤ''۔

(مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۶۳۴۔ ۶۳۳)

گاہک کو ''آخری دام'' بتا کر پھر تخفیف کرنا

سوال: ہم دکان پر اشیاء بیچتے ہیں۔لوگوں کی عادت سی ہوگئی ہے کہ ایک دام پر یقین نہیں کرتے۔ان کا کہنا ہوتا ہے کہ آخری دام بتاؤ مثلاً دکاندار نے کہا کہ اس سوٹ کے آخری دام اٹھارہ سوروپے ہیں۔گاہک سے بحث کر کے اور پھر تخفیف کر کے سولہ سوروپے میں دینا پڑا کیا یہ جھوٹ شمار ہوگا اور ہمارے نامۂ اعمال میں اس کا کوئی گناہ لکھا جائے گا؟ یا ہمارے لئے شرعاً کچھ چھوٹ ہے۔(خرم عبداللہ، کراچی)

جواب: ایک تو اشیاء کو فروخت کرنے اور گاہک کو یقین دلانے کے لئے قسمیں نہیں کھانی چاہئیں کیونکہ اگر قسم جھوٹی ہے تو گناہِ کبیرہ ہے، اور اگر سچی بھی ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیع میں بکثرت قسمیں کھانے سے بچو! کیونکہ اس سے مال تو بک جاتا ہے لیکن اس سے برکت مٹ جاتی ہے۔(صحیح مسلم، رقم الحدیث:۴۰۱۴) دوسرا غلط بیانی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے مومن کا تقدیر پر ایمانِ کامل ہونا چاہئے ایک روایت میں ہے کہ ''جس طرح موت بندے کے تعاقب میں ہوتی ہے اسی طرح مقررہ رزق بھی اس کی تلاش میں رہتا ہے'' تو بندے کی جستجو، سعی اور تمنا یہ ہونی چاہئے کہ ''رزق مقدور حرام کے بجائے حلال ذریعے سے ملے۔'' اسی طرح خلافِ واقعہ یہ بات کبھی نہیں کہنی چاہئے کہ یہ چیز میں نے اتنے میں خریدی ہے بلکہ ٹرانسپورٹیشن، دکان کا کرایہ، ملازمین کی تنخواہ وغیرہ کے مصارف اور حکومت کا ٹیکس ملا کر یوں کہنا چاہئے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے اور جب کسی چیز کو فروخت کرنے کے موقع پر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ ابھی مزید رعایت اور قیمت میں تخفیف کی گنجائش ہے تو پھر یہ نہ کہا کریں کہ یہ آخری اور قطعی دام ہیں کیونکہ آپ کا اعتماد مجروح ہوگا آپ کے قول پر گاہک کا اعتماد نہیں رہے گا، لیکن اگر خدانخواستہ ہماری معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے زوال کے باعث یہ چلن عام ہے کہ آخری دام بھی حقیقت میں آخری نہیں ہوتے۔بلکہ کہنے والے کے ذہن میں گنجائش ہوتی ہے تو پھر ایسا قول کرتے وقت ذہن میں یہ نیت کرنی چاہئے کہ گفتگو اور سوداکاری کے اس مرحلے پر یہ آخری دام ہیں اس سے بات نہ بن سکی تو اگلے مرحلے پر رعایت مزید کروں گا اسے ''توریہ''، ''تعریض'' اور ''ایہام'' کہتے

ہیں اور یہ صریح جھوٹ سے بچنے کا حیلہ ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''بیشک تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے۔''

قسطوں پر اشیاء کی خریداری

سوال: کیا قسطوں پر اشیاء کی خرید وفروخت جائز ہے؟

جواب: مختلف افراد، کمپنیاں اور ادارے نئی الیکٹرانک اشیاء کی اقساط پر فروخت کا کاروبار کرتے ہیں، فریقین میں قیمت، جو ظاہر ہے رائج الوقت مارکیٹ ویلیو سے زیادہ ہوتی ہے، طے ہو جاتی ہے اور یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ ماہانہ اقساط کی رقم کیا ہوگی اور ادائیگی کتنی مدت میں ہوگی اور ''مسلم فیہ یا مبیع (SOLD ITEM) خریدار کے حوالے کرکے اس کی ملک میں دے دیا جاتا ہے، تو یہ عقد شرعاً صحیح ہے، بشرطیکہ اس میں یہ شرط شامل نہ ہو کہ اگر خدانخواستہ مقررہ مدت میں اقساط کی ادائیگی میں تاخیر ہوگئی تو ادائیگی کی اضافی مدت کے عوض قیمت میں کسی خاص شرح سے کوئی اضافہ ہوگا۔اور اگر تاخیری مدت کی عوض قیمت میں اضافہ کر دیا تو یہ سود ہے اور حرام ہے۔ فی نفسہ حدودِ شرع کے اندر اقساط کی بیع جائز ہے۔

تیس سال پہلے کی ایڈوانس رقم اب کتنی وصول کرے

سوال: آج سے تیس سال پہلے کسی نے دکان کرائے پر لی، مالکِ دکان نے ایڈوانس کے طور پر ۲۰ ہزار روپے لئے، جن کی اس وقت بہت زیادہ قیمت تھی۔اب مالکِ دکان، کرایہ داروں کو دکان سے نکلنے کے لئے کہہ رہا ہے۔تو کیا وہ ۲۰ ہزار روپے ہی واپس کرے گا، اس طرح تو کرایہ داروں کا بہت نقصان ہوگا۔تیس سال پہلے ۲۰ ہزار روپے میں چار پانچ کمرے بن جاتے تھے، آج تو ایک بھی نہیں بن سکتا؟ (م۔الف۔ع، کراچی)۔

جواب: مالک دکان سوال میں مذکور صورت میں کرائے داروں کو ۲۰ ہزار روپے ہی دینے کا پابند ہے، یعنی ان کے ایڈوانس کی اصل رقم، روپے کی قدر بلاشبہ بہت کم ہو چکی ہے، جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے لیکن کرایہ داروں کو اصل رقم ہی ملے گی، کوئی بھی اضافہ سود شمار ہوگا۔اس طرح کے مالی نقصانات سے تحفظ کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی مستحکم کرنسی مثلاً یو ایس ڈالر یا اسٹرلنگ پاؤنڈ پر معاہدہ کیا کریں، آج کل تو غیر ملکی کرنسی کا لین دین قانوناً بھی جائز ہے۔

ایڈوانس دے کر مال نہ اٹھانا

سوال: اگر کسی سے ایڈوانس رقم لے کر کوئی چیز تیار کی جائے مثلاً (کپڑا تیار کیا جائے) بعد میں وہ مال اٹھانے سے انکار کردے اور یہ کہے کہ یہ مال میں نہیں اٹھاؤں گا۔کیا اس صورت میں ایڈوانس واپس دینا ہوگا یا نہیں۔اگر ایڈوانس واپس دیں تو مال تیار کرنے والے کو نقصان ہوگا۔جبکہ آج کے دور کے مطابق ایڈوانس واپس نہیں دیا جاتا۔شریعتِ مطہرہ کے مطابق اس کا حکم کیا ہوگا۔

(محمد ادریس قادری۔کراچی)

جواب: ایڈوانس دے کر بک کیا ہوا مال نہ لینے کی صورت میں ان کے ایڈوانس کی رقم بلا معاوضہ روک لینا جائز نہیں ہے۔البتہ انہیں شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً اپنا کیا ہوا وعدہ وفا کرنا چاہئے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (الاسراء: ۳۴)

''اور عہد پورا کرو بے شک عہد کے بارے میں (قیامت میں) پرسش ہوگی''۔

میری رائے یہ ہے جن صاحب نے ایڈوانس رقم دے کر مال بک کرایا بائع نے رقم خرچ کرکے وہ مال تیار کرایا اور اب سودا منسوخ کرنے کی صورت میں بلاشبہ بائع کا نقصان ہوگا۔ خریدار کو تبرعاً بائع کے نقصان کی تلافی کرنی چاہئے۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔

''لاضرر ولا ضرار'' ''یعنی نہ تو کوئی مسلمان یک طرفہ طور پر دوسرے کو نقصان پہنچائے اور نہ ہی دو مسلمان ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں (یہ سمجھ کر یہ ادلے کا بدلہ تو جائز ہے)''۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۳۴۰)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من ضار اضر اللہ بہ ومن شاق شق اللہ علیہ ''یعنی جس نے دوسرے کو نقصان پہنچایا، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے نقصان کی سزا دے گا اور جس نے دوسرے کو مشقت میں ڈالا، اس کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ اس کو مشقت میں ڈالے گا''۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۳۴۲)

اس تلافی کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ اس شعبہ کے کسی دیانت دار ماہر کو حکم (ثالث) مقرر کرلیں وہ مارکیٹ کے حساب سے نقصان کا تعین کرے اور وہ خریدار جس نے سودا منسوخ

کر کے دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے، فضل و احسان اور تبرع کر کے رضا کارانہ طور پر ایڈوانس کی کل رقم میں سے نقصان کے مساوی رقم بائع کو دے دے، اس کا رویہ اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کے عین مطابق ہوگا۔

کیا ''نیوتا'' یا ''عذر'' پر سود کا اطلاق ہوسکتا ہے؟

سوال: ہمارے علاقے میں، بلکہ تقریباً پورے ملک میں، لوگ شادی یا فوتیدگی کے موقع پر صاحبِ معاملہ سے نقد رقم کی صورت میں تعاون کرتے ہیں، اسے بالترتیب ''نندرہ (نیوتا)'' یا ''عذر'' کہتے ہیں، یہ ایک وقتی تعاون کی صورت ہوتی ہے جو صاحبِ معاملہ کے لئے وقتی طور پر معاملہ نمٹانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے، اس میں کسی سود یا کمی بیشی کا کوئی تصور لین دین والوں کے ذہن میں نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسا کوئی تذکرہ یا روایت ہے۔ حال ہی میں ہمارے علاقے کی جامع مسجد عثمانیہ کے خطیب محمد یوسف صاحب نے اسے سود قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سودی لین دین ماں کے ساتھ زنا کے برابر ہے اور مطلقاً حرام ہے، لہٰذا یہ رسم بند کی جائے، از راہِ کرم شرعی حکم بیان کیجئے۔

(محمد شمیم ہاشمی قریشی، تحصیل دادھاراڈھوک گلی۔ ڈاکخانہ چٹہ موڑ۔ تحصیل مری، ضلع راولپنڈی)

جواب: بادیٔ النظر میں تو خوشی یا غمی کے مواقع پر نندرہ (نیوتا) یا عذر کے طور پر برادری کے لوگ اور دوست احباب جو تعاون کرتے ہیں، یہ بطور تبرع اور ہدیے کے ہوتا ہے، قرض کا تو قرض خواہ مطالبہ بھی کرسکتا ہے، جبکہ ہمارے مشاہدے میں نہیں آیا کہ کسی نے کسی سے اس حوالے سے مطالبہ کیا ہو یا نہ دینے پر اسے ملامت کیا ہو۔

ایک دوسرے کو ہدایا دینے کی رسول اللہ ﷺ نے ترغیب دی ہے اور فرمایا:

تهادوا فان الهدية تذهب الضغائن۔

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو کیونکہ ہدایا کے لین دین سے (دلوں کا) کینہ و بغض دور ہوتا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

تهادوا تحابوا۔

''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تا کہ باہم محبت پیدا ہو''۔ (رواہ البخاری فی الادب المفرد، والنسائی فی الکنی والبیہقی فی شعب الایمان)

لہٰذا نیوتا (نندرہ) یا عذر کے لین دین میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض کسی برادری کے رسم و رواج میں یہ قرض شمار ہوتا ہو تو زیادتی مشروط (Conditional) یا معہود (Understood) کے بغیر قرض کے لین دین میں شرعاً کوئی خرابی نہیں ہے۔ اور اگر قرض میں زیادتی نہ تو مشروط ہو، کہ پہلے سے ایک معین اضافے کی شرط لگادی ہو، اور نہ ہی معہود ہو، کہ تحریراً یا زبانی طور پر کسی معین اضافی رقم کا کوئی تذکرہ یا تصور قرض دینے یا لینے والے کے ذہن میں یا برادری کے تعامل رسم و رواج میں نہیں ہے، لیکن کوئی شخص تبرعاً اور فضل و احسان کے طور پر رضا کارانہ طور پر قرض خواہ کو قرض کی واپسی کے وقت کچھ زائد رقم دے دیتا ہے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔ سنن ابوداؤد حدیث نمبر: ۳۳۴۷ میں ہے: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میرا نبی کریم ﷺ پر کچھ قرض تھا، تو آپ ﷺ نے وہ ادا فرمایا اور کچھ زیادہ بھی عنایت فرمایا۔''

''قرضِ حَسَن'' کی تعریف

سوال: ''قرضِ حَسَن'' کسی حاجت مند کو دینا اور ''قرضِ حسن'' اللہ تبارک وتعالیٰ کو دینا، اس کی Definition کیا ہے؟ کیا حاجت مند کو دینے کے بعد واپس لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(عبداللہ۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں:

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (المائدہ: ۱۲)

''اور اللہ نے فرمایا: بیشک میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی نصرت و تعظیم کرتے رہے اور اللہ کو ''قرضِ حسن'' دیا تو میں ضرور تم سے تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا اور میں ضرور تمہیں

ایسے باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں"۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَ لَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (الحدید:۱۸)

"بلاشبہ صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو "قرضِ حَسَن" دیا، ان کے لئے ان کی نیکیوں کو دگنا کیا جائے گا اور ان کے لئے عزت کا اجر ہے"۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِیْمٌ (التغابن:۱۷)

"اگر تم اللہ کو "قرضِ حَسَن" دو، تو وہ اسے تمہارے لئے دگنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ نہایت قدردان، بہت علم والا ہے"۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ

"کون ہے وہ شخص جو اللہ کو قرضِ حَسَن دے تو اللہ اسے بڑھا کر اس کے لئے کئی گنا کر دے"۔(البقرہ:۲۴۵)

وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ (المزمل:۲۰)

"اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو "قرضِ حَسَن" دو"۔

اللہ تعالیٰ کو "قرضِ حَسَن" دینے سے کیا مراد ہے؟ آیئے چند جلیل القدر ائمہ تفسیر کی تشریحات ملاحظہ فرمایئے:

(۱) اللہ کو قرضِ حَسَن دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے نیک کاموں میں اخلاص اور خوشدلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنا، (تفسیر بیضاوی ص ۱۴۷)

امام المفسرین امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: "قرضِ حسن" سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لئے اس کی اطاعت کے کاموں میں مال خرچ کرو، وہ دگنا اجر عطا فرمائے گا، کیونکہ وہ بڑا قدردان ہے، اپنی ذات سے قربت حاصل کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے، وہ بڑے حلم والا (بردبار) ہے، سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا، وہ بخشنے والا ہے، تمہیں بخش دے گا، بعض اہلِ علم کے نزدیک "قرضِ حسن" اللہ کی راہ میں حلال اور طیب مال خرچ کرنا ہے،

اور بعض کے نزدیک اس سے مراد خوش دلی سے خرچ کرنا ہے، درحقیقت انسان کے پاس مال و جان کی صورت میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے، اسی کا دیا ہوا ہے، وہ جب چاہے سلب فرمالے، اس کے باوجود وہ بندوں سے یہ کہے کہ مجھے قرض دو، تو یہ "انفاق فی سبیل اللہ" پر برانگیختہ کرنے کے لئے ایک اثر انگیز اور لطف وکرم سے معمور پیرایہ بیان ہے، (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۵۵۷)"۔

بندوں کو قرضِ حَسَن دینے سے مراد یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کو محض رضاءِ الٰہی کے لئے، کسی خوف، طمع اور صلے کی تمنا کے بغیر اپنے مال میں سے دے دینا، اور اگر وہ مقروض ادائیگی پر قادر نہ ہو تو اسے معاف کر دینا یا کم از کم مہلت دے دینا۔

چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث ہے: "حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں کا واقعہ ہے کہ فرشتوں نے ایک شخص کی روح سے ملاقات کی اور پوچھا: "کیا تم نے کوئی نیک کام کیا ہے؟"، اس نے کہا: نہیں، فرشتوں نے کہا: یاد کرو، اس نے کہا: میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور اپنے نوکروں سے کہتا تھا کہ مفلس کو مہلت دینا اور مالدار سے درگزر کرنا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: "اس سے درگزر کرو۔"

دوسری حدیث میں ہے: حضرت حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک بندہ لایا گیا، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: تم نے دنیا میں کیا عمل کیا؟ راوی بیان کرتے ہیں حالانکہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتے، اس شخص نے کہا: اے میرے رب تو نے مجھے مال عطا فرمایا تھا اور میری عادت درگزر کرنے کی تھی، میں مالدار پر آسانی کرتا اور تنگ دست کو مہلت دیتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "میں تمہاری بہ نسبت اس بات کا زیادہ حقدار ہوں کہ درگزر کروں (یعنی معاف کردوں)، (سوائے فرشتو!) میرے اس بندے کو معاف کردو"۔

ان احادیث مبارکہ کی روشنی میں مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کے قرض کو معاف کر دینا مستحب ہے، خواہ پورا قرض معاف کیا جائے یا اس کا کچھ حصہ معاف کیا جائے، ان احادیث کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے، ہوسکتا ہے اسی کی وجہ سے نجات ہو جائے، اسی طرح کسی گناہ اور برے کام کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہئے، کیا پتہ اسی پر گرفت ہو جائے۔

تنگ دست مقروض کو مہلت دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سیرت

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو اور (قرض معاف کر کے) تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے''۔(البقرہ:۲۸۰)

اس سلسلے میں ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ فرمائیے: امام احمد رضا خان قادری سے ایک صاحب نے دریافت کیا: ''حضور میرے کچھ روپے ایک صاحب پر ہیں، وہ نہیں دیتے''، انہوں نے جواباً فرمایا: اس زمانہ میں قرض دینا اور یہ خیال کرنا کہ وصول ہو جائے گا، ایک مشکل خیال ہے، میرے پندرہ سو روپے لوگوں پر قرض ہیں، جب قرض دیا، یہ خیال کر لیا کہ دے دیا تو خیر، ورنہ طلب نہ کروں گا، جن صاحبوں نے قرض لیا، دینے کا نام نہ لیا، پھر خود ہی فرمایا: جب یوں قرض دیتا ہوں تو ہبہ کیوں نہیں کر دیتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا: جب کسی کا دوسرے پر قرض ہو اور اس کی میعاد گزر جائے، تو ہر روز اسی قدر روپیہ کی خیرات کا ثواب ملتا ہے، جتنا قرض ہے، اس ثوابِ عظیم کے لئے میں نے قرض دیئے، ہبہ نہ کئے کہ پندرہ سو روپے روز میں کہاں سے خیرات کرتا؟----

☆☆☆......☆......☆☆☆

حضور ﷺ کو بکریاں چرانے والا کہنا

سوال: گذارش ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں "بکریاں چرانے والا" کلمات پر مشتمل جو اشعار ہیں، ان کو محافل میں پڑھنا کیسا ہے، جیسا کہ اس شعر میں ہے:

اے حلیمہ بھید یہ کھلا نہیں — یہ مقام چون وچراں نہیں
تو خدا سے پوچھ وہ کون تھے — تیری بکریاں جو چرا گئے

ازراہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں، (نواب الدین، فیڈرل بی ایریا کراچی)۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بہت سے کاموں اور پیشوں کو، جنہیں عام طور پر لوگ کمتر سمجھتے ہیں، عزت بخشنے کے لئے اور محنت کو مرتبۂ کمال عطا کرنے کے لئے یہ کام کئے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مابعث اللّٰہ نبیاً الا رعی الغَنَمَ، فقال الصحابۃ: وانتَ؟ فقال: نعم، کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جو بھی نبی مبعوث فرمایا ہے، اس نے بکریاں چرائی ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: (یا رسول اللہ ﷺ!) اور آپ نے بھی؟، آپ ﷺ نے فرمایا: میں اجرت پر (قراریط کے عوض) مکہ والوں کی بکریاں چراتا تھا، (صحیح بخاری رقم الحدیث: 2262)"۔

عن عمرۃ قالت: قیل لعائشۃ: ما ذا کان یعمل رسول اللّٰہ ﷺ فی بیتہ؟ قالت: کان بشراً من البشر، یغلی ثوبہ ویحلب شاتہ ویخدم نفسہ

"حضرت عمرہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں کیا کام کیا کرتے تھے؟، حضرت عائشہ نے فرمایا: وہ ایک بشر تھے، آپ اپنے کپڑوں کو صاف کرتے تھے، اپنی بکریاں کا دودھ دوہتے تھے اور اپنے ذاتی کام خود انجام دیتے تھے"۔
(شمائل ترمذی، رقم الحدیث: 343)

عن عائشۃ قالت کان رسو ل اللّٰہ ﷺ یخصف نعلہ وتخیط ثوبۂ ویعمل فی بیتہ

کما یعمل احدکم فی بیتہ

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے جوتے خود مرمت فرماتے تھے، اور اپنے کپڑے سیتے تھے اور جس طرح تم لوگ اپنے گھر میں کام کرتے ہو، آپ ﷺ بھی کرتے تھے، (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)"۔

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بکریاں چرائیں، جوتے سیئے، کپڑے سیئے، گھریلو کام کاج میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹایا اور اسی طرح ان پیشوں کو اپنی نسبت سے عزت وعظمت عطا کی۔ لیکن اگر کوئی ان کاموں کی نسبت سے یہ کہے کہ آپ چرواہے تھے، موچی تھے، درزی تھے، وغیرہ تو امر واقع ہونے کے باجود اسے گستاخی اور بے ادبی تصور کیا جائے گا، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اللہ تعالیٰ کو خالق خنزیر و خالق شیطان کہے، حالانکہ وہ ان دونوں کا خالق ہے، مگر اسے مقام الوہیت کی توہین پر محمول کیا جائے گا، عظمت الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے خالق ارض وسماء، خالق کون ومکاں، رب العٰلمین، رب محمد ﷺ اور رب کعبہ کہہ کر پکارا جائے۔

جہاں تک مندرجہ بالا شعر کا تعلق ہے، تو یہ عین حدیث کے مطابق ہے اور اس میں مقام رسالت کی توہین کا کوئی پہلو نہیں، بس امر واقعہ کا بیان ہے، کیونکہ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے بچپن یا لڑکپن کی عمر میں بکریاں چرائی ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کے نبی یا فرشتہ ہونے کی بحث

سوال: آپ نے "ایکسپریس" کے تفہیم المسائل میں حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کا قول کیا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو امرِ باری تعالیٰ کی تعمیل میں ذبح کرنے کے لئے نہ صرف آمادہ ہوجانا، بلکہ باپ بیٹے (جو دونوں نبی اور رسول تھے) دونوں کا ارشادِ باری تعالیٰ کی تعمیل میں اس مرحلے تک چلے جانا کہ صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رگِ جان کا کٹنا اور ذبح ہونا ہی باقی رہ گیا تھا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (الصافات:۱۰۳)

"تو جب وہ دونوں (اللہ کے حکم کے سامنے) جھک گئے اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹادیا"۔

اس سے آپ نے یہ استدلال کیا تھا کہ نبی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکوینی امر انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا محض اس بناء پر کہ حضرت خضر علیہ السلام نے تکوینی امر کے تحت قصاصِ شرعی کے بغیر ایک لڑکے کو ارتکاب جرم سے پہلے ہی قتل کر ڈالا تھا، ان کو جماعتِ انبیاء سے خارج کرنے کے لئے کافی وشافی دلیل نہیں ہے۔ اس استدلال پر میرا اشکال یہ ہے کہ نبی کے ہاتھوں غیر تشریعی تکوینی امر کی تکمیل نہیں کرائی جاتی، بلکہ اس سے پہلے انہیں روک دیا جاتا ہے۔ جبکہ فرشتے کے ہاتھوں تکوینی امر کی تکمیل کرادی جاتی ہے، جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا لڑکے کو قتل کردینا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ذبح اسماعیل سے روک دینا۔ اس اشکال کا جواب دیجئے۔

(عبداللہ المسلم۔ محمد زبیر سلیمان بن ہارون مغل۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی)

نوٹ:- یہ سوال آٹھ صفحات پر مشتمل ہے، تحریر کے بعض حصے سوال سے غیر متعلق ہیں اور بعض حصے سوال سے متعلق ہیں، میں نے سوال سے متعلق حصے کا خلاصہ مندرجہ بالا سطور میں تحریر کیا ہے، پورے خط کے نقل کرنے کی اس کالم میں گنجائش نہیں ہے۔

جواب: قارئین کرام کی سہولت اور فہم مسئلہ کے لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ دو اصطلاحات کی تشریح کردوں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر عاقل و بالغ شخص کے لئے اپنے انبیاء کرام ورسل عظام کے ذریعے جو احکام نازل فرمائے ہیں، اور جن پر عمل کرنے یا نہ کرنے سے دنیوی واخروی اعتبار سے جزا وسزا کے احکام مرتب ہوتے ہیں، انہیں تشریعی احکام کہا جاتا ہے، یہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور فرد اور معاشرے سے متعلق ہیں، یہ احکام بندے اور رب تعالیٰ کے باہمی تعلق (یعنی عبد اور معبود) کے حوالے سے بھی ہیں اور بندوں کے مابین تعلق کے حوالے سے بھی ہیں، ان کی تنفیذ کے لئے دنیا میں بھی نظام عدل اور نظامِ جزا وسزا قائم ہوتا ہے اور آخرت میں بھی ہوگا۔ ان پر عمل کرنے کا ہر عاقل و بالغ مکلف ہے، ذمہ دار ہے، جوابدہ ہے، اس لحاظ سے وہ مجبور ہے، لیکن اس کے اختیار کو ساقط کرکے بالجبر تعمیل پر مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ اپنی صوابدید اور اختیارِ تمیزی سے چونکہ وہ ان احکام پر عمل کرتا ہے یا اپنے اختیار اور آزادیٔ عمل سے انہیں رد کرتا ہے، اس لئے اس اعتبار سے وہ مختار ہے، اور چونکہ احکامِ الٰہی کے لئے اس کا رد کرنا یا قبول کرنا، عمل کرنا یا عمل نہ کرنا، فرمانبرداری کرنا یا نافرمان ہونا، اس کی آزادانہ مرضی اور اختیار سے ہوتا ہے، اس لئے جزا وسزا کا دنیوی واخروی نظام تقاضائے عدل کے عین مطابق ہے اور ہر

عقل سلیم اسے قبول کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے اور ممالک جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کر کے اپنے لئے خود ساختہ آئینی و قانونی نظام بنا رکھے ہیں، دنیا میں ان کے ہاں بھی جزا و سزا کا نظام موجود ہے۔

''تکوینی امور'' یا ''تکوینی نظام'' سے مراد انسان کی ذات اور کائنات سے متعلق وہ امور ہیں، جو انسان کے اختیار اور مرضی سے ماوراء، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت سے وجود میں آتے ہیں، اور یہ انفس و آفاق میں جاری و ساری ہیں۔ مثلاً بارش کا برسنا یا نہ برسنا، آندھی، طوفان اور سیلابوں کا آنا، بیماری یا تندرستی، خوبصورتی و بدصورتی، کامل الخلقت اور ناقص الخلقت ہونا، مارنا یا جلانا یعنی موت و زندگی کے فیصلے وغیرہ، میرے عرض کرنے کا مدعا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکوینی امر نبی کے ہاتھ سے بھی صادر ہوسکتا ہے یا نبی کو بھی اس کا حکم دیا جاسکتا ہے، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم دینا اور باپ بیٹا (یعنی حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جو دونوں نبی تھے) کا اس کی تعمیل کے لئے برضاء و رغبت تیار ہونا، کیونکہ یہ ایک تکوینی امر تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو معاذ اللہ! کسی قصاص میں یا تشریعی ضابطے کے تحت ذبح کرنے کے لئے نہیں کہا گیا تھا، کیونکہ باپ بیٹا دونوں نبی تھے اور معصوم تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہ سوال نہیں کیا کہ کیوں کر یا کس جرم کی پاداش میں ذبح کا حکم دیا جارہا ہے؟ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دونوں انبیاء کرام جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا تکوینی امر ہے اور ان پر اس کی تعمیل تسلیم و رضا کے ساتھ واجب ہے، باقی رہا ذبح سے پہلے روک دینا اور اچانک فدیہ کے طور پر مینڈھے کا نمودار ہونا، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رضا کا مسئلہ ہے۔ ایک تکوینی امر کی تعمیل کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت اسماعیل علیہ السلام کا آمادہ ہونا اور حضرت خضر علیہ السلام کا ایک تکوینی امر کے تحت بظاہر بے قصور لڑکے کو قتل کر دینا یکساں امر ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے نبی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

قرآن ہی سے میرا دوسرا استدلال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے بشری شکل میں آتے ہیں اور وہ ان کے لئے مہمان نوازی کی خاطر بچھڑے کا گوشت بھون کر لاتے ہیں اور اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں، مگر چونکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے فرشتے تھے، اس لئے انہوں نے کھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھائے، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک

خلافِ فطرت غیر معمولی بات سمجھا اور فطری طور پر ان کی دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ ایسا کیوں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ (ہود: ۶۹۔۷۰)

''اور بیشک ہمارے فرشتے (بشری صورت میں) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے کہا: (اے ابراہیم آپ پر) سلام ہو، ابراہیم نے فرمایا: تم پر بھی سلام ہو، تو انہوں نے کچھ دیر نہ کی کہ وہ بھنا ہوا بچھڑا لے آئے، پھر جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے تک نہیں بڑھتے تو ابراہیم نے ان کو اجنبی سمجھا اور اپنے دل میں ان سے کچھ خوف محسوس کیا، وہ بولے آپ ڈریں نہیں، بیشک ہم لوط کے (منکر) لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں''۔

ان آیات میں ہے کہ فرشتے بشری شکل میں آئے لیکن انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، یعنی انسانی خوراک کھانا، نوعِ ملائک میں نہیں ہے۔ جبکہ اس کے برعکس سورۃ الکہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقتِ سفر کا تذکرہ متعدد آیات میں ہے، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ''علم لدنی'' یا ''علم اسرارِ الٰہی'' سیکھنے کے لئے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ چلتے ہیں، اس سفر کے دوران ایک مرحلہ آتا ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ۨاسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ (الکہف: ۷۷)

''پھر وہ دونوں (آگے) چلے، یہاں تک کہ جب وہ دونوں ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو (حقِ ضیافت میں) ان سے کھانا طلب فرمایا، تو انہوں نے ان کی مہمان نوازی سے (صاف) انکار کر دیا، پھر (وہاں سے چلتے وقت) اس بستی میں انہوں نے ایک دیوار پائی جو گرنے والی تھی تو (ہمارے اس بندے نے) اسے سیدھا کر دیا، موسیٰ نے

فرمایا: اگر آپ چاہتے تو اس پر (ان سے کچھ) مزدوری لے لیتے''۔

اب آپ اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے، اس میں تثنیہ کے صیغے کے ساتھ دو مقامات پر فرمایا کہ: (۱) ان دونوں نے کھانا طلب کیا اِسْتَطْعَمَآ (۲) تو انہوں نے ان دونوں کی مہمان نوازی سے (صاف) انکار کر دیا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا۔

قرآن کے صریح الفاظ میں حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام دونوں کے کھانا طلب کرنے کا ذکر ہے اور یہ بھی ہے کہ بستی والوں نے ان دونوں کی مہمان نوازی سے انکار کیا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ 'سورۂ ھود' میں بشری شکل میں آئے فرشتوں کا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانا، اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ فرشتے کھانا نہیں کھاتے اور 'سورۃ الکہف' میں حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مل کر کھانا طلب کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام فرشتہ نہیں تھے، بلکہ بشر تھے اور نبی تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی کے ہاتھ سے بھی تکوینی امر کا صدور ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے مذکور ہوا۔ ان دونوں رسل عظام کی طرف سے ارادۂ تعمیل بھی اللہ کے حکم سے تھا اور تکمیل (یعنی عین ذبح) سے پہلے رک جانا یہ بھی اللہ کے حکم سے تھا۔

میرے موقف (یعنی حضرت خضر علیہ السلام کے بشر اور نبی ہونے) کے حق میں جو دلائل تھے، وہ میں نے ذکر کر دیئے ہیں، اگر کسی کے ذہن کو اپیل کریں تو الحمدللہ۔ اگر کوئی اپنے دلائل کی بناء پر اس موقف سے اختلاف کرے تو یہ اس کا حق ہے، کیونکہ قرآن و حدیث میں حضرت خضر علیہ السلام کے فرشتہ، نبی یا ولی ہونے کے بارے میں کوئی صریح، واضح اور قطعی نص نہیں ہے، لہٰذا اشارۃ النص، دلالت النص اور اقتضاء النص سے اجتہاد کر کے کوئی رائے قائم کرنی پڑے گی۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے، اس لئے اس کے بارے میں علماء امت میں اختلاف رائے ہے اور رہا ہے ایسے اجتہادی مسائل میں دلائل کی بنیاد پر اختلاف رائے ممکن ہے اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ عنداللہ تمام آراء جو باہم مختلف ہوں، سب کی سب درست نہیں ہو سکتیں، بلکہ حق و صواب ان میں صرف ایک ہی ہوگی۔ دعا ہے اللہ جل شانہٗ ہمیں حق و صواب کو پانے اور اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امامِ اعظم کی کُنیت ''ابوحنیفہ'' کی حکمت

سوال: شخصیت کی پہچان والد کے اسم گرامی سے ہوتی ہے، لیکن امام اعظم کی شخصیت اپنی دختر بی بی حنیفہ کے نام سے کیوں مشہور ہوئی، یہ سوال کسی غیر مقلد نے کیا ہے۔

(محسن شیرازی، کراچی)

جواب: ''کنیت'' کا مطلب ہے کسی کا باپ یا بیٹا ہونے کی نسبت سے نام رکھنا، کبھی یہ نام حقیقی باپ یا بیٹے کی نسبت سے رکھا جاتا ہے جیسے ابن خطاب یا ابن عمرو وغیرہ۔ اور کبھی ابوت (باپ ہونے) کی نسبت کسی چیز کے ساتھ قائم کر کے کنیت رکھ دی جاتی ہے اس سے باپ ہونا مراد نہیں ہوتا بلکہ بالعموم یا کسی خاص موقع پر اس چیز کے ساتھ تعلق کی جانب اشارہ مقصود ہوتا ہے، جیسے حضرت ابو ہریرہ (جن کا اصل نام عبداللہ یا عبدالرحمٰن تھا، لیکن وہ کنیت کے نام سے زیادہ مشہور ہوئے) ابو ہریرہ کے معنی ہیں ''بلی کا باپ'' اس کنیت کے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بلی پالتے تھے اور بلی سے پیار کرتے تھے۔ ایک خاص موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر والوں سے ناراض ہو کر مسجد میں جا کر کچے فرش پر لیٹ گئے اور پسینے کی وجہ سے ان کے بدن کے ساتھ مٹی چپک گئی تو حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ''قُمْ يَا اَبَا تُرَاب'' (اے مٹی کے باپ کھڑے ہو جاؤ)، چونکہ رسول اللہ ﷺ نے پیار سے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تھا، اس لیے ان کی یہ کنیت مشہور ہو گئی، ورنہ ان کی اصل کنیت ابوالحسن تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق کا بھی بکر نام کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اہل عرب ماہر و بہادر جنگجو کو 'ابن الحرب' یا ''اخو الحروب'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ کبھی نیک فال کے طور پر اوصاف جمیلہ کی نسبت سے کنیت رکھ دی جاتی ہے، جیسے ابوالخیر، ابوالمکارم، ابوالمعالی، ابوالبرکات، ابوالحسنات، ابوالنور وغیرہ، حضور کے چچا عبدالعزیٰ کی کنیت اس لیے ابولہب (شعلے کا باپ) مشہور ہوئی کیونکہ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ اسی طرح امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی کسی بیٹی کا نام حنیفہ نہیں تھا، بلکہ ''حنیف'' کے معنی ہیں تمام باطل ادیان کو چھوڑ کر دین حق اسلام کی طرف رجوع کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران: ٦٧)

”ابراہیم نہ یہودی تھے نہ ہی نصرانی بلکہ وہ ہر باطل سے جدا رہ کر حق کی طرف مائل ہونے والے (حنیف) مسلمان تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے“۔

اس معنی کی مناسبت سے امام اعظم کی کنیت ”ابوحنیفہ“ مشہور ہوئی۔

☆☆☆......☆•••☆......☆☆☆

حلال و حرام

جائز و ناجائز

غیر صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کہنا یا لکھنا؟

سوال: صحابہ کرام کے علاوہ کسی ولی یا بزرگ، تابعی، ائمہ دین کے اسماء گرامی کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" لکھنا آیا شرعاً جائز ہے یا یہ لقب صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے۔

(محمد جیلانی، نارتھ کراچی)

جواب: عرفِ عام میں چونکہ صحابہ کرام کے اسماء گرامی کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" بولا اور لکھا جاتا ہے بلکہ تقریباً اس کا التزام کیا جاتا ہے، اس لئے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صحابہ کرام کا لقب خاص ہے، لیکن یہ نظریہ درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں اس کا اطلاق مومنین صالحین کے لئے عام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ (المائدہ:۱۱۹)

"(روز قیامت) اللہ فرمائے گا: یہ ہے وہ دن جس میں سچوں کو ان کا سچ نفع دے گا، ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ابد تک رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے"۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ (التوبہ:۱۰۰)

"اور مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے (یعنی) سب سے پہلے ایمان لانے والے اور جنہوں نے نیک کاموں میں ان کی پیروی کی، اللہ ان (سب) سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لئے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ابد تک ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے"۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا
عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''(اے حبیب!) جو لوگ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو (ایسا ہرگز) نہ پائیں گے کہ وہ ان لوگوں سے محبت کریں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے عداوت رکھی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی (بہن) یا قریبی رشتہ دار، یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں (اللہ نے) ایمان ثبت فرما دیا اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی اور وہ انہیں (ایسے) باغات میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے، یہ لوگ اللہ کی (خاص) جماعت ہیں۔ (لوگو!) خبردار ہو جاؤ (خاصان) باری تعالیٰ کی جماعت ہی فلاح پانے والے لوگ ہیں''۔ (الحشر:۲۲)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ
جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا
عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝ (البینۃ:۷۔۸)

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وہی ساری مخلوق میں بہتر ہیں، ان کی جزا ان کے رب کے پاس ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ (اللہ کی طرف سے) یہ (اعزاز و انعام) ہر اس (شخص) کے لئے ہے جو اپنے رب سے خائف رہا''۔

''رضی اللہ عنہ'' کے معنی ہیں، اللہ ان سے راضی ہوا اور ''رضوا عنہ'' کے معنی ہیں، وہ اللہ سے راضی ہوئے، یعنی اللہ تعالیٰ سے معاملہ طے ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضامندی کی سند پیشگی طور پر ہی عطا فرما دی اور وہ بھی دل و جان سے ہر حال میں، خواہ عسر ہو یا یسر، اپنے اللہ سے

راضی ہو چکے، اس کی تقدیر پر راضی ہیں۔ اور قرآن مجید کی چار آیات مبارکہ کے حوالہ جات مع ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرما لئے کہ ''رضی اللہ عنہ'' کا اطلاق ان مقامات پر (یعنی آیات ۱: ۳: ۴) جملہ مومنین صالحین پر کیا گیا ہے اور ان میں سے صحابہ کرام کی تخصیص کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں ہے۔ البتہ بلاشبہ یہ امر مسلّم ہے کہ جملہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کا اولین مصداق ہیں اور آیت ۲ میں صحابہ کرام مہاجرین وانصار بلکہ ان میں سے بھی سبقت و اوّلیت کا شرف حاصل کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا جنہوں نے (بعد میں) ان کی ''اتباع بالاحسان'' کی ہے اور پھر مجموعی طور پر سب کو ''رضی اللہ عنہم'' کے اعزاز سے نوازا۔

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ چلئے مان لیا کہ قرآن مجید میں اس لقب کا اطلاق مومنین صالحین پر عام ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے کوئی دلیلِ تخصیص نہیں ہے لیکن کیا سلفِ صالحین سے غیر صحابی پر اس کا اطلاق ثابت ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ صحیح بخاری کے بعد حدیث کی مسلّمہ طور پر صحیح ترین کتاب صحیح مسلم کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے:

''قال ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری رضی اللہ عنہ'' یعنی ''ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری رضی اللہ عنہ نے کہا'' اور امام مسلم بن حجاج قشیری کا سالِ ولادت ۲۰۶ھ ہے اور تاریخ وصال ۲۴ر رجب ۲۶۱ھ ہے اور وہ نہ تو صحابی تھے اور نہ ہی تابعی، زیادہ سے زیادہ ''تبع تابعی'' تھے۔

کیا ''۷۸۶'' لکھنا صحیح ہے

سوال: ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی کے 25 نومبر تا یکم دسمبر 2002ء کے شمارے میں ''آپ کے مسائل کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں'' کے عنوان کے تحت ایک شخص محمد عمر فاروق (جیکب آباد) نے سوال کیا کہ: ''بسم اللہ کے طور پر خطوط وغیرہ پر جو 786 لکھا جاتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی کیجئے کہ کیا یہ صحیح ہے؟''۔

جواب: عام طور پر خطوط، دستاویزات اور تحریروں وغیرہ میں بسم اللہ کے بجائے ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے کہ ان کاغذات کے زمین پر گرنے سے بسم اللہ کے پاکیزہ حروف کی بے ادبی ہوتی ہے، ان کو بے ادبی سے بچانے کے لئے ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے جب کہ اسلامی تعلیم واضح طور پر یہ ہے

کہ ہر کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرنا چاہئے جو کام اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع نہ کیا جائے، اس میں برکت نہیں ہوتی اور وہ پایہ تکمیل تک بھی نہیں پہنچتا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا نام لینا صحیح ہے، فرض کیجئے کسی کے نام کے اعداد کا مجموعہ ۴۲۰ ہو اور کوئی اسے نام کے بجائے مسٹر ۴۲۰ کہہ کر پکارے تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا، اسی طرح بسم اللہ کی بجائے ۷۸۶ کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں ہے پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ بسم اللہ کے اعداد ۷۸۶ نہیں بنتے، قمری حروف کی صورت میں ال لگا کر پڑھا جاتا ہے جب کہ شمسی حروف کے ساتھ ال لکھا تو جاتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا۔ الرحمٰن اور الرحیم میں قمری حروف کی صورت میں بسم اللہ کے اعداد کا مجموعہ ۱۱۸۸ بنتا ہے اور شمسی حروف کی صورت میں اس کا مجموعہ ۷۲۶ بنتا ہے یعنی کسی بھی صورت میں یہ مجموعہ ۷۸۶ نہیں بنتا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ۷۸۶ ہے کیا؟ غالب امکان یہ ہے کہ ۷۸۶ ہندوؤں کے بھگوان ہری کرشنا کے نام کے حروف کا مجموعہ ہے، حروف ابجد کے حساب سے اسی کے یہ اعداد نکلتے ہیں، برصغیر پاک و ہند کے مسلمان سیکڑوں برس تک ہندوؤں کے ساتھ اکٹھے رہے ہیں، وہ ۷۸۶ استعمال کرتے ہوں گے، اس کی تشریح انہوں نے مسلمانوں کے سامنے غلط انداز میں کی ہوگی اور انہوں نے اس کو صحیح سمجھ کر ۷۸۶ کا استعمال شروع کر دیا۔ بسم اللہ کے لئے اس طرح کے اعداد کا استعمال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ناراضی کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اس لئے ان اعداد کے استعمال سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہئے''۔

مذکورہ بالا جواب میں مفتی صاحب نے اسے بالکل غلط اور باطل قرار دیا ہے اور اس کا رشتہ ہندومت سے جوڑ دیا ہے اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے اعداد کا مجموعہ قمری حروف کے حساب سے 1186 بنتا ہے اور شمسی حروف کے حساب سے 726 بنتا ہے، 786 تو کسی صورت میں نہیں بنتا، اس جواب کو پڑھ کر بہت سے لوگ تشویش میں مبتلا ہیں کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بزرگانِ دین اسے اپنی تحریروں، خطوط اور تعویذات میں استعمال کرتے رہے ہیں اور اب بھی یہ روایت جاری ہے، لہٰذا گذارش ہے کہ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اس مسئلے کو حل کیجئے، تاکہ ہم جیسے لوگوں کا اضطراب رفع ہو، (آثار اللہ، لیاقت آباد)۔

جواب: سب سے پہلے تو یہ اطمینان کر لیجئے کہ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کے اعداد کا مجموعہ ابجد کے حساب سے 786 ہی بنتا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

بسم = 102 ...... اللہ = 66 ...... الرحمٰن = 329 ...... الرحیم = 289 ...... میزان = 786

قاعدہ یہ ہے کہ جو حروف مکتوب ہوتے ہیں ان کے اعداد کا حساب لگایا جاتا ہے، خواہ وہ شمسی ہوں یا قمری، تشدید کی صورت میں بھی چونکہ مکتوب ایک ہی حرف ہوتا ہے لہٰذا اس کے اعداد کو جمع کر لیا جاتا ہے، لفظ اللہ اور الرحمٰن پر کھڑی زبر بصورت حرف نہیں ہے بلکہ بصورت حرکت ہے، لہٰذا اس کا عدد بھی حساب میں نہیں آئے گا۔ ہمارے ہاں ایک المیہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی علم یا فن کا ماہر ہو یا نہ ہو، اس میں ٹانگ ضرور اڑاتا ہے، اور نہ صرف ماہرانہ رائے دیتا ہے بلکہ اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتا ہے اور حجت قاطع قرار دیتا ہے اور اس معاملے میں سب سے زیادہ مظلوم اسلام اور شریعت ہے، بقولِ شاعر

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی   اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

ابجد کے اصول کا عربی اصطلاحی نام ''جُمَل'' یا ''جُمَّل'' ہے۔

مفتی صاحب نے دوسری مغالطہ آرائی یا خود ساختہ اجتہاد یہ کیا ہے کہ 786 کے اعداد کو ہندوؤں کے بھگوان ''ہری کرشنا'' کے اعداد کا مجموعہ قرار دے کر اس سے ظاہر کیا ہے کہ یہ ایک مشرکانہ کلمہ ہے۔ اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ ''ہری کرشنا''، سنسکرت کا لفظ ہے، نہ کہ عربی کا، اور ''جمل'' کا حساب عربی کا ہے اور اردو میں بعینہٖ عربی کے حروف مستعمل ہونے کی وجہ سے اسے اردو میں بھی اختیار کر لیا جاتا ہے، کیونکہ اردو کے اصل مآخذ عربی اور فارسی ہیں، سنسکرت میں تو جمل کے حساب کو جاری کرنے والے مفتی حسام اللہ شریفی صاحب پہلے فرد ہیں۔ اعتبار تو اسی رسم الخط کا ہوتا ہے، جس کا وہ کلمہ یا حرف ہے، سنسکرت کی تو ابجد (Alphabetic)، ان کا رسم الخط اور تلفظ بالکل جدا ہے، کسی ماہر سنسکرت سے ''ہری کرشنا'' لکھوا کر دیکھ لیجئے، اس کے بعض حروف کے مشابہ بحساب جمل ابجد کا کوئی بھی حرف نہیں ہے۔ حضرت مفتی محمد شریف الحق امجدی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بقول بہت ہی کھینچ تان کر اعداد کو جوڑ بھی لیا جائے (یعنی سنسکرت کے ہری کرشنا کے اصل حروف) تو زیادہ سے زیادہ 436 بنتے ہیں، لیکن اگر کسی کو خواہ مخواہ مسلمانوں کا ہندومت سے رشتہ جوڑنے یا اس سے متاثر قرار دینے کا شوق ہو تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ

ع   بریں عقل و دانش بباید گریست

اب دیکھئے سنسکرت کے حروف تہجی بھ، پ، ٹ، ٹھ، جھ، چھ، دھا، ڈ، ڈھا، کھا، گ، گھا وغیرہ

عربی میں کہاں ہیں، اور جن ہندی یا سنسکرت کے الفاظ میں یہ حروف تہجی استعمال ہوں گے، ان کے اعداد کا حساب مفتی صاحب موصوف کیسے کریں گے، یا ان کے ''جمل'' کے نئے قواعد وضع کریں گے، کیا مفتی صاحب نا قابل تردید دلائل سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سنسکرت یا ہندومت میں جمل کا حساب رائج تھا۔

ہمارا یہ موقف کہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے لئے 786 کا عدد اہل علم کے ہاں استعمال ہوتا رہا ہے، تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اس وقت میرے سامنے ایک ''علم المیراث'' کا رسالہ ہے، جس کا نام ہے، ''مفید الوارثین تکمیل'' اور یہ نام بھی ''جمل'' کے حساب سے رکھا گیا ہے، یعنی رسالے کا سنِ طباعت بھی 1349ھ ہے اور کتاب کے مذکورہ بالا نام کے اعداد کا مجموعہ بھی 1349 بنتا ہے، یہ رسالہ دارالاشاعت دیوبند، ضلع سہارنپور سے شائع ہوا ہے اور اس کے مصنف دارالعلوم کے ایک بزرگ نامی گرامی مدرس سید اصغر حسین ہیں، وہ کتاب کے صفحہ نمبر 232 پر لکھتے ہیں:

''ایک طویل کاغذ لے کر اس کی پیشانی پر ''ھوالباقی'' یا ''بسم اللہ'' لکھو، یا بسم اللہ کے اعداد 786 لکھو، وغیرہ۔

امام احمد رضا خان قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتابوں کے نام بھی ''جمل'' کے حساب سے اعداد کے مطابق ہیں۔

باقی یہ امر مسلم ہے کہ ہر نیک اور اہم کام کا آغاز ''بسم اللہ'' سے کرنا چاہئے۔ اگر وہ کام کوئی اچھی تحریر، تصنیف یا خط کتابت ہے تو اس کے شروع میں بھی ''بسم اللہ'' لکھنا مسنون، مستحب اور مستحسن امر ہے، اس سے اس کام میں بھی برکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس تحریر میں بھی برکت ہوتی ہے، لیکن کسی تحریر یا خط کتابت کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس وقت لکھا جائے جب یہ ظن غالب یا کم از کم ''مخاطب'' اور ''مکتوب الیہ'' کے بارے میں حسنِ ظن ہو کہ وہ اس کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں گے، اسے قدموں کے نیچے یا کسی ڈسٹ بن اور کوڑے دان میں نہیں پھینکیں گے اور اگر خدانخواستہ بے ادبی کا گمان یا یقین ہو تو پھر خط کتابت یا تحریر کے شروع میں بسم اللہ ہرگز نہ لکھی جائے بلکہ خط کتابت یا تحریر شروع کرنے سے پہلے زبانی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لے اور پھر لکھنا شروع کر دے۔ ہمارے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کفار کی بستی میں جانا ہو اور یقین

یا ظن غالب ہو کہ قرآن مجید لے کر جائیں گے اور وہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے تو پھر ایسی صورت حال میں قرآن مجید ساتھ لے کر نہ جائیں۔

یہ عقیدہ یا نظریہ کسی کا نہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے یا پڑھنے کے بجائے 786 کا عدد لکھا جائے یا پڑھ لیا جائے تو بسم اللہ کا ثواب ملے گا، کیونکہ یہ عقیدہ اختیار کرنے سے سنت بسم اللہ کا ترک لازم آئے گا، جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب 786 بسم اللہ کا متبادل یا اس کے قائم مقام نہیں ہے تو لکھنے کا کیا فائدہ؟ آپ کو معلوم ہے کہ بعض کوڈ ورڈز (Code Words) یا اشاراتی الفاظ یا نشانات ہوتے ہیں، جو مسلح افواج سیکورٹی انجینئر اور بعض سراغ رسانی کے اداروں یا شعبہ جات میں استعمال ہوتے ہیں اور اس شعبہ سے وابستہ افراد کا ذہن ان کے سنتے ہی یا ان پر نظر پڑتے ہی ان معانی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جن کے لئے انہیں وضع کیا گیا ہے۔ تو اگر خط یا تحریر کے شروع میں 786 کا عدد لکھا ہوا اور اس پر نظر پڑتے ہی قاری کا ذہن بسم اللہ کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ فوراً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ لے۔ تو یہ بھی بہت بڑا فائدہ ہے، بے ادبی سے بھی بچ گئے اور سنتِ بسم اللہ کا اجر بھی پالیا۔ یہ تو طے ہے کہ 786 کا لکھنا کسی کے نزدیک بھی واجب یا سنت کے درجے میں نہیں ہے اور اس کے ترک سے کوئی شرعی خرابی لازم نہیں آتی، لیکن اگر اس پر نظر پڑتے ہی بندے کا ذہن متوجہ ہو جائے اور وہ بسم اللہ پڑھ لے تو یہ اس جہت سے ایک مستحسن امر ہوگا۔

یہ مسئلہ کہ اعداد میں کوئی تاثیر ہے یا نہیں؟ میری نظر میں اس کے لئے کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سمیت دیگر متعدد مسلمہ اکابر امت تعویذات میں ان کا استعمال کرتے رہے ہیں اور ہمارا ان سب اکابر امت کے بارے میں حسن ظن ہے کہ یہ کسی خلافِ شرع امر پر مجتمع نہیں ہو سکتے اور حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

لا تجتمع امتی علی الضلالة

''میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی، (الحدیث)''۔

توارث وتواتر کے ساتھ اکابر وصلحاء امت کا عمل یہ بتاتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ عمل مجرب ہے۔

ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ جمل یا ابجد یا حروف کے اعداد کا تصور مسلمانوں میں کب سے

متعارف تھا، تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مسلمان عہدِ رسالت میں بھی اس سے آشنا تھے، چنانچہ علامہ قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی متوفی 685 نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر انوار التنزیل میں الم کی بحث میں یہ حدیث نقل کی ہے:

اوالی مدد اقوام واجالٍ بحساب الجمل کما قاله ابو العالیة متمسکا بما روی انه علیه الصلوٰة والسلام لما اتاه الیهود تلی علیهم الٓمٓ البقرہ، فحسبوه وقالوا کیف ندخل فی دین مدته احدی وسبعون سنة؟ فتبسم رسول الله ﷺ، فقالوا: هل غیره، فقال: الٓمٓصٓ، الٓر، الٓمٓر۔ وغیره، فقالوا: خلطت علینا فلاندری بایها ناخذ

"یا بعض سورتوں کے شروع میں مذکوران حروف مقطعات سے بحساب جمل بعض قوموں کی بقا کی معیاد کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ابوالعالیہ نے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث سے استدلال کیا ہے، کہ جب یہود آپ کے پاس آئے تو آپ نے انہیں" الٓمٓ، البقرہ" پڑھ کر سنائی تو انہوں نے حساب لگایا اور کہا کہ" ہم ایسے دین میں کیسے داخل ہوں، جس کی کل مدت ہی 71 سال ہے"۔ تو رسول اللہ ﷺ یہ سن کر مسکرائے، تو اس پر یہود نے پوچھا:" کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے"؟، پھر آپ نے الٓمٓصٓ، الٓر، الٓمٓر، وغیرہ دیگر ایسی آیات پڑھ کر سنائیں تو انہوں نے کہا: آپ نے معاملہ ہم پر مشتبہ کر دیا، اب ہمیں سمجھ نہیں آرہا کہ ہم ان میں سے کسے بنیاد بنا کر حساب لگائیں"۔

اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ:" رسول اللہ ﷺ کا یہود کے اس استدلال کو رد نہ کرنا (یعنی جمل کا حساب لگانا) اور اسے ثابت وقائم رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک اصولی طور پر حساب لگانا خلافِ شرع نہیں ہے"۔ گویا یہ حدیثِ تقریری ہے۔
ہمیں اصل کتبِ حدیث میں یہ حدیث نہیں ملی، لیکن بیضاوی کے محشی شیخ حبیب الرحمٰن کاندھلوی نے لکھا ہے کہ امام بخاری نے اسے تاریخ البخاری میں روایت کیا ہے۔ اس پر اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جمل کا حساب تو اپنی اصل کے اعتبار سے عربی نہیں ہے، لیکن بعض اوقات غیر عربی کوئی چیز جب اہلِ عرب میں متعارف ومشہور ہوجائے، تو اسے قبول کر کے عربیت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ کئی عربی الفاظ (جیسے مشکوٰۃ، انجیل، قسطاس) کو معرب کر کے عربی میں

داخل کر دیا گیا ہے اور قرآن نے انہیں استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے:

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا (یوسف:2)

"ہم نے اسے (قرآن کو) عربی میں نازل کیا ہے"۔

وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (النحل:103)

"اور یہ واضح عربی زبان ہے"۔

مصنوعی طریقے سے شوہر کا تولیدی جرثومہ (Sperm) اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانے کا جواز

سوال: مؤدبانہ عرض یہ ہے کہ ایک صاحب جن کی شادی کو ساڑھے دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور شادی کے دوسرے ہی سال معلوم ہوگیا تھا کہ ان صاحب میں اسپرم کاؤنٹ کم ہے۔ میاں بیوی دونوں صبر شکر کر کے بیٹھ گئے تھے کہ جو اللہ کی مرضی! کیونکہ ٹیسٹ ٹیوب قطعاً حرام ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ ابھی ایک جگہ معلوم ہوا ہے کہ مرد اگر نارمل طریقے سے اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے مگر اس کے مادۂ تولید میں اتنی طاقت ہے کہ اگر وہ کسی طرح عورت کے رحم میں چلا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو اولاد سے نواز سکتا ہے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر شوہر کا مادۂ تولید عورت کے جسم میں رکھ دیا جائے تو کیا اس طریقے سے اولاد کے لیے کوشش کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(عرفان احمد معرفت قاری محمد صدیق۔ مسجد خلفائے راشدین گلشن اقبال کراچی)

جواب: جہاں تک کسی عورت کے رحم میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی غیر مرد کا مادۂ منویہ یعنی تولیدی جرثومہ (Sperms) انجکشن یا کسی بھی مصنوعی طریقے سے پہنچانے کا تعلق ہے تو یہ از روئے حدیث ممنوع وحرام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

عَنْ رُوَيفع بن ثابت الانصاری قَال: قام فینا رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول یوم حنین قال: لا یحل لامرئٍ یؤمن بالله والیوم الآخر ان یسقی مآءَه زرعَ غیرہ۔

"حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں تمہیں وہ حدیث بیان کر رہا ہوں جو میں نے یوم حنین کو رسول اللہ ﷺ سے سنی تھی، آپ نے فرمایا: جو شخص بھی اللہ تعالیٰ

اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی میں ڈالے۔ (سنن ابی داؤد، جلد ۱، صفحہ ۲۹۳)

البتہ سوال میں جس صورت مسئلہ کا حکم دریافت کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کمزوری یا نقص کے سبب شوہر اپنے مادۂ منویہ کو عملِ تزویج کے ذریعے بیوی کے رحم میں پہنچانے پر قادر نہیں ہے اور بعض اوقات بیوی کے رحم کی ساخت میں کسی نقص اور خرابی کے باعث اس میں شوہر کا مادۂ منویہ پہنچ نہیں پاتا۔ ان دونوں صورتوں میں شرعاً مرد کا مادۂ منویہ (یعنی تولیدی جرثومہ) مصنوعی طریقے سے اس کی اپنی بیوی کے رحم میں پہنچانا جائز ہے، لیکن شرعی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے رحم میں اس کے شوہر کا تولیدی جرثومہ (Sperms) پہنچانے کے لیے لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ عورت کی فرج کو غیر مرد کے سامنے کھولنا حرام ہے اور اس عمل سے اگر تقدیر الٰہی سے بچہ پیدا ہو جائے تو وہ صحیح النسب اور ثابت النسب ہوگا۔ سائنسی اور طبی اعتبار سے تو اس عمل کا امکان اور وقوع بیسویں صدی کے آخر میں ظاہر ہوا ہے۔

علامہ غلام رسول سعیدی نے شرح صحیح مسلم جلد ثالث صفحات 935 تا 948 ٹیسٹ ٹیوب بے بی اور مصنوعی تولید کے عنوان کے تحت اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فقہاء اسلام نے اس کو جائز قرار دیا ہے کہ بغیر مجامعت کے مرد کے پانی کو عورت کی اندام نہانی میں پہنچا دیا جائے، جس سے عورت حاملہ ہو جائے۔ یہ عمل اگرچہ نادر ہے لیکن اس سے نسب ثابت ہو جائے گا اور یہ بعینہٖ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا جزئیہ ہے اللہ تعالیٰ ہمارے فقہاء پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، انہوں نے اب سے کئی سو برس پہلے ایسے اصول اور قواعد بیان کر دیے جس سے کئی سو برس بعد پیش آنے والے مسائل حل ہو گئے۔ علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

وما قيل لا يلزم من ثبوت النسب منه وطؤه لان الحبل قد يكون باد خال الماء الفرج دون جماع فنادر۔

''اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی شخص سے ثبوتِ نسب سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس نے جماع بھی کیا ہو، کیونکہ بغیر جماع کے بھی عورت کی اندام نہانی میں نطفہ پہنچانے سے عورت حاملہ ہو جاتی ہے، تو یہ نادر الوقوع ہے''۔ (فتح القدیر جلد ۴، صفحہ ۱۷۱)

علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحر الرائق جلد ۴، صفحہ ۱۶۹ پر اور علامہ شبلی نے حاشیۃ الشبلی علی تبیین الحقائق جلد ۳، صفحہ ۳۹ پر بھی بعینہٖ یہی لکھا ہے، عالم گیری میں ہے:

وان كان الزوج مجبوبا ولم تعلم بحاله فجاءَت بولد فادعاه واثبت القاضی نسبه ثم علمت بحاله و طلبت الفرقة فلها لان الولد لزمه بغير جماع كذا في المحيط۔

''اگر شوہر کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہو اور عورت کو اس کا پتا نہ ہو اور اس کو بچہ ہو جائے اور خاوند اس بچے کا دعویٰ کرے اور قاضی اس سے نسب ثابت کر دے پھر عورت کو اس کے حال کا علم ہو اور وہ علیحدگی طلب کرے تو اس کے لیے جائز ہے، کیونکہ بچہ اس سے بغیر جماع کے پیدا ہو گیا''۔ (فتاویٰ عالم گیری، جلد ۱، صفحہ ۵۲۵)

جس شخص کا آلۂ تناسل کٹا ہوا ہو وہ جماع نہیں کر سکتا ایسے شوہر کا نطفہ بغیر جماع کے کسی اور ذریعہ سے عورت کی اندام نہانی میں پہنچے گا اور بچہ پیدا ہو جائے گا اور اس کا نسب عورت کے شوہر سے ثابت ہوگا اور چونکہ وہ شخص جماع نہیں کر سکتا اس لیے فقہاء نے عورت کو علیحدگی کے مطالبہ کی اجازت دے دی ہے۔

بہرحال البحر المحیط اور عالم گیری کی عبارت سے بھی یہ واضح ہو گیا کہ اگر شوہر نے بغیر جماع کے اپنا نطفہ عورت کی اندام نہانی میں پہنچا دیا اور بچہ ہو گیا تو اس کا شوہر سے نسب ثابت ہو جائے گا۔ علامہ شمس الدین سرخسی، المبسوط (جلد ۵، صفحہ ۱۰۴)، علامہ علاؤ الدین الحصکفی، الدر المختار علی الرد (جلد ۲، صفحہ ۸۱۷) اور علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی (رد المحتار جلد ۲، صفحہ ۸۱۷) نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

وقد قيل ان المرأة تحمل من غير وطأ بان يدخل ماء الرجل في فرجها، بعضلها او بعضل غيرها۔

''ایک قول ہے کہ عورت بغیر وطی اور جماع کے بھی حاملہ ہو جاتی ہے بایں طور کہ مرد کا پانی عورت کے اندام نہانی میں داخل کیا جائے۔ خواہ عورت خود داخل کرے یا کوئی اور۔

(المغنی مع الشرح الکبیر ۱/۱۸۷)

فقہ جعفریہ کے ممتاز عالم شیخ روح اللہ خمینی نے بھی اپنی توضیح المسائل صفحات ۴۵۳۔۴۵۲ پر اسے جائز قرار دیا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ صحیح النسب ہوگا۔

فاتحہ کا طریقہ

سوال: فاتحہ سے کیا مراد ہے؟ فاتحہ کا طریقہ کیا ہے؟ کیا فاتحہ دینے کے لئے سامنے کھانے کا رکھنا ضروری ہے؟ (محمد انصر قیوم عباسی۔ دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: قرآن مجید کی سب سے پہلی سورت کا نام سورۂ فاتحہ ہے۔ اس سورۃ کے اور بھی متعدد نام ہیں: مثلاً ام الکتاب، فاتحۃ القرآن، السبع المثانی، الوافیہ، الشفاء، سورۃ الصلوٰۃ، سورۃ الدعاء وغیرہ۔ عرفِ عام میں فاتحہ سے مراد ہے میت کی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کلام اللہ یا الحمد و درود اور کلماتِ طیبات کی تلاوت کرنا۔ چونکہ فاتحہ میں بالعموم سورۃ فاتحہ ضرور پڑھی جاتی ہے، اس لئے اس ''دعاء ایصالِ ثواب'' کو فاتحہ کے نام سے موسوم کردیا گیا ہے، خواہ یہ تلاوتِ قرآن پر مشتمل ہو یا کلماتِ طیبات اور درود پاک پر مشتمل ہو یا میت کے ایصالِ ثواب کی خاطر فقراء کے لئے کھانا تیار کیا گیا ہو یا ان سب چیزوں کا مجموعہ ہو، اس کو اردو زبان میں فاتحہ دلانا/ دلوانا یا فاتحہ دینا یا فاتحہ پڑھنا کہا جاتا ہے۔ بعض بزرگوں کا معمول رہا ہے کہ فاتحہ میں ختمِ قرآن مجید کے بعد سورۂ فاتحہ، آیت الکرسی، سورۃ الاخلاص (تین، پانچ، سات یا گیارہ مرتبہ حسبِ توفیق) سورۃ الفلق، سورۃ الناس، سورۃ البقرہ کی ابتدائی پانچ اور آخری دو آیات اور درود پاک و تسبیحات و اذکار وغیرہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کی دعا کی جاتی ہے اور اگر ختمِ قرآن کی فرصت نہ ملے تو باقی چیزوں پر اکتفا کرلیا جاتا ہے۔ فاتحہ دینے یا دلانے کے لئے کھانے کا سامنے رکھنا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر رکھ لیا جائے تو اس کی ممانعت بھی نہیں ہے۔

امریکہ میں ایک مسلم مذبح کے متعلق مسائل

سوال: (۱) امریکہ کے ایک شہر میں ایک فلسطینی مسلمان، ایک مذبح کا مالک ہے جس میں عام امریکی مذابح کے مطابق نہ سؤر کا گوشت ہوتا ہے اور نہ ہی مشینی ذبیحے کا گوشت ہوتا ہے۔ اس مذبح میں صرف گائے، بکرے اور دنبے کا گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ مذبح کے مالک کا ایک مسلمان ملازم ہے جو شریعت کے مطابق جانوروں کو ذبح کرتا ہے، اسے ایک وقت میں کثیر تعداد میں حلال

جانور ذبح کرنے ہوتے ہیں، لہٰذا ذبح کے وقت عجلت میں کبھی تو چاروں رگیں کاٹ دیتا ہے اور کبھی صرف تین یا دو رگیں بھی کٹ جاتی ہیں۔

ازراہِ کرم یہ بتایئے کہ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ذبح کے وقت شرعاً حلال ہونے کے لئے جانور کی گردن کی کتنی رگیں کاٹنا ضروری ہیں، اور یہ بھی تحریر کریں کہ شرعاً مذکورہ بالا طریقے سے ذبح شدہ جانوروں کا گوشت کھانا اور اس کی خرید و فروخت مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

سوال: (۲) یہ بھی بتایئے کہ آیا شرعاً ''شرائطِ بیع وشراء'' اور ''حلتِ شرعی'' کے لئے خریدار کا دوکاندار سے یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ آیا تم سنی ہو یا وہابی، اور میلاد شریف وصلوٰۃ وسلام کے قائل ہو یا نہیں؟ جلد جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(مولانا) محمد بابر رحمانی قادری ڈیلس، امریکہ)

جواب: (۱) الحمدللہ! یہ امر باعثِ مسرت واطمینان ہے کہ ایک سیکولر نظام پر مبنی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کو یہ سہولت میسر ہے کہ مسلمانوں کے اپنے مذابح (SlaughterHouses) موجود ہیں، جہاں مالک بھی مسلمان ہے اور ذابح (Slaughterer) بھی مسلمان ہے اور شرعی ذبیحے کا اہتمام بھی ہے۔ حلال جانور کے ذبیحے (Slaughtered Animal) کے شرعاً حلال ہونے کے لئے اس کی گردن کی چاروں رگوں یا کم از کم تین رگوں (یعنی اکثر) کا کٹ جانا ضروری ہے، فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۲۸۷ پر ہے:

والعروق التی تقطع فی الذکاۃ اربعۃ، الحلقوم: هو مجری النفس، والمریٔ: هو مجری الطعام، والودجان: وهما عرقان فی جانبی الرقبۃ یجری فیهما الدم: فان قطع کل الاربعۃ حلت الذبیحۃ وان قطع اکثرها فکذالک عند ابی حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ، وقالا: لا بد من قطع الحلقوم والمریٔ واحد الودجین، والصحیح قول ابی حنیفۃ لما ان للاکثر حکم الکل، کذا فی المضمرات

''وہ رگیں جو ذبح کے وقت کاٹی جاتی ہیں، چار ہیں: (۱) حلقوم: یہ سانس کی نالی ہے، (۲) مریٔ: یہ خوراک کی نالی ہے، (۳، ۴) ودجان: یہ گردن کے دائیں و بائیں جانب خون کی دو نالیاں ہیں، اگر (ذبح کے وقت) یہ چاروں رگیں کٹ گئیں تو ذبیحہ

(بالاتفاق) حلال ہے، اور اگر اکثر رگیں کٹ جائیں، تب بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلال ہے، اور امام ابو یوسف و امام محمد کہتے ہیں: حلقوم، مریٔ اور ودجان میں کسی ایک کا کٹنا ضروری ہے، اور (دراصل) امام ابوحنیفہ ہی کا قول صحیح ہے، کیونکہ اکثر کل کے حکم ہوتا ہے اور مضمرات میں بھی یہ مسئلہ یونہی بیان کیا گیا ہے"۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وحلّ المذبوح بقطع ای ثلاث منھا اذ للاکثر حکم الکل۔

"اور مذبوح جانور ان (چار) میں سے کسی بھی تین کے کٹ جانے سے حلال ہو جاتا ہے، کیونکہ اکثر کل کا حکم رکھتی ہیں۔ (درمختار ج ۵ ص ۲۰۷ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ)

صورتِ مسئولہ میں جب یقین یا ظنِ غالب ہو کہ اکثر رگیں کٹ جاتی ہیں تو اس مذبح کا ذبیحہ حلال ہے، کیونکہ یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔ اور ویسے بھی مسلمانوں کو ایک دوسرے کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینا چاہئے۔

جواب: (۲) ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور اس کا ظاہر حال اس کی تصدیق کرتا ہے، تو یہ کافی ہے، الّا یہ کہ کسی کا کفر وارتداد دلائل وقرائن سے ثابت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدہ:۱۰۱)

"اے ایمان والو! ایسی باتوں کی بابت نہ پوچھو کہ اگر وہ تمہارے لئے ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں"۔

رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں بدگمانی، تجسس اور تحسس سے منع فرمایا ہے، ارشاد نبوی ہے:

عن عائشة انهم قالوا: يارسول الله ﷺ ان قوماً حديثو عهد بجاهلية يا تونا بلحمان، لاندری أذكروا اسم الله ام لم يذكروا، أناكل منها، فقال رسول الله ﷺ، سموا الله وكلوا

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ)! کچھ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے (اس جانور پر ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا ہے یا

نہیں، کیا ہم اس گوشت کو کھا لیا کریں؟، آپ نے فرمایا: بسم اللہ پڑھو اور کھاؤ"۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰۵۷-۵۵۰۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۱۷۴)

ذابح کا مسلمان ہونا یا اہل کتاب سے ہونا شرط ہے، لیکن گوشت فروخت کرنے والے کے لئے اسلام شرط نہیں ہے۔ ذابح یا قصاب یا دکاندار کے عقائد ونظریات کی اتنی مفصل تحقیقات تو پاکستان یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں بھی لوگ نہیں کرتے، غلبۂ ظن اور حسنِ ظن سے کام لیتے ہیں، چہ جائے کہ غیر مسلم ممالک میں یہ معیارات قائم کئے جائیں۔

ھذا ماعندی۔ فقط واللہ تعالیٰ ورسولہٗ اعلم بالصواب

منّت کی چادریں اور تالے

سوال: اکثر لوگ مزار پر چادر چڑھانے کی منت مانتے ہیں اور دیکھنے میں آیا ہے کہ مزار کے مخصوص حصوں میں منت کے بے شمار تالے لگے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان تالوں کے لگانے سے کام پورا ہو جاتا ہے، کام پورا ہونے کے بعد تالے کو کھول دیتے ہیں، اور بہت سے لوگ منت کی مخصوص ڈوریاں (جو مزارات پر عام فروخت ہوتی ہیں) باندھتے ہیں۔ اور آج کل منت کا یہ نیا طریقہ چلا ہے کہ مزارات پر منت کی مخصوص روٹیاں فروخت ہوتی ہیں جن کے بارے میں بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان روٹیوں کو ایک ہفتے تک گھر میں رکھنا باعثِ برکت ہے۔ کیا ان سب امور کی منّت ماننا جائز ہے یا ناجائز۔

(حافظ محمد جمشید ہاشمی...... مظفر گڑھ، پنجاب)

جواب: انسان جس کام کی منّت مان کر اس کو اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے، اس کو نذر کہتے ہیں، نذر کی مشروعیت اور جواز قرآن سے ثابت ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (آل عمران:35)

"جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کی تیرے لیے منت مانتی ہوں، تو (اسے) میری جانب سے قبول فرما، بیشک تو بہت ہی سننے والا خوب جاننے والا ہے"۔

اسی طرح قرآن میں نذر پورا کرنے کا بھی حکم ہے: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (الحج:29)

"اور ان پر لازم ہے کہ وہ اپنی نذروں کو پورا کریں"۔

حدیث شریف میں ہے کہ اگر نذر اطاعت اور امورِ خیر کی ہو، جیسے مالی صدقہ یا روزہ وغیرہ، تو اس کا پورا کرنا لازم ہے، اور معصیت اور گناہ کی ہو تو اس کا پورا کرنا لازم نہیں ہے بلکہ اس کا نہ کرنا شرعاً لازم ہے۔ فرمانِ رسول ہے:

من نذر ان يطيع الله فليُطِعه و من نذران يعصيه فلا يعصه.

"جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نذر مانی، وہ اس عبادت کو ضرور کرے، اور جس شخص نے گناہ کرنے کی نذر مانی وہ اس گناہ کو نہ کرے"۔ (صحیح بخاری، جلد ۲، صفحہ ۹۹۱)

اگر کوئی شخص معصیت کی نذر مانتا ہے مثلاً خدانخواستہ یہ کہے کہ اللہ کے لیے مجھ پر شراب پینا واجب ہے، تو یہ نذر باطل اور حرام ہے اور اس پر اجماع ہے اور شرعاً اس کا ترک واجب اور اس پر عمل کرنا حرام ہے، البتہ معصیت کی نذر پر بتقاضائے شریعت عمل نہ کرنے کی صورت میں قسم کا کفارہ لازم آئے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کا فرمان ہے:

لانذر فی معصية و كفارته كفارة يمين.

"معصیت کی نذر ماننا جائز نہیں ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے"۔
(سنن کبریٰ، ج ۱۰، ص ۷۰)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا یہی مسلک ہے۔

غالباً نذر اور قسم میں معنیٰ مشترک یہ ہے کہ دونوں کے ذریعے بندہ ایک ایسی چیز کو اپنے اوپر لازم کرتا ہے جو شریعت نے اس پر لازم نہیں کی، اور معصیت کی قسم کا بھی یہی حکم ہے کہ اس پر عمل نہ کرے اور اس کا کفارہ ادا کرے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

من حلف علی يمين فرأی غيرها خيرا منها فليكفر عن يمينه وليفعل الذی هو خير.

"جو کسی بات کی قسم کھائے، پھر اس پر واضح ہو کہ (شرعاً) ترکِ قسم میں خیر ہے تو اسے

چاہئے کہ کفارہ ادا کرے (یعنی قسم کو توڑدے) اور وہ کام کرے جس میں خیر ہے"۔
(صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

شرعاً نذر کے صحیح ہونے کی چند شرائط ہیں:

۱۔ جس چیز کی نذر مانی ہے اس کی جنس سے شرعاً کوئی عبادت واجب ہو، جیسے نوافل کی نذر، روزے کی نذر، حج کی نذر، صدقے کی نذر وغیرہ۔

۲۔ جس چیز کی نذر مانی ہے وہ عبادتِ مقصودہ ہو، دوسری عبادت کا وسیلہ نہ ہو، جیسے وضو اور سجدۂ تلاوت۔

۳۔ جس چیز کی نذر مانی ہے، وہ فی نفسہٖ معصیت نہ ہو، جیسے کسی ایسے جانور کے صدقہ کرنے کی نذر ماننے جو دوسرے کی ملکیت ہے۔

۴۔ جس عبادت کی نذر مانی ہے وہ فی نفسہٖ فرض یا واجب نہ ہو، جیسے کسی وقتِ معین کی فرض نماز یا زکوٰۃ یا حج فرض کی نذر ماننا کیونکہ ان امور کو تو ویسے ہی شریعت نے فرض قرار دیا ہے۔

۵۔ جس عبادت کی نذر مانی ہے وہ امر محال نہ ہو، جیسے کوئی شخص کہے کہ "اگر اللہ تعالیٰ نے میرا فلاں کام کر دیا تو میں گزشتہ کل میں روزہ رکھوں گا"۔

نذر ایک امر تعبدی ہے، یعنی یہ عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ کے تقرب اور رضا کے لیے کی جاتی ہے لہٰذا نذر صرف اللہ کے لیے ماننا جائز ہے، غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا جائز نہیں ہے۔

اب آیئے سوال میں دریافت کردہ مسائل کی طرف مزار پر چادر چڑھانے کی نذر مطلقاً ماننا درست نہیں ہے کیونکہ یہ کوئی امر تعبدی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی جنس سے کوئی عبادتِ مقصودہ واجب ہے، اسی طرح مزار پر تالے لگانے اور کھولنے کی نذر بھی باطل ہے، اسی طرح مزار سے مخصوص روٹیاں خریدنے اور کچھ دن گھر پر رکھنے کے بعد واپس مزار پر جا کر بیچنے کی نذر بھی باطل ہے، عوام کو ایسی جاہلانہ نذریں ماننے سے روکنا چاہئے اور علماء کو اپنے خطباتِ جمعہ میں اصلاحی تقریریں کرنی چاہئیں۔ ذیل میں ہم فقہاءِ اُمت اور کتبِ فتاویٰ کی وہ عبارات نقل کر رہے ہیں جن میں اس طرح کی نذریں ماننے کا حکمِ شرعی بتایا گیا ہے اور ان میں جو جواز کی صورت ہے وہ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

"اکثر عوام فوت شدہ لوگوں کی نذر مانتے ہیں اور اولیاء اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے

لیے ان کے مزارات پر روپے پیسے، موم بتیاں اور تیل لے جاتے ہیں یہ نذر بالا جماع باطل اور حرام ہے جب تک ان چیزوں کو فقراء پر خرچ کرنے کا قصد نہ کیا جائے''۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی اس عبارت کی شرح میں لکھتے ہیں:

''جو شخص اولیاء اللہ کی نذر اس طرح مانتا ہے: ''اے سیدی! اگر میرا گم شدہ شخص لوٹ آیا یا میرا بیمار تندرست ہو گیا یا میری حاجت پوری ہو گئی تو میں آپ کو اتنا سونا، چاندی یا کھانا یا موم بتیاں یا تیل دوں گا، یہ نذر بالا جماع باطل اور حرام ہے اور اس پر متعدد دلائل ہیں: پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور مخلوق کی نذر جائز نہیں ہے کیونکہ نذر عبادت ہے اور مخلوق کی عبادت جائز نہیں ہے، دوسری دلیل یہ ہے کہ جس کی نذر مانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا، تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ نہیں میت کا تصرف ہے تو اس کا یہ اعتقاد کفر ہے۔ اس کی اصلاح کی یہ صورت ہے کہ نذر ماننے والا اللہ کی نذر مانے اور کہے اے اللہ اگر میرا مریض شفایاب ہو گیا، یا میرا گم شدہ شخص واپس آ گیا یا میری حاجت پوری ہو گئی تو میں تیری نذر مانتا ہوں کہ میں (مثلاً) سیدہ نفیسہ یا امام شافعی، یا امام لیث کے مزار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مساجد کے لیے چٹائیاں لے جاؤں گا یا ان مساجد کے لیے تیل یا روپے، پیسے لے جاؤں گا۔ نذر اللہ عزوجل کی ہو اور اولیاء کرام کا ذکر صرف نذر کا مصرف متعین کرنے کے لیے ہو، اور جو فقراء اولیاء اللہ کے مزارات یا مساجد پر اس امید سے بیٹھے ہوتے ہیں ان پر اس نذر کو خرچ کیا جائے۔ اس نذر کو غنی، عہدہ دار اور سادات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور شریعت میں نذر کو اغنیاء پر صرف کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ مخلوق کی نذر حرام ہے اور منعقد نہیں ہوتی اور نہ ہی مزارات کے خادموں کے لیے اس نذر کا لینا جائز ہے الا یہ کہ وہ فقراء ہوں اور ان کے اہل و عیال کسب سے عاجز ہوں''۔

(رد المحتار علی الدر المختار، ج ۳، ص ۳۸۰-۳۷۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت لبنان)

ملا نظام الدین حنفی (مرتب فتاویٰ عالمگیری) نے ذکر کیا ہے:

''اکثر عوام اس طرح نذر مانتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کے مزارات پر جاتے ہیں اور ان کے مزار کی چادر اُٹھا کر کہتے ہیں: اے سیدی فلاں بزرگ! اگر میری حاجت پوری ہو گئی تو مثلاً آپ کو اتنا سونا دوں گا'' یہ نذر بالا جماع باطل ہے۔ ہاں اگر یہ کہے کہ اے اللہ! میں تیری نذر مانتا ہوں کہ اگر مثلاً

میرا بیٹا شفاء یاب ہو گیا تو میں مثلاً سیدہ نفیسہ کے دربار پر بیٹھنے والے فقراء کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مسجد کے لیے چٹائیاں اور روشنی کے لیے موم بتیاں دوں گا یا مسجد کے منتظم کو خرچ کے لیے پیسے دوں گا۔ یہ نذر اللہ تعالیٰ کی ہو اور شیخ کا ذکر صرف نذر کے مستحقین کے محل کو متعین کرنے کے لیے ہو تو یہ جائز ہے۔ لیکن اس نذر کو غیر فقراء پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے، کسی ذی علم عالم پر اور نہ شیخ کے خدام اور حاضرین پر الا یہ کہ وہ فقراء ہوں۔ پس اولیاء اللہ کے مزارات پر ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جو پیسے چڑھائے جاتے ہیں وہ بالا جماع حرام ہیں جب تک ان پیسوں کو زندہ فقراء پر خرچ کرنے کا قصد نہ کیا جائے اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور اکثر لوگ اس غلط کام میں مبتلا ہیں۔ النہر الفائق اور البحر الرائق میں اسی طرح لکھا ہے''۔

(فتاویٰ عالمگیری، ج ۱، ص ۲۱۶ مطبوعہ مصر)

البتہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے فتاویٰ عزیزی ج ۱، ص ۹۵ پر فتاویٰ عالمگیری کی عبارت لکھ کر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارے ہاں عرفِ عام میں جو لوگ بزرگانِ دین کی نذر کے نام سے صدقات و خیرات کرتے رہتے ہیں، وہ دراصل ایصالِ ثواب ہے جو شرعاً جائز اور مستحسن امر ہے، یہ وہ شرعی و فقہی نذر نہیں ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے۔ ایسا صدقہ و خیرات کرنے والے کی نیت یہ ہوتی ہے کہ تصدق اللہ کے نام پر ہے اس کا مصرف فقراء ہیں اور ایصالِ ثواب اس بزرگ کے لیے ہے۔ لیکن اگر کسی کی نیت یہ ہے کہ بزرگ کے نام کی نذر ہے، اس کا تقرب مقصود ہے تو یہ بلا شبہ باطل اور حرام ہے، اور اگر کوئی غیر اللہ کو اشیاء اور امور میں ''متصرف بالذات'' مانتا ہے تو یہ کفر ہے۔

ربیع الاول میں چراغاں

سوال: ربیع الاول کا مہینہ آتے ہی شہر کراچی میں جگہ جگہ بجلی کے قمقموں سے چراغاں کیا جاتا ہے ۹۰ فیصد یہ چراغاں بجلی کی چوری سے کیا جاتا ہے۔ رات تو رات دن میں بھی قمقمے روشن ہوتے ہیں۔ آپ اس مسئلہ پر کیا فرماتے ہیں، (سید محمد اسامہ۔ گلبرگ، کراچی)۔

جواب: موجودہ دور میں جلوس نکالنا اور چراغاں کرنا، اظہار مسرت اور دین کی شوکت کے اظہار کے معروف و مروج طریقے ہیں۔ جیسے جلوسِ میلاد النبی ﷺ، یوم شوکتِ اسلام کے

نام پر جلوس، جلوسِ عظمتِ صحابہ وغیرہ اسی طرح شادی، نکاح ودیگر تقریبات میں اظہارِ مسرت کے لئے بھی چراغاں کیا جاتا ہے۔ اور مومن کی نگاہ میں آمدِ مصطفیٰ ﷺ، ولادتِ مصطفیٰ ﷺ اور بعثتِ مصطفیٰ ﷺ سے بڑھ کر کسی دینی خوشی اور سعادت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا میلاد النبی ﷺ کا جلوس اور چراغاں جائز اور مستحب امور ہیں۔

کے ای ایس سی یا واپڈا کے پولوں سے ڈائریکٹ بجلی بلا اجازت لینے پر شرعی وفقہی چوری کا اطلاق تو درست نہیں ہے کیونکہ سرقہ (چوری) کی فقہی تعریف یہ ہے کہ ایسا مال جسے مالک نے حفاظت سے رکھا ہوا اور اس کی حفاظت کا انتظام کیا ہو۔ اسے مالک کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر لے لینا۔ اب ظاہر ہے کہ بجلی کے پول اور تاریں کھلی ہوتی ہیں۔ مال محفوظ نہیں ہے اور متعلقہ ادارے ایسے استعمال سے غافل نہیں ہوتے، تاہم یہ درست ہے کہ بلا اجازت ڈائریکٹ کنکشن لے لینا غیر قانونی' غیر شرعی اور لائق تعزیر جرم ہے۔ لہٰذا اہلِ عقیدت ومحبت کو چاہئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار میں حدودِ شرعی کی پاسداری کریں اور متعلقہ اداروں کو چاہئے کہ وہ ایسے مواقع پر مناسب معاوضہ وصول کر کے عارضی کنکشن کا کوئی قانونی طریقہ وضع کریں۔ دن میں قمقموں کا روشن کرنا اسراف ہے۔

خون سے فاتحہ لکھنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں جو فتاویٰ شامی میں موجود ہے کہ خون اور پیشاب کے ساتھ (اگر یقین ہو کہ اس سے شفاء ملے گی) سورۂ فاتحہ لکھنا جائز ہے۔ کیا یہ صحیح ہے اور علامہ شامی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ بہت سے غیر مقلد حضرات اس مسئلے کو احناف کے خلاف پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، (حافظ آثار اللہ ہزاروی، لیاقت آباد)

جواب: اصل مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے فقہ اسلامی کی چند اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔ ایک شدید مجبوری کی صورتِ حال ہوتی ہے، جسے حالتِ ''اضطرار'' کہتے ہیں، یعنی جب انسان کے پاس بقاء جان کے لئے کوئی حلال چیز دستیاب نہ ہو، البتہ حرام چیز دستیاب ہو، اور اگر وہ اس موقع پر جان بچانے کے لئے حرام چیز استعمال نہیں کرتا تو اس کی جان کے تلف ہونے اور ہلاکت کا اندیشہ ہے، ایسی ''صورتِ اضطرار'' میں حکم ہے کہ حرام چیز کھا کر جان بچالے اور اس کے لئے اصولِ فقہ میں

ایک قاعدہ وضع ہوا ہے کہ ''الضرورۃ تبیح المحظورات''، یعنی ضرورتِ شدیدہ کی بناء پر ممنوعات مباح ہوجاتی ہیں''، لیکن اس ''اباحتِ محظورات'' کو بھی بلا روک ٹوک نہیں چھوڑا بلکہ اس پر بندش عائد کردی گئی ہے کہ: ''الضرورۃ تتقدر بالضرورۃ'' یعنی بربناءِ ضرورت حرام چیز کے استعمال کا جواز ''دفعِ ضرر'' اور خطرۂ ہلاکت'' تک محدود رہے گا، لذتِ نفس اور خواہش نفسانی کی تکمیل کے لئے حدودِ شرع کو پامال کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ قرآن مجید میں اس مسئلے کو اطلاق انداز (APPLIED FORM) میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (البقرہ: ۱۷۳)

''یقیناً تم پر مردار، (ذبح کے وقت بہنے والا) خون، خنزیر کا گوشت اور اس جانور کا کھانا، جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو، حرام قرار دیا گیا ہے، (البتہ) جو (بھوک و پیاس کی شدت سے) بیتاب ہوجائے تو اس پر (بقدرِ ضرورت ان اشیاء کے کھانے میں) کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ نافرمان اور حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، بلاشبہ اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے''۔

(۲) سورۂ المائدہ آیت نمبر ۳ میں متعدد محرماتِ قطعیہ (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، لحمِ خنزیر، غیر اللہ کے نام پر ذبیحہ، گلا گھٹنے سے مرا ہوا جانور، چوٹ کھا کر مرا ہوا، بلندی سے گر کر مرا ہوا، دوسرے جانور کا سینگ لگنے سے مرا ہوا، جسے کسی درندے نے مار کھایا ہو، جنوں کے استھانوں پر ذبح کیا گیا ہو، فال کے تیروں سے قسمت کا حال معلوم کرنا یا جوا بازی کرنا) کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ ۙ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

''تو جو شخص بھوک و پیاس کی شدت سے بے قابو ہو کر (محض بقاء جان کیلئے) کوئی حرام چیز کھا پی لے، اس حال میں کہ گناہ کی طرف میلانِ قلبی بالکل نہ ہو، تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا مہربان ہے''۔

(۳۔۴) اسی مضمون کو سورۃ الانعام، آیت نمبر ۱۱۹ اور سورۃ النحل، آیت نمبر ۱۱۵ میں بھی

بیان کیا گیا ہے۔

دوسری صورت ''حالتِ اکراہ'' ہے، یعنی یہ کہ انسان کفار کے چنگل میں پھنس جائے اور وہ اسے مجبور کریں کہ ''کلمۂ کفر'' کہو ورنہ تجھے جان سے مار دیں گے اور ایسے ظاہری قرائن بھی موجود ہوں کہ اگر ان کے حکم کی تعمیل نہ کی تو وہ اپنی دھمکی پر عمل کر لیں گے اور ظاہری اسباب کے تحت وہ اس کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٦﴾ (النحل:۱۰۶)

''جو اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کرے (تو اس کا حکم آگے آ رہا ہے)، مگر جسے (قتل کی دھمکی دے کر ''کلمۂ کفر'' کہنے پر) مجبور کر دیا گیا ہو (تو اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں) درآں حالیکہ اس کا دل ایمان پر (بالکل) مطمئن ہے، لیکن (اس کے برعکس) جو شخص قلبی رضامندی سے کفر اختیار کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے''۔

ان آیاتِ قرآنی کی روشنی میں ''حالتِ اضطرار'' میں قلبی نفرت وکراہت کے ساتھ محض جان بچانے کی حد تک حرام چیز کو استعمال کرنے کی اجازت ہے اور فقہی اعتبار سے اس رخصتِ شرعی پر عمل کرنا ضروری ہے، اور ''حالتِ اکراہ'' میں کم ہمت شخص کو جان بچانے کے لئے محض زبانی حد تک ''کلمۂ کفر'' کہنے کی رخصت واجازت ہے، بشرطیکہ ایمان اس کے قلب میں مستحکم ہو، لیکن اگر کوئی صاحبِ عزم، باہمت، ذی حمیت اور دینی اعتبار سے متصلّب مومن ہے اور اپنے ایمان کے تحفظ کے لئے ہر تکلیف کو برداشت کرنے حتیٰ کہ اپنی جان قربان کرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہے تو اس کے لئے ''درجۂ عزیمت'' یہ ہے کہ جان دے دے اور کلمۂ کفر زبان پر نہ لائے تاکہ اس کی میت زبانِ حال سے اس شعر کی تصویر ہو۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اب اس سیاق وسباق میں کہ قرآن ''حالتِ اضطرار'' و ''حالتِ اکراہ'' کے احکام بیان کر رہا ہے، کوئی شخص روحِ قرآنی ومنشاءِ ربانی کو نہ سمجھے اور یہ پھبتی کسے کہ قرآن نے حرام کھانے پینے اور کلمۂ کفر کہنے کی اجازت دی ہے تو اسے خباثتِ نفس اور فکری ضلالت کے سوا اور کیا نام دیا

جاسکتا ہے۔ انہی قرآنی اصولوں سے استفادہ کرتے ہوئے فقہاءِ امت نے کتبِ فقہ میں ''تداوی بالحرام'' (یعنی حرام چیز سے علاج کرنے) کے عنوانات قائم کئے ہیں اور اپنی مجتہدانہ بصیرت سے ان کے احکام بیان کئے ہیں۔ اسی عنوان کے تحت علامہ ابنِ عابدین شامی نے اپنی کتاب ''ردالمحتار'' میں طویل فقہی بحث کی ہے اور وہ عبارت نقل کی ہے جس کا حوالہ دے کر مستفتی نے سوال دریافت کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ فتاویٰ رضویہ ج ۱۰، ص ۱۱۲ پر ایسے ہی ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فتاویٰ قاضی خان کی عبارت ذیل نقل کرتے ہیں:

الذی رعف فلا یرقأ دمه فاراد ان یکتب بدمه علیٰ جبهته شیئا من القرآن قال ابوبکر الاسکاف رحمه الله تعالیٰ یجوز، قیل لو کتب بالبول قال لو کان فیه شفاء لابأس به، قیل لو کتب علیٰ جلد میتة قال ان کان فیه شفاء جاز و عن ابی نصر بن سلام رحمه الله تعالیٰ معنی قوله علیه الصلوٰة والسلام: ان الله لم یجعل شفاء کم فی ماحرم علیکم، انما قال ذالک فی الاشیاء التی لایکون فیه شفاء و اما اذا کان فیها شفاء فلا بأس به، قال الا تری ان العطشان یحل له شرب الخمر حالة الاضطرار۔

''کسی کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس کا خون کسی طور پر نہیں رکتا، تو اس نے ارادہ کیا کہ (علاج کی غرض سے) اپنے خون سے اپنی پیشانی پر قرآن کے کوئی کلمات لکھے، (تو کیا یہ جائز ہے؟) ابوبکر اسکاف نے کہا: جائز ہے، سائل نے پوچھا: اگر پیشاب سے لکھے؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر اس میں شفاء کا علم (یقینی) ہے تو کوئی حرج نہیں، سائل نے پوچھا: اگر مردار کی کھال پر لکھے تو؟ انہوں نے فرمایا: اگر اس میں شفاء ہے تو جائز ہے، اور ابونصر بن سلام کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد ''کہ اللہ نے تمہارے لئے حرام چیزوں میں شفاء نہیں رکھی'' ان چیزوں کے بارے میں فرمایا، جن میں شفاء نہیں ہے اور جن محرمات میں شفاء ہے تو ان کے (بقدرِ ضرورت) استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، انہوں نے فرمایا: تم غور نہیں کرتے کہ (ازروئے قرآن) حالتِ اضطرار میں پیاسے کے لئے (جان بچانے کی حد تک) شراب پینا جائز ہے''۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ بحث ''تداوی بالحرام'' (یعنی حرام اشیاء سے علاج) کے جواز یا عدمِ جواز کے بارے میں ہے، اور آج کل تو تقریباً ہومیو پیتھک کی تمام دواؤں، ایلو پیتھک کی بیشتر دواؤں بالخصوص مُسکّن دواؤں میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے، نیز یہ کہ ''تعویذ'' اور آیات قرآنیہ وکلماتِ طیبات کا دم بھی بعض جسمانی وروحانی امراض کے من جملہ اسبابِ شفاء میں سے ایک ہے اور احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔

امام احمد رضا قادری فتاویٰ قاضی خان کی مُؤلّہ بالا عبارت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فقیہ موصوف کا حکم تین شرطوں کے ساتھ مشروط ہے: اول یہ کہ جان جانے کا خوف ہو، جس کی طرف ''حالتِ اضطرار'' کے کلمات سے اشارہ کیا گیا ہے، کیونکہ خون کے نہ رکنے اور مسلسل جاری رہنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، دوم یہ کہ اس تدبیر سے اسے شفاء ہو جانا بھی معلوم ہو، اس کی طرف ''لو کان فیه شفاء'' (یعنی اگر اس میں شفاء ہے) کے الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے، اور ردالمحتار میں ہے: ''قد علم انه لو کتب ینقطع'' یعنی اسے یقین کی حد تک معلوم ہے کہ اگر وہ اپنے خون سے اپنی پیشانی پر فاتحہ لکھے گا تو خون رک جائے گا۔ سوم یہ کہ اس کے سوا کوئی اور تدبیر شفاء اسے معلوم نہ ہو، یہ چیز ردالمحتار کی اس عبارت سے عیاں ہے کہ:

فی النهایة عن الذخیرة یجوز ان علم فیه شفاء ولم یعلم دواء اٰخر۔

''''نہایہ'' میں ''ذخیرہ'' کے حوالے سے منقول ہے کہ یہ تب جائز ہے کہ اس (تدبیرِ علاج) میں شفاء کا علم یقینی ہے اور اس کے متبادل کوئی دوسری دوا اس کے علم میں نہ ہو''۔

ہم نے سطورِ بالا میں امام احمد رضا کی طویل بحث کا خلاصہ بیان کیا ہے۔

ہم نے کتبِ فقہ وفتاویٰ کی عبارات کا جس قدر مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ''تداوی بالحرام'' صرف اضطرار کی صورت میں یعنی محض جان بچانے کے لئے جائز ہے، جب کہ فتاویٰ قاضی خان وردالمحتار کی عبارات ان سطور میں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ ان کتب میں مثال بھی ایسی ہی دی ہے کہ خون جاری ہو جائے اور کسی طرح رکنے نہ پائے، خواہ یہ کسی بیرونی زخم کے نتیجے میں ہو یا بدن کے اندر کسی داخلی سبب سے ہو۔ جدید میڈیکل سائنس بھی یہ تسلیم کرتی ہے کہ کسی زخمی یا مریض شخص کے بدن سے کثیر مقدار میں خون بہنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، جہاں تک روز مرہ عام امراض کا تعلق ہے، جن سے جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوتا اور جن کا عام دستیاب ادویہ اور

ذریعوں سے علاج ہو سکتا ہے، ان کے لئے ''تداوی بالحرام'' جائز نہیں ہے، اور کتب فتاویٰ میں عام ممانعت کے احکام انہیں سے متعلق ہیں، چنانچہ درمختار میں ہے:

وظاهر المذهب المنع

''یعنی ظاہر مذہب فقہ حنفی یہ ہے کہ حرام اشیاء سے علاج منع ہے''۔

البحرالرائق میں ہے:

لایجوز التداوی بالمحرم فی ظاهر المذهب

''یعنی مذہب حنفی ظاہر الروایہ میں حرام چیز سے علاج کرنا جائز نہیں ہے''۔

درمختار کتاب الحظر والاباحۃ میں ہے:

وجاز الحقنة للتداوی بطاهر لا بنجس وکذا کل تداو لایجوز الا بطاهر۔

''دوا کی غرض سے حقنہ پاک چیز سے جائز ہے، ناپاک سے نہیں، اسی طرح کوئی علاج ناپاک چیز سے جائز نہیں ہے''۔

عالمگیری میں ہے:

تکره ابوال الابل ولحم الفرس للتداوی کذا فی الجامع الصغیر

''اونٹ کا پیشاب اور گھوڑے کا گوشت دوا کے لئے بھی منع ہے امام محمد کی ''الجامع الصغیر'' میں یہ مسئلہ ایسا ہی درج ہے''۔

قال له الطبیب الحاذق علتک لا ترتفع الا باکل...... اوالحیة اودواء یحل فیه الحیة، لایحل اکله۔

''یعنی اگر کوئی ماہر حکیم یہ کہے کہ تیرا مرض سانپ کھانے سے یا ایسی دوا کھانے سے جائے گا جس میں سانپ ملا ہوا ہو، تو اس دوا کا کھانا حلال نہیں ہے''۔

تکره البان الاتان للمرض وغیره وکذلک لحومها وکذلک التداوی حرام۔

''گدھی کا دودھ اور گوشت مرض میں بغرض علاج استعمال کرنا مکروہ تحریمی ہے اور اسی طرح حرام اشیاء سے علاج حرام ہے''۔ (بحوالہ فتاویٰ قاضی خان)

لایجوز ان یداوی بالخمر جرحا او دبردابة ولا ان یسقی ذمیا ولا ان یسقی صبیا للتداوی والوبال علیٰ من سقاہ۔

"شراب سے کسی انسانی زخم یا جانور کی زخمی پیٹھ کا علاج جائز نہیں ہے، اور شراب کافر کو بھی پلانا جائز نہیں، اور دوا کے لئے بچے کو بھی پلانا ناجائز ہے، اور بچے کو پلانے کا وبال پلانے والے پر ہوگا"۔

اب موجودہ زمانے میں خون روکنے کے متبادل جدید، مجرب اور انتہائی موثر طُرُقِ علاج موجود، معلوم اور دستیاب ہیں، اس لئے فقہاء کرام کی ان شرائط کے تحت تو اب حالتِ اضطرار میں اس طریقے کو اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں ہے اور وہ فقہاء کرام اس دور میں موجود ہوتے تو خود بھی اپنی شرائط کے تحت اس کے قطعی ناجائز ہونے کا قول کرتے۔ لہٰذا اب کسی شخص کا ان عبارات پر حرف زنی کرنا دیدہ ودانستہ بدنیتی، شرارت وخباثتِ نفس اور سادہ لوح مسلمانوں کو ان جلیل القدر فقہاء سے بدظن کرنا ہے اور یہ ہرگز دین کی خدمت نہیں ہے بلکہ دین کے خلاف فتنہ انگیزی ہے۔

چونکہ اصل بحث لوٹ کر پھر تعویذ کے مسئلے پر آئے گی، اس لئے اب ہم نفسِ مسئلہ پر بھی گفتگو کریں گے اور علامہ ابنِ عابدین شامیؒ کی جو توجیہ امام احمد رضا قادری نے کی ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوئے عام قارئین کی سہولتِ فہم کے لئے اس کو سہل انداز میں بیان کریں گے اور آخر میں اس بحث کا تتمہ بیان کریں گے۔

تعویذ لکھتے وقت یہ چیز ملحوظ رکھنی چاہئے کہ پاک چیز سے تعویذ لکھا جائے، کسی ناپاک چیز سے تعویذ لکھنا جائز نہیں ہے، بعض لوگ مرغ کے خون سے تعویذ لکھتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے، ہر جاندار کا ذبح کے وقت بہنے والا خون ناپاک ہے، اور ناپاک چیز کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور اللہ تعالیٰ کے اسماء لکھنا جائز نہیں ہے، یہ مسئلہ مسلّمہ اور متفق علیہ ہے۔ لیکن علامہ ابن عابدین شامی کی مندرجہ بالا عبارت بظاہر اس کے خلاف ہے اور بعض غیر مقلدین اسے پروپیگنڈے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور استعمال کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے اکابر علماء سے بھی ایسی باتوں کا صدور ہوا ہے، چنانچہ "فتاویٰ اہلحدیث" میں جناب عبداللہ امرتسری روپڑی صاحب ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

"قضیب گاؤ" (یعنی بیل کا آلۂ تناسل) حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے مگر یہ مذہب صحیح نہیں ہے

بلکہ ماکول اللحم (یعنی جن جانوروں کا گوشت حلال ہے) کا گوبر پیشاب تک پاک اور حلال ہے"۔ (فتاویٰ اہلحدیث ج ۲ ص ۵۶۶) اسی فتاویٰ کی جلد اول صفحہ ۲۴۰ پر "منی" کے پاک ہونے کا بھی قول ہے۔

اب اگر کوئی کسی غیر مقلد سے کہے کہ حضور آئیے! ہم آپ کی دعوت کرتے ہیں، بیل کے آلۂ تناسل کے تکے، گائے کے گوبر کے حلوے اور گائے کے پیشاب کے شربت پر مشتمل خصوصی خوانِ نعمت (SPECIAL MENU) آپ کی تواضع کے لئے چنا جائے گا، تو وہ یقیناً اس پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور اسے اپنی توہین پر محمول کریں گے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر نے مسائل کے تتبع میں جو بعض جزئیات، وقوع کے طور پر نہیں بلکہ کہیں امکان اور کہیں فرضِ محال کی تقدیر پر تحریر کردی ہیں، تو انہیں پروپیگنڈے کے لئے استعمال نہ کیا جائے، ممکن ہو تو اس کی بہتر تاویل کردی جائے، ورنہ سکوت اختیار کیا جائے، ان باتوں کا ذکر کرکے عامۃ الناس کو دین سے متنفر کرنے کے لئے استعمال نہ کیا جائے، ہر بات کا اپنا محل ہوتا ہے، مخصوص سیاق وسباق ہوتا ہے، تاویلات وتوجیہات ہوتی ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی بڑے عالم یا فقیہ کی کسی بات کی قابلِ قبول توجیہ وتاویل نہ ہوسکے تو زَلّت (غیر ارادی لغزش یا اجتہادی خطاء) تو کسی سے بھی ہوسکتی ہے، ہم انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے علاوہ کسی اور کی عصمت کے قائل نہیں ہیں۔

اب آئیے! علامہ ابن عابدین شامی کی محولہ عبارت ملاحظہ کریں:

اختارہ صاحب الہدایۃ فی التجنیس فقال: لو رعف فکتب الفاتحۃ بالدم علیٰ جبھتہ وانفہ جاز للاستشفاء بالبول ایضا ان علم فیہ شفاء لکن لم ینقل و ھذا لان الحرمۃ ساقطۃ عند الاستشفاء کحل الخمر والمیتۃ للعطشان والجائع آہ من البحر۔

"ناپاک چیزوں سے علاج کرنا جائز ہے، صاحب ہدایہ نے "تجنیس" میں یہی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: اگر کسی آدمی کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس نے خون کے ساتھ اپنی ناک اور پیشانی پر سورہ فاتحہ کو لکھ دیا تو یہ طلبِ شفاء کے لئے جائز ہے، اور اگر یقین ہو کہ پیشاب کے ساتھ لکھنے سے شفاء ہوگی تو پیشاب کے ساتھ لکھنا بھی جائز ہے، لیکن یہ منقول نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ طلب شفاء کی وجہ سے حرمت ساقط ہوجاتی ہے،

جیسے بھوک اور پیاس کے لئے مردار کھانا اور شراب پینا حرام نہیں ہے''۔

(ردالمحتار، ج۱، ص ۳۲۵، داراحیاء التراث العربی)

امام احمد رضا قادری اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اگر اللہ تعالیٰ نظرِ غائر، دقت شناس نصیب فرمائے تو عند التحقیق اس کلامِ علماء کا مرجع و مآل صاف ممانعت ہے نہ کہ تجویز و اجازت، کہ وہ شرط فرماتے ہیں کہ جب اس سے شفاء ہو جانا معلوم ہو حالانکہ اس علم کا کوئی ذریعہ نہیں، اگر علم بمعنی یقین لیجئے جب تو ظاہر کہ تعین تو ظاہر و واضح و مجرب و معقول الاثر دواؤں میں بھی نہیں، نہایت کار ظن ہے، اسی ردالمحتار میں ہے:

قد علمت ان قول الاطباء لایحصل به العلم

''لیکن آپ کو معلوم ہے کہ قولِ اطباء سے علم (یقینی) حاصل نہیں ہوتا''۔

اگر ظن کو بھی شامل کیجئے تو یہ غایت درجہ از قبیل رقیہ ہوگا (یعنی دم، تعویذ وغیرہ، راقم) نہ از قبیل معالجاتِ واضحہ طبیہ، اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ ایسے معالجات سے شفاء معلوم ہونا درکنار، مظنون بھی نہیں، صرف موہوم ہے۔

اسی عالمگیری میں فصول عمادی سے ہے:

الاسباب المزیلة للضرر تنقسم الیٰ مقطوع به کالماء للعطش والخبز للجوع، ومظنون کالفصد و الحجامة و شرب المسهل و سائر ابواب الطب یعنی معالجة البرودة بالحرارة والحرارة بالبرودة وهی الاسباب الظاهرة وموهوم کالکی والرقیة.

''وہ اسباب جو ضرر کو دور کرتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک قطعی (یقینی) جیسے پیاس کے ازالے کے لئے پانی اور بھوک کے ازالے کے لئے روٹی، اور دوسری ظنی، جیسے پچھنا اور سینگی لگانا، دست آور دوا کا پینا اور (اس طرح کے) باقی ابوابِ طب جیسے ٹھنڈک کا علاج گرمی سے اور گرمی کا علاج ٹھنڈک سے، یہ (سب تو) ظاہری اسباب ہیں اور (کچھ دوسرے) موہوم ہیں، جیسے داغنا اور تعویذ، دم وغیرہ''۔

تو دیکھو علماء نے تصریح فرمائی کہ یہ لکھنا جب جائز ہوگا کہ اس سے شفاء معلوم ہو اور ساتھ یہ بھی تصریح فرمائی کہ اس سے شفاء معلوم نہیں۔ تو کیا حاصل یہ نکلا کہ یہ لکھنا جائز ہے، یا یہ کہ ہرگز

جائز نہیں۔

صحیح حدیث میں ہے حضور اقدس ﷺ سے دربارۂ رمل سوال ہوا، ارشاد فرمایا:

کان نبی من الانبیاء یخط فمن وافق خطه فذاک. رواہ مسلم فی صحیحه واحمد و ابوداؤد و النسائی عن معاویة بن الحکم رضی الله عنه.

''ایک نبی خط کھینچا کرتے تھے، تو جن کی لکیریں ان کے خطوط سے موافق ہوں تو ٹھیک ہے''۔

اب اس حدیث سے ٹھہرا دینا کہ نبی کریم ﷺ نے رمل پھینکنے کی اجازت دی ہے، غلط ہے، حالانکہ حدیث صراحتاً مفید ممانعت ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اس کا جواز موافقت خط انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم سے مشروط فرمایا اور وہ معلوم نہیں، تو جواز بھی نہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ کتاب الصلوٰۃ باب تحریم الکلام میں زیرِ حدیث مذکور فرماتے ہیں:

معناہ من وافق خطه فهو مباح له ولکن لا طریق لنا الی العلم الیقینی بالموافقة فلایباح والمقصود انه حرام، لانه لایباح الا بیقین الموافقة و لیس لنا یقین بها

''اس کا معنی یہ ہے کہ جس کا خط اس نبی کے خط کے موافق ہو جائے، وہ مباح ہے، لیکن چونکہ ہمارے پاس اس موافقت کے علمِ یقینی کو حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں، تو رمل جائز نہیں اور مقصود یہ ہے کہ وہ حرام ہے، کیونکہ موافقتِ نبی کے علمِ یقینی کے بغیر اباحت (جواز) ثابت ہو نہیں سکتی اور علمِ یقینی ہمارے پاس ہے ہی نہیں''۔

یعنی مقصود تحریم رمل ہے کہ اباحت بشرط موافقت ہے اور وہ نامعلوم تو اباحت (جواز) معدوم۔

علامہ ملا علی القاری شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

حاصله ان فی هذا الزمان حراما لان الموافقة معدومة اوموهومة.

''یعنی حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس زمانے میں (رمل) حرام ہے کیونکہ (علمِ یقینی نہ ہونے کے سبب) موافقت یا تو بالکل ہی معدوم ہے اور یا اس کا امکان وہم کے درجے میں ہے''۔

اسی مفہوم پر مشتمل اعلیٰ حضرت نے امام ابنِ حجر کا بھی حوالہ دیا ہے۔
(فتاویٰ رضویہ، ج۱۰، ص۱۱۳، مکتبۂ رضویہ۔ کراچی)

امام احمد رضا قادری کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی "برتقدیر فرضِ محال" کسی بات کی کسی شق پر یا کسی مسئلے کے کسی جزئیے کو بیان کردیا جاتا ہے، یہ اہلِ علم کا ایک طریقہ ہے، یا "تعلیق بالمحال" کے طور پر کبھی کسی بات کو محالِ عادی یا محالِ عقلی پر محمول کرکے اس کے عدمِ جواز یا عدمِ امکان کو بیان کردیا جاتا ہے، اور خود قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں ایسی مثالیں بکثرت ملیں گی۔ قرآن نے تو "تعددِ الٰہ" کے محالِ عقلی ہونے کو بھی اس طرح عقلی انداز میں بیان کیا ہے:

لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبیاء:۲۲)

اگر اس زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہوتا تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہوجاتا"۔

محض بیانیہ انداز میں نہیں فرمایا کہ شریکِ باری تعالیٰ عقلاً محال ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے ولد کی نسبت کے محال ہونے کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (الزخرف:۸۱)

"(اے حبیب!) آپ کہہ دیجئے کہ اگر (بفرضِ محال) ذاتِ رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے میں (اس کی) عبادت کرتا"۔

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی زبانی (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد ہونے کے امکان کو بیان نہیں کیا بلکہ اس کے محال ہونے کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح علامہ ابنِ عابدین شامی نے بھی (معاذ اللہ!) پیشاب یا خون سے آیتِ قرآن لکھنے کے عدمِ جواز کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ کسی کے پاس بھی علم یقینی نہیں ہے کہ اس سے شفاء نصیب ہوجائے گی، لہٰذا یہ علی الاطلاق ناجائز ہے۔

اس کے باوجود ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ کاش ہمارے اَجلّہ فقہاء کرام اور علامہ ابنِ عابدین شامی "علاج بالحرام" کا مسئلہ بیان کرنے کے لئے دیگر مثالوں کے ذکر پر ہی اکتفاء کرلیتے اور اس میں خون وغیرہ سے فاتحہ لکھنے کا ذکر ہی نہ کرتے۔

رہا یہ سوال کہ علامہ شامی کا حکم کیا ہے؟ تو وہ ہمارے مقتدا ہیں، پیشوا ہیں، امتِ مسلمہ اور فقہاء

امت آج بھی ان کے خوشہ چین ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ہم نے امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ان کی زیرِ بحث عبارت کی توجیہات وتاویلات درج کردی ہیں، وہ اس کا کافی وشافی جواب ہے۔ تاہم اگر کسی عظیم فقیہ سے خطاءِ اجتہادی بھی سرزد ہوجائے تو اس سے اس کے ایمان، تقویٰ اور جلالتِ علمی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں علامہ غلام رسول سعیدی کے یہ الفاظ ہم سب کی عقیدت کے ترجمان ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ خون یا پیشاب کے ساتھ فاتحہ لکھنے والے کا ایمان خطرے میں ہے، اگر (بفرضِ محال) کسی آدمی کو روزِ روشن سے زیادہ یقین ہو کہ اس عمل سے اس کو شفاء مل جائے گی، تب بھی اس کا مرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ خون یا پیشاب کے ساتھ سورہ فاتحہ لکھنے کی جرأت کرے، اللہ تعالیٰ ان فقہاء کو معاف فرمائے، بال کی کھال نکالنے اور جزئیات مستنبط کرنے کی عادت کی وجہ سے ان سے یہ ناپسندیدہ قول سرزد ہوگیا، ورنہ ان کے دلوں میں قرآن مجید کی عزت وحرمت بہت زیادہ تھی، ان کی تو ساری زندگی قرآن وحدیث کو سمجھنے سمجھانے اور ان کی ناموس کے تحفظ میں گزری ہے، (شرح صحیح مسلم، ج۶، ص۵۵۷) فقط واللہ تعالیٰ ورسولہ اعلم بالصواب۔

رجب کے کونڈے

سوال: کیا رجب کے کونڈے جائز ہیں؟ بعض لوگ بڑے التزام کے ساتھ ان کا اہتمام کرتے ہیں؟ (منور احمد۔ ملیر، کراچی)

جواب: فی نفسہ فاتحہ اور ایصالِ ثواب کسی بھی بزرگ شخصیت کے لئے یا عام مسلمانوں کے لئے (خواہ مرد ہو یا عورت، زندہ ہوں یا وفات پاچکے ہوں) ہر وقت اور ہر جگہ جائز ہے، سوائے اس کے کہ کسی اور وجہ سے اس کی شرعی ممانعت نہ ہو، مثلاً مکروہ اوقات میں ایصالِ ثواب کے لئے نوافل پڑھنا یا عیدین کے ایام میں ایصالِ ثواب کی نیت سے روزے رکھنا وغیرہ، عام طور پر کونڈوں کی فاتحہ امام جعفر صادق کے نام پر دی جاتی ہے اور یہ ۲۲رجب المرجب کو دی جاتی ہے۔ اگرچہ ۲۲رجب نہ تو امام جعفر صادق کی تاریخِ ولادت ہے اور نہ ہی تاریخِ وفات، لیکن تاریخِ ولادت ووصال کے علاوہ بھی ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ دی جاسکتی ہے۔ ہاں البتہ اگر

عقیدہ یہ ہو کہ:

(۱) ۲۲/رجب سے پہلے یا بعد میں یہ فاتحہ نہیں دی جاسکتی بس اسی دن اور تاریخ میں اہتمام لازمی ہے۔

(۲) ایک خاص مقام پر کونڈے یا کھانا رکھ کر فاتحہ دی جاسکتی ہے۔ دوسری جگہ پر نہیں یا خاص کونڈوں کے علاوہ کسی اور حلال چیز پر فاتحہ نہیں دی جاسکتی، تو ایسا تعین دلیل شرعی کے بغیر ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ تعینِ شرعی جس میں کسی خاص وقت، دن، تاریخ، جگہ اور چیز کے التزام پر حصولِ اجر و ثواب کو موقوف قرار دیا جائے، صرف شارع کا حق ہے۔

باقی امام جعفر صادق اہل بیتِ اطہار سے ہیں، ہمارے مقتدا ہیں اور ان کے ایصالِ ثواب کے لئے بشمول ۲۲/رجب کسی بھی دن فاتحہ جائز ہے۔ ایک اور مسئلے کی وضاحت بھی ضروری ہے وہ یہ کہ تعینِ شرعی کے بغیر سہولت کے لئے فاتحہ کا دن مقرر کرنا اسی طرح جائز ہے جیسے ہم اپنی دنیوی اور سماجی تقریبات کے لئے ایام کا تعین کرتے ہیں۔ جیسے شادی، نکاح، ولیمہ وغیرہ، اسی طرح بزرگانِ دین کے ایامِ وصال کو اعراس اور ایصالِ ثواب کے لئے مقرر کر دیتے ہیں تاکہ سب لوگوں کو علم ہو جائے۔ دینی کاموں میں ختمِ قرآن اور دینی مدارس کے دستارِ فضیلت اور تقسیم اسناد کے جلسے وغیرہ ہیں۔ امام احمد رضا خان قادری نے اپنے رسالہ اتیان الارواح میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دیگر حوالہ جات کے ساتھ لکھا ہے کہ اموات کی ارواح ہر شب جمعہ و روزِ عید و عاشورہ و شب برات کے مواقع پر اپنے مکانات پر آتی ہیں اور غمگین آواز میں صدا دیتی ہیں کہ اے میرے آل و اولاد اور قرابتدارو! میرے ایصالِ ثواب کے لئے صدقہ دے کر مجھ پر مہربانی کرو، (فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۲۳۱)۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اگرچہ ان میں بعض روایات ضعیف ہیں لیکن سب ضعیف نہیں ہے۔

نوٹ: امام جعفر صادق کی تاریخ وصال کی بابت مشہور قول یہ ہے کہ ماہ شوال میں ہے اور ایک قول کی رو سے ۱۵/رجب ہے۔ (بحوالہ جلاء العیون ملا باقر مجلسی)

اجتماعی قرآن خوانی

سوال: ایک اخبار میں سائل نے مفتی صاحب سے سوال پوچھا کہ: ''لوگوں کو باقاعدہ دعوت

دے کر اجتماعی قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟'' مفتی صاحب نے جواب لکھا کہ ''ایصالِ ثواب کی غرض سے دعوت دے کر لوگوں کو جمع کر کے قرآن خوانی کرانا درست نہیں۔'' ہمارے معاشرے اور خاص طور پر کراچی شہر میں یہ عام معمول ہے کہ اجتماعی قرآن خوانی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حصولِ ثواب و خیر و برکت کے لئے بھی، ایصالِ ثواب کے لئے بھی۔ تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا عامۃ المسلمین کا یہ طرزِ عمل شرعاً جائز اور درست ہے؟ جیسا کہ عامۃ المسلمین ایسا سمجھ کر کرتے ہیں، یا درست نہیں، جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا ہے۔ ازراہِ کرم کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں تاکہ لوگوں کا اضطراب دور ہو اور ان کی تشفی ہو سکے؟

(سید نذیر احمد شاہ (خطیب جامع مسجد ابوبکر) میٹروول III گلشن اقبال، کراچی)

جواب: ایصالِ ثواب، حصولِ ثواب اور خیر و برکت کے لئے اجتماعی طور پر قرآن خوانی کرنا، دعا کا اہتمام کرنا شرعاً درست ہے۔ کارِ خیر کے لئے لوگوں کو دعوت دینا باعثِ سعادت اور موجبِ خیر و برکت ہے۔ تبلیغی اجتماعات، میلاد النبی ﷺ کے اجتماعات، ختمِ قرآن، افتتاحِ درسِ حدیث اور ختمِ بخاری کے اجتماعات جو تمام مکاتبِ فکر کے لوگ باقاعدہ دعوت دے کر منعقد کرتے ہیں، اس کے لئے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں اور اخبارات میں اعلانات شائع ہوتے ہیں، یہ سب اور قرآن خوانی یا درسِ قرآن کے لئے اجتماع بالکل جائز اور درست ہے۔ ان امورِ خیر کے لئے دن، مقام اور وقت کا تعین سہولت کی غرض سے ہوتا ہے۔ یہ تعینِ عرفی ہے، تعینِ شرعی نہیں ہے۔ تعینِ شرعی سے مراد یہ ہے کہ کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اس خاص وقت، مقام، دن اور تاریخ کو یہ کام کرنا باعثِ اجر و ثواب ہے اور اس سے قبل یا بعد یا دوسرے وقت اور مقام پر ایسا کرنا باعثِ اجر نہیں ہے۔ یہ تعینِ شرعی ہے اور ایسی تعین صرف شارع کا اختیار ہے جیسے وقوفِ عرفہ کے لئے ۹/ذوالحجہ، ایامِ نحر یا ایامِ عید وغیرہ۔

اب چند احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سہولت کے لئے دینی اجتماعات منعقد ہو سکتے ہیں خواہ یہ دعوتِ اجتماعِ تبلیغ کے لئے ہو یا قرآن خوانی کے لئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ وعظ و نصیحت کے ایام مقرر کرنے میں ہمارا خیال رکھا کرتے تھے کیونکہ جو چیز ہمارے لئے تنگی کا باعث ہو، وہ آپ ﷺ کو پسند نہیں تھی۔ (صحیح بخاری، ج ۱ ص ۱۶)

حضرت ابووائل کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہر جمعرات کو ہمیں وعظ فرمایا کرتے تھے تو ایک شخص نے ان سے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میری خواہش ہے کہ آپ ہمیں روزانہ وعظ فرماتے انہوں نے جواباً فرمایا: ''میرے لئے تمہاری اس خواہش کی تکمیل و تعمیل سے یہ امر مانع ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ (روزانہ مجالسِ وعظ منعقد کرکے) تمہارے اکتاہٹ اور طبیعت کے اچاٹ ہونے کا سبب بنوں۔ میں وعظ و نصیحت کے معاملے میں تمہارا اسی طرح خیال رکھتا ہوں (اور اعتدال سے کام لیتا ہوں)، جس طرح نبی کریم ﷺ ہمارا خیال رکھا کرتے تھے، تاکہ ہمارے لئے تنگی کا باعث نہ بنے، (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶)

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مجالسِ وعظ و تذکیر ہوں یا مجالسِ قرآن خوانی ان کے انعقاد میں عام لوگوں کی طبائع، احوال اور مصروفیات و مشاغل کا لحاظ رکھنا چاہئے تاکہ لوگوں پر بار نہ رہے اور ان کی طبیعتوں میں کارِ خیر سے اکتاہٹ، تنگی اور بے زاری پیدا نہ ہو۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خواتین نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ مرد حضرات نے آپ سے فیض پانے میں ہم پر غلبہ حاصل کرلیا ہے، لہٰذا آپ ازراہِ کرم ہمارے لئے ایک خاص دن مقرر فرمادیجئے (جس میں مرد نہ ہوں اور ہم آپ سے فیض حاصل کریں)، آپ ﷺ نے ان سے ایک دن مقرر کرنے کا وعدہ فرمالیا، اس دن آپ ان (خواتین صحابیات) کو وعظ فرماتے اور احکام شرعی بیان فرماتے، انہی وعظ کے دوران آپ نے ان سے فرمایا: ''جس خاتون کے تین بچے اس سے پہلے (یعنی بچپن میں) وفات پاگئے تو وہ اس کے لئے نارِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گے۔ ایک صحابیہ نے عرض کیا (یارسول اللہ ﷺ) اگر کسی کے دو بچے وفات پاگئے ہوں، آپ نے فرمایا (ہاں) دو بچے بھی نارِ جہنم سے نجات کا وسیلہ بن جائیں گے (یعنی اگر مائیں اپنے ان بچوں کی وفات کے غم اور صدمہ فراق کو صبر و شکر سے برداشت کرلیں)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مجلس وعظ ہو یا قرآن خوانی کا اجتماع، شرکاء سامعین کی سہولت کے لئے دعوت دینا اور اس کے لئے اجتماعی اہتمام کرنا جائز اور کارِ ثواب ہے۔

قبر بیٹھ جائے تو کیا کریں؟

سوال: بعض اوقات زمین نرم ہونے کی وجہ سے، بارش کا پانی جذب ہوجانے کی وجہ سے یا کسی

بھی سبب سے قبر بیٹھ جاتی ہے، ایسی صورتحال میں کیا کیا جائے، میت کو نکال کر دوسری جگہ دفن کریں یا اگر مٹی ڈال دیں تو قبر کا نشان تک باقی نہیں رہتا، (عبداللہ خان۔ کورنگی، کراچی)

جواب: میت کی تدفین کے بعد قبر کھودنے کو فقہاء احناف نے ممنوع و حرام قرار دیا ہے، چند فقہی حوالے ملاحظہ فرمائیے: تدفین کے بعد میت کو قبر سے نکالنا نہیں چاہئے، ہاں اگر زمین غصب شدہ ہے یا اسے کسی نے شفعہ کرکے حاصل کرلیا ہے تو مالک زمین کے مطالبے پر میت کو وہاں سے منتقل کرنا جائز ہوگا، (فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷)

میت کو دفن کرنے سے پہلے (جہاں چاہیں) منتقل کرسکتے ہیں، لیکن اسے دفن کرنے کے بعد مطلقاً منتقل کرنے کی اجازت نہیں ہے، (فتاویٰ شامی ج ۳ ص ۱۳۷، داراحیاء التراث العربی بیروت)

علامہ حسن بن عمار شرنبلالی لکھتے ہیں: ''اور میت کو دفن کرنے کے بعد منتقل کرنا جائز نہیں ہے، سوائے اس صورت کے کہ دوسرے کی غصب شدہ زمین میں دفن ہو (اور وہ اپنی زمین کو خالی کرنے کا مطالبہ کرے)''۔

اس کی شرح میں علامہ طحطاوی لکھتے ہیں: ''مضمرات میں ہے کہ دفن کرنے کے بعد میت کے منتقل کرنے کی تین صورتیں ہیں: ایک صورت میں بالاتفاق منتقل کرنا جائز ہے اور وہ یہ کہ میت کو غصب شدہ زمین میں دفن کردیا گیا ہو اور زمین کا مالک اپنی زمین کے انخلاء کا مطالبہ کرے یا غصب شدہ کپڑے کا کفن میت کو پہنادیا گیا ہو اور مالک کپڑے کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ دوسری صورت میں بالاتفاق ناجائز ہے، مثلاً یہ کہ ماں کہے مجھے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنا ہے، لہٰذا قبر کو کھودو یا اسے یہاں سے نکال کر فلاں قبرستان میں دفن کرو۔ تیسری صورت یہ ہے کہ قبر میں پانی داخل ہوجائے ایک قول کی رو سے اس صورت میں میت کا منتقل کرنا جائز ہے، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ صالح بن عبیداللہ کو تین بار کسی نے خواب میں دیکھا، وہ کہہ رہے تھے، مجھے میری قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کرو، مجھے پانی آنے سے تکلیف ہورہی ہے، پھر قبر کو کھود کر دیکھا گیا تو ان کے ایک پہلو کو پانی پہنچ چکا تھا، اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کی قبر کو منتقل کرنے کا فتویٰ دیا۔ فقیہ ابوجعفر کہتے ہیں کہ ایسی صورتحال میں قبر کو منتقل کرنا جائز ہے، لیکن پھر انہوں نے اپنی اس رائے سے رجوع کرلیا اور قبر کی منتقلی سے وہ منع کرتے تھے، (طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۶۱۵، مکتبہ عباس احمد الباز، مکہ مکرمہ)۔

علامہ کاسانی حنفی بدائع الصنائع ج ۲ ص ۳۵۷ میں لکھتے ہیں: ''قبر کا کھودنا حرام ہے۔''
علامہ زین الدین ابن نجیم نے البحر الرائق (ج ۲ ص ۱۹۵ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ) میں اس قول کو نقل کیا ہے جو ان کی تائید کی دلیل ہے۔ لہٰذا ائمہ کرام کے ان اقوال کی روشنی میں نہ تو تدفین کے بعد قبر کو کھودنا جائز ہے اور نہ ہی میت کو قبر سے منتقل کرنا۔ ہاں اگر خدانخواستہ کسی کی قبر بیٹھ جائے تو قبر کو کھولے بغیر باہر اور اطراف سے اسے ٹھیک کرکے بنادیں۔ میت عالمِ برزخ میں، جس حال میں بھی ہے یا اس پر جو بھی تغیرات رونما ہوئے ہیں، اس کے حال پر پردہ پڑا رہے گا، یہ بات بھی جواز کی حد تک ہے، ایسا کرنا ضروری بھی نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۱۶۷ پر ہے: ''میت بوسیدہ ہوکر مٹی بن گئی ہو تو دوسری میت کو اس کی قبر میں دفن کرنا جائز ہے، اسی طرح اس جگہ پر کاشت کرنا اور اس پر تعمیر بھی جائز ہے، تبیین الحقائق میں اسی طرح ہے۔'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عامۃ المسلمین کی قبور یا ان کے آثار اور نشاناتِ قبر کو ہر حال میں باقی رکھنا شریعت کی رو سے ضروری نہیں ہے۔

غیر آلِ ابوبکر صدیق کا اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھنا

سوال: ایک شخص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد یعنی سلسلۂ نسب میں سے نہیں ہے اور وہ اپنے نام کے ساتھ ''صدیقی'' لکھتا ہے، کیا اس کا یہ عمل شرعاً درست ہے؟

(محمد الیاس۔ گرین ٹاؤن، کراچی)

جواب: لفظ ''صدیقی'' میں ''ی'' نسبت کی ہے یعنی اس کے معنی ہیں ''ایسا شخص جو صدیق کی طرف منسوب ہے'' اور یوں تو لغتِ عرب میں ''صدیق'' کے معنی ہیں ''نہایت سچا'' لیکن ''صدیق'' حضرت ابوبکر بن عثمان رضی اللہ عنہما کا لقب بھی تھا جو بارگاہِ رسالت سے انہیں عطا ہوا تھا اور یہ بات حدِ شہرت وتواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ عرفِ عام میں ''آلِ ابی بکر'' کو ''صدیقی'' کہا جاتا ہے یا وہ اپنے آپ کو ''صدیقی'' کہتے اور کہلاتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ بربنائے محبت بھی ''یائے نسبتی'' لگا کر اپنے آپ کو کسی بزرگ شخصیت یا سلسلے کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، جیسے قادری، چشتی، نقشبندی وغیرہ یا پاکستان میں قادیانی اپنے آپ کو ''احمدی'' کہلاتے ہیں۔ اسی طرح ایران میں ''بہائی'' ہیں۔ کوئی ایسا شخص جو ''آلِ ابی بکر'' میں سے نہیں ہے اگر یہ تاثر دینے کے لئے یا اس

ادعاء کی بنا پر اپنے آپ کو ''صدیقی'' لکھتا ہے کہ لوگ اسے ''آلِ ابی بکر'' میں سے سمجھیں اور اس نسبت کی بنا پر اس کی تکریم کریں تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:
''جس شخص نے قصداً اپنا سلسلۂ نسب اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا تو اس پر جنت حرام ہے۔'' (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۴۳۲۷، سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۵۱۱۳، سننِ ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۶۱۰، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۶۵)

یہ بڑی وعید ہے، محض دنیوی تکریم واعزاز کے لالچ میں اپنی نسبت میں رد وبدل کرنے والوں کو آخرت کے عذاب اور جنت سے محرومی کی وعید سے ہزار بار ڈرنا چاہئے۔ البتہ اگر کوئی شخص محض اظہارِ محبت کے لئے اپنے آپ کو صدیقی لکھتا یا کہلاتا ہے اور ''نسبِ ابی بکر'' کی طرف نسبت کا ادعا نہیں کرتا تو یہ جائز ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ پھر وہ اپنے صحیح نسب کے اظہار کے لئے کوئی اور نسبت بھی لگالے یا اپنے حلقۂ اثر اور حلقۂ احباب میں وقتاً فوقتاً اپنے صحیح نسب کا ذکر کردیا کرے تاکہ لوگ اور ان کے ملنے جلنے والے انہیں ''آلِ ابی بکر'' میں سے نہ سمجھیں۔

جس کا کوئی پیر نہ ہو، کیا اس کا پیر شیطان ہوتا ہے؟

سوال: ایک مولانا صاحب کا کہنا ہے: ''جس کا کوئی پیر نہیں ہوتا، اس کا پیر شیطان ہوتا ہے۔'' اس قول کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ (عبداللہ...... دستگیر کالونی، کراچی)

جواب: اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص پیر ماننے کو لازمی قرار دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ:

مَنْ لاشیخ له فی الدنیا فشیخه الشیطان فی الآخرة۔

''جس شخص کا دنیا میں کوئی شیخ نہیں ہے، اس کا آخرت میں شیطان شیخ ہوگا''۔

یعنی (معاذ اللہ!) اس کا حشر گروہِ شیطان میں ہوگا۔ وہ یہ حدیث بھی بیان کرتا ہے کہ:

الشیخ فی قومه کالنبی فی الامة۔

''یعنی شیخ (پیر) کا اپنی قوم میں وہی مقام ہے جو نبی کا امت میں ہوتا ہے''۔

اس کے برعکس دوسرا شخص کہتا ہے کہ میں کسی شخص سے بیعت نہیں ہوں اور نماز پڑھتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں، احکامِ شرع شریف اور کلام مجید کو اور جو علماءِ دین فرماتے ہیں برحق جانتا ہوں،

لیکن کسی پیر فقیر کا مرید نہیں ہوں اور نہ مرید ہونے کو برا کہتا ہوں، تو کیا اس شخص کی کوئی عبادت بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہے، مرید نہ ہونے کی بنا پر ساری عبادت اکارت گئی اور اس کا حشر کیا شیطان کے ساتھ ہوگا، وغیرہ۔"

نوٹ: یہ سوال کتاب "بیعت وخلافت" تصنیف امام احمد رضا قادری مطبوعہ مکتبہ مہریہ رضویہ ڈسکہ صفحات ۲۶۔۲۷ پر درج ہے، سوال کافی طویل ہے، یہاں خلاصہ درج کیا گیا ہے۔

اسی طرح "فتاویٰ افریقہ" تصنیف امام احمد رضا قادری صفحہ نمبر ۱۳۸ پر دو سوالات (۸۳، ۸۴) کو یکجا کر کے یوں درج کیا گیا ہے:

"اگر زید کا پیر و مرشد نہ ہو تو وہ فلاح پائے گا یا نہیں اور اس کا پیر و مرشد شیطان ہوگا یا نہیں، کیونکہ تمہارا رب عزوجل حکم فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (المائدہ: ۳۵)

اے مومنو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو۔"

ان سوالات کا جواب جو امام احمد رضا قادری نے دیا ہے، اس کا خلاصہ اور ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں، وہ مرشد کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں، ایک مرشدِ عام اور دوسرا مرشدِ خاص، وہ لکھتے ہیں کہ شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ اپنی تصنیف "عوارف المعارف" میں فرماتے ہیں: میں نے اکثر مشائخ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "جس نے کسی فلاح یافتہ شخص کی زیارت نہ کی، وہ فلاح نہیں پائے گا۔" اسی طرح عوارف المعارف میں حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: "جس کا کوئی پیر نہیں اس کا امام شیطان ہے۔" امام ابوالقاسم قشیری نے بھی اپنی کتاب میں حضرت بایزید بسطامی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ الغرض یہ حدیث نہیں ہے بلکہ بزرگانِ دین کے اقوال ہیں اور یہ اقوال جن میں بظاہر مرشد سے وابستگی ضروری ہے اس سے "مرشدِ عام" مراد ہے اور اس کی وضاحت وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"عام ہادی کلام اللہ و کلام ائمہ شریعت وطریقت، کلام علماء اہلِ ظاہر و باطن ہے، اسی سلسلۂ صحیحہ پر کہ عوام کا ہادی کلام علماء، علماء کا رہنما کلامِ ائمہ، ائمہ کا مرشد کلام رسول، رسول کا پیشوا کلام اللہ (بیعت وخلافت صفحہ ۲۷)۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"سنی صحیح العقیدہ کہ ائمہ ہُدیٰ کو مانتا، تقلید ائمہ ضروری جانتا، اولیائے کرام کا سچا معتقد، تمام عقائد میں راہِ حق پر مستقیم، وہ ہرگز بے پیر نہیں، وہ چاروں مرشدان پاک یعنی کلام خدا اور رسول و ائمہ و علماء ظاہر و باطن اس کے پیر ہیں، بلکہ اگر اسی حالت پر ہے تو مثل اور لاکھوں مسلمانانِ اہلسنت کے اس کا ہاتھ شریعت مطہرہ کے ہاتھ میں ہے، اگرچہ بظاہر کسی خاص بندۂ خدا کے دست مبارک پر شرفِ بیعت سے مشرف نہ ہوا"۔

چند سطور کے بعد مزید لکھتے ہیں:

"ہزاروں علما و صلحا گزرے کہ بظاہر اس خاص طریقۂ بیعت میں ان کا انسلاک (منسلک ہونا، وابستہ ہونا) ثابت نہیں کیا، کیا معاذ اللہ! انہیں ان سخت احکام کا مصداق کہا جاسکتا ہے؟ اور جو منسلک بھی ہوئے، کیا سب ہوش سنبھالتے ہی منسلک ہوگئے تھے، حاشا بلکہ بہت اس وقت جب کہ علم ظاہر میں پایہ عالیہ امامت تک پہنچ چکے تھے، کیا اس وقت تک عیاذ اباللہ ان احکام کے مستحق تھے؟ یہ جہالتِ فاضحہ (رسوا کن) بلکہ ضلالتِ واضحہ ہے، والعیاذ باللہ تعالیٰ"۔ (بیعت وخلافت صفحہ ۲۹)

فتاویٰ افریقہ صفحہ نمبر ۱۳۹ پر لکھتے ہیں:

"فاقول و باللہ التوفیق، فلاح دو قسم ہے، اول انجام کار رستگاری (نجات)، اگرچہ معاذ اللہ! سبقتِ عذاب کے بعد ہو (یعنی ممکن ہے کچھ گناہوں کی سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی ملے)، یہ عقیدہ اہل سنت میں ہر مسلمان کے لیے لازم اور کسی بیعت و مریدی پر موقوف نہیں، اس کے واسطے صرف نبی کو مرشد بس ہے، بلکہ ابتداء اسلام میں کسی دور دراز پہاڑ یا گمنام ٹاپو کے رہنے والے غافل جن کو نبوت کی خبر ہی نہ پہنچی اور دنیا سے صرف توحید پر گئے بالآخر ان کے لیے بھی یہ فلاح ثابت، ...... (اس کے بعد انہوں نے شفاعت کبریٰ اور شفاعتِ کاملہ وکلی والی احادیث و روایات درج کی ہیں جن کی رو سے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طفیل ہر مومن جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا بلکہ ہر موحد آخر کار جنت میں جائے گا)۔ الغرض اولیاء کرام اور بزرگانِ دین کے قول کہ "جس کا کوئی پیر نہ ہو اس کا پیر شیطان ہے" کو اس معنی میں لینا، کہ معروف معنوں میں ہر مسلمان کے لیے کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کرنا لازم اور واجب ہے اور اس کے بغیر فلاحِ دینوی و نجاتِ اخروی ممکن ہی نہیں

ہے، بالکل غلط توجیہ وتاویل ہے، اور اس توجیہ کو امام احمد رضا قادری نے جہالت وضلالت سے تعبیر کیا ہے، اور ایسی سوچ اور فکر سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔

امام احمد رضا قادری سے سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا کہ: ''شیخ اپنی قوم میں ایسا ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں'' اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ ابن حبان نے کتاب الضعفاء اور دیلمی نے مسند الفردوس (جلد ۲، صفحہ نمبر ۳۷۷) میں حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا، اگرچہ امام ابن حجر عسقلانی اور ان سے پہلے ابن تیمیہ نے اسے موضوع اور امام سخاوی نے باطل کہا ہے، (ابن حبان میں کتاب الضعفاء میں اسے موضوع کہا ہے اور ابن جوزی نے اپنی موضوعات میں باطل کہا ہے۔ راقم) لیکن امام احمد رضا قادری علامہ سیوطی کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مگر صنیع امام جلیل جلال سیوطی سے ظاہر کہ وہ صرف ضعیف ہے، باطل وموضوع نہیں، انہوں نے یہ حدیث دووجہ سے جامع صغیر میں روایت کی۔

حیث قال الشیخ فی اهله کالنبی فی امته الخلیل فی مشیخته و ابن النجار عن ابی رافع الشیخ فی بیته کالنبی فی قومه حب (ای ابن حبان) فی الضعفاء والشیرازی فی الالقاب عن ابن عمر۔

''جیسے فرمایا کہ شیخ اپنے اہل یعنی اپنی قوم میں ایسے ہے جیسا کہ نبی اپنی امت میں، اور ابن النجار نے ابو رافع سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ شیخ اپنے گھر میں ایسے ہے جیسے نبی اپنی قوم میں، اسے ابن حبان نے الضعفاء میں اور شیرازی نے الالقاب میں ابن عمر سے روایت کیا ہے''۔

اور خطبۂ کتاب میں وعدہ فرمایا ہے کہ اس حدیث میں کوئی موضوع نہیں لاؤں گا۔

(بیعت وخلافت صفحہ ۳۰)

آگے چل کر لکھتے ہیں: ''مگر اس سے اس قدر ثابت کہ ہادیانِ راہِ خدا کی اطاعت لازم ہے، اس میں کلام ہے، اس کے لیے خود آیت کریمہ کافی ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اے ایمان والو! ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور ان کی جو تم

میں سے صاحب امر ہیں''۔ (النساء:۵۹)

قولِ اصح وارجح پر ''اولی الامر'' سے مراد علماء دین ہیں کہ علماءِ شریعت وطریقت دونوں کو شامل ہے، اس سے زیادہ اس کے یہ معنی نہیں کہ جس نے بیعت ظاہری کسی کے ہاتھ پر نہ کی، وہ گمراہ ہے، ہرگز مفادِ حدیث نہیں ہے، یہ افتراء وتہمت یا جہل وسفاہت ہے، والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

(خلافت وبیعت صفحہ نمبر ۳۰)

اس کے علاوہ معروف معنوں میں بیعت کی برکات کیا ہیں؟، فلاحِ ظاہری و باطنی سے کیا مراد ہے، بیعت کی اقسام کیا ہیں، شیخ طریقت کن اوصاف کا حامل ہونا چاہئے، فلاح کی اقسام وغیرہ، اس موضوع پر امام احمد رضا قادری نے فتاویٰ افریقہ میں صفحات ۱۳۸ تا ۱۶۰ پر تفصیل سے بحث کی ہے، اہلِ ذوق اس کا مطالعہ فرمائیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کے آداب

سوال: قرآن مجید کی تلاوت کے آداب کیا ہیں؟ آیا بے وضو یا حالت جنابت میں قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں، یا بے وضو قرآن مجید کا چھونا جائز ہے۔ (زاہد اللہ...... مانسہرہ)

جواب: قرآن مجید کی تلاوت کسی پاک جگہ پر باوضو اور قبلہ رو بیٹھ کر کرنا مستحب ہے، اگر کسی نے سگریٹ، تمباکو، پیاز، لہسن، یا بدبودار چیز استعمال کی تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ باقاعدہ مسواک یا پیسٹ وغیرہ سے منہ صاف کر کے تلاوت کرے۔ مسجد میں تلاوت کرنا افضل واولیٰ ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کو چھوئے بغیر بے وضو پڑھنا جائز ہے تاہم یہ خلافِ اولیٰ ہے۔ حالتِ جنابت (یعنی اس حالت میں جس میں شرعاً غسل واجب ہوتا ہے) اور عورت کے لیے حالتِ حیض میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی منع ہے اور چھونا بھی منع ہے، البتہ قرآن مجید کے کلمات بطور دعاء، تسبیح، تحمید، تہلیل اور تشکر پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ تلاوت کا قصد نہ ہو۔ اگر کسی کو غلبۂ ریاح کی شکایت ہو، پیشاب کے قطرے نہ رکتے ہوں، زخم سے مسلسل پیپ یا خون رستا ہو، عورت کا بیماری کے سبب خون نہ رکتا ہو جسے استحاضہ کہتے ہیں تو ان معذوریوں کے سبب اس کے لیے یہ کافی ہے کہ ایک نماز کا وقت داخل ہونے پر تازہ وضو کر لے اور اس نماز کے وقت کے اختتام تک جتنی نمازیں (ادا، قضا، نوافل وغیرہ) چاہیں پڑھ سکتے ہیں، اور اسی طرح جب تک اور جتنی چاہیں تلاوت بھی کر سکتے

ہیں اور جب نئی نماز کا وقت داخل ہو تو تازہ وضو کرلیں۔

قرآن مجید کی تلاوت کن مواقع اور مقامات پر منع ہے

سوال: قرآن مجید کی تلاوت کن مواقع اور مقامات پر منع ہے، ذرا تفصیل سے تحریر کریں۔

(زاہداللہ، مانسہرہ)۔

جواب: قرآن مجید کی تلاوت بعض احوال میں منع ہے، نماز کے رکوع، سجود اور تشہد میں قرآن پڑھنا منع ہے، (اور فتاوٰی عالمگیری میں ہے کہ اس پر سجدۂ سہو واجب ہے)۔ امام کی اقتداء میں حالتِ قیام میں جب محلِ قراءت ہوتا ہے، مقتدی کے لیے قراءت مکروہ ہے، خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ اونگھتے ہوئے اور خطبۂ جمعہ کے دوران مقتدیوں کے لیے قرأت مکروہ ہے، طوافِ بیت اللہ کے دوران قرآن مجید پڑھنا امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے اور جمہور علماء کے نزدیک جائز ہے۔ نماز کی دوسری رکعت میں پہلی رکعت سے بہت زیادہ مقدار میں قرآن پڑھنا منع ہے۔ ایک دو آیات کی زیادتی ہو تو حرج نہیں۔ امام کے لیے نماز میں اتنی طویل قرأت کرنا جو مقتدیوں کے لیے دشوار ہو، یہ بھی مکروہ ہے یا کسی ایک سورت کو معین کرلینا اور دوسری کو ناجائز سمجھنا یہ بھی مکروہ ہے۔ بیت الخلاء اور حمام میں، کسی کوڑے کے ڈھیر پر قرآن مجید کی تلاوت کرنا خلافِ ادب ہے اور مکروہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ الا انی نهيت ان اقرأ القرآن راكعا اوساجداً فاما الركوع فعظموا فيه الرب و اما السجود فاجتهدوا فى الدعاء فَقَمِنٌ ان يستجاب لكم۔

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنو! مجھے حالت رکوع وسجدہ میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، پس رکوع میں رب تبارک وتعالیٰ کی تعظیم کرو اور سجدوں میں دعا پر زور دو (فرائض میں تسبیح مسنون ”سبحان ربی الاعلیٰ“ پر اکتفا کریں اور نوافل میں مسنون عربی دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔) یہ (مقام سجدہ) اس لائق ہے کہ تمہاری دعاء (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) مقبول ہو“۔ (مشکوۃ باب الرکوع)

وعن ابی هريرة قال قال رسول اللہ ﷺ اذا صلى احدكم للناس فليخفف فان فيهم السقيم والضعيف والكبير واذا صلى احدكم لنفسه فليطول ماشاء۔

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کی امامت کرے تو (مقدار قراءت میں) تخفیف کرے کیونکہ ان میں (یعنی جماعت میں) کچھ لوگ بیمار ہوتے ہیں، کچھ ضعیف اور کچھ بڑی عمر کے، جب کوئی شخص تنہا اپنی نماز پڑھے تو پھر جتنی چاہے طویل پڑھے“۔

(مشکوٰۃ باب ماعلی الامام)

مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت

سوال: کیا مکروہ اوقات میں قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے؟

(غازی خان۔ شارع فیصل)

جواب: مکروہ اوقات میں بہتر یہ ہے کہ ذکر، تسبیحات و درود شریف میں مشغول رہیں، تاہم ان اوقات میں تلاوت کرسکتا ہے اور ان اوقات میں تلاوت کے دوران آیت سجدہ آجائے تو اس وقت سجدۂ تلاوت کرسکتا ہے، البتہ اگر اسے مؤخر کرکے صحیح وقت میں کرے تو زیادہ بہتر ہے۔

نوجوان لڑکوں کا گھٹنوں سے اوپر والی نیکر پہن کر گھومنا

سوال: آج کل کچھ نوجوان نیکر (یعنی گھٹنوں سے اوپر) پہن کر گھومتے ہیں جس سے ستر عورت (شرم گاہ) نظر آجاتی ہے آیا یہ لباس شریعت میں جائز ہے یا حرام ہے۔ ایسے مسلم نوجوانوں کے لئے شریعت نے کوئی سزا مقرر کی ہے یا نہیں؟ (عبدالمجید رضوی۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی)

جواب: مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک بدن کا حصہ عورت (یعنی شرمگاہ) ہے اور اس کا ہمیشہ پردے میں رکھنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر بالغ لڑکے ایسا شارٹ کٹ نیکر یا چڈا پہنتے ہیں جن سے رانیں یا ناف سے نیچے بدن کا حصہ برہنہ رہ جاتا ہو تو یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ ایسے لاابالی نوجوانوں کو سمجھانا چاہئے کہ وہ ایسا لباس پہنیں جو سترِ شرعی کے لئے کافی ہو اور اگر وہ سمجھانے سے باز نہ آئیں تو حاکم مجاز انہیں تعزیراً سزا دے سکتا ہے اور اس کی مقدار حاکم کی صوابدید پر منحصر ہے۔

نومسلم بالغ کا ختنہ

سوال: ایک شخص نے قبولِ اسلام کیا۔ اس کا نکاح بھی میں نے ہی پڑھایا۔ اب عرض یہ ہے کہ اس کا ختنہ ہوگا یا نہیں اگر ہو تو اس کی صورت کیا ہوگی اور اگر نہیں تو شرط یا احتیاط کیا ہوگی؟

(مولانا خضر الاسلام نقشبندی، نیو کراچی)

جواب: چونکہ سترِ عورت شرعاً واجب ہے، اور ختنہ کرانا سنت ہے، اور کسی اور سے ختنہ کرانے کی صورت میں کشفِ عورت لازمی ہے جو کہ ترکِ واجب ہے، لہٰذا بہتر ہے کہ ختنہ نہ کرائیں اور اگر کوئی شخص صاحبِ عزیمت ہے اور خود اپنی ختنہ کی ہمت بھی رکھتا ہے اور طریقہ بھی اسے آتا ہے، اس طرح کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق نہ ہو تو پھر خود اپنی ختنہ کر سکتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی نومسلم کی بیوی نرس یا ڈاکٹر ہو اور وہ ختنہ کرنا جانتی ہو تو اپنے شوہر کا ختنہ کر سکتی ہے۔

ماں باپ کی قدم بوسی

سوال: کیا زندہ ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔ نیز اگر وہ فوت ہوگئے ہوں تو قبر چومنا کیسا ہے؟ (محمد الیاس۔ لیبر کالونی لانڈھی، کراچی)

جواب: زندہ ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔ حضرت زارع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں اور وہ وفد عبدالقیس میں شامل تھے کہ جب ہم مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو ہم (فرطِ شوق میں) اپنی سواریوں سے آگے بڑھنے لگے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دینے لگے۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

یہ بزرگوں کے پاؤں چومنے کے جواز پر حدیثِ تقریری ہے، کیونکہ اگر ان لوگوں کا یہ عمل خلافِ شرع ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس سے منع فرماتے۔ چنانچہ اسی حدیث کے تحت علامہ نووی نے لکھا کہ کسی بزرگ کے زہد و اتقاء، علم و شرف اور دینداری کی خاطر تکریماً اس کے پاؤں چومنا جائز ہے۔ (طیبی بحوالہ حاشیہ مشکوٰۃ)

درِمختار میں ہے کہ دیندار حاکم اور سلطانِ عادل کی دست بوسی میں کوئی حرج نہیں ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے اور عالم کو پیشانی کی چومنا بہت ہی عمدہ بات ہے۔ اس کی شرح میں آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں: حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے کہ:

"ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی چیز دکھایئے جس سے میرے یقین میں اضافہ ہو۔ آپ نے فرمایا: اس درخت کے پاس جاؤ اور اسے بلاؤ۔ وہ شخص اس درخت کے پاس گیا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ تجھے بلا رہے ہیں۔ درخت (اپنی جڑوں سمیت اکھڑ کر) چلا آیا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: لوٹ جاؤ تو وہ لوٹ کر (اپنی جگہ پر) واپس چلا گیا۔ راوی کہتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے اس نے آپ کی پیشانی مبارک چومی اور قدم بوسی کی۔ آپ نے فرمایا: اگر میں کسی کو (غیر اللہ کے آگے) سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو (سب سے پہلے) بیوی کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے"۔ (فتاویٰ شامی طبع جدید ج ۹ ص ۴۶۷)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ماں باپ کی قبر کو بوسہ دینے میں کوئی حرج نہیں، (عالمگیری۔ باب زیارۃ القبور)"۔ شامی نے خلاصۃ الحقائق کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "تواضع کے طور پر ماں کے قدم کو چوم سکتے ہیں" لہٰذا اکراماً و احتراماً و تواضعاً ماں باپ کی قدم بوسی جائز ہے۔ قبر کو بوسہ دینا بھی اصولاً جائز ہے لیکن اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے کہ "عوام الناس کو بزرگانِ دین کی قبر کا بوسہ دینے سے منع کرنا ہی احوط ہے اور ظاہر ہے والدین کی قبور کے بوسے سے منع بھی اس احتیاط میں شامل ہے"۔

اگر پیدائش کے موقع پر بچے کا عقیقہ نہ کیا جا سکا ہو تو بعد میں کیا جا سکتا ہے

سوال: ایک قومی اخبار (روزنامہ جنگ کراچی) کی حالیہ اشاعت (21 دسمبر 2001ء) میں مفتی نظام الدین شامزی صاحب سے ایک سائل نے دریافت کیا کہ: (ا) "اگر کسی کی اولاد کا بچپن میں انتقال ہو جائے اور والدین نے اس کا عقیقہ نہ کیا ہو، تو کیا مرنے کے بعد ان کا عقیقہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اور اگر عقیقہ واجب الادا ہے، تو اب اس کا طریقہ کیا ہوگا؟ مفتی صاحب نے جواب دیا: "عقیقہ کے مستحب ایام، ولادت سے ساتواں، چودھواں اور اکیسواں دن ہے، اس کے بعد عقیقہ نہ مسنون ہے نہ ثابت ہے۔ اس لئے جو اولاد بڑی ہو چکی ہو یا ان کا انتقال ہو چکا ہو، ان کا عقیقہ کرنا شرعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا، البتہ مطلق صدقے کے نام سے ویسے کچھ دینا چاہیں تو اچھی بات ہے"...... کیا یہ جواب درست ہے یا نہیں، اگر درست نہیں تو عقیقہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے۔ (محمد ناصر خان چشتی...... تحصیل و ضلع ٹانک، صوبہ سرحد)

جواب: ''عقیقہ'' کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ سَمُرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْغُلَامُ مُرْتَهَنٌ بِعَقِيْقَتِهٖ يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ وَيُسَمّٰى وَيُحْلَقُ رَأْسُهٗ.

''حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے میں گروی ہے، ولادت کے ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے اور اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے''۔ (جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۸۳)

عَنْ سَلْمَانَ بْنِ عَامِرٍ الضَّبِّيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَعَ الْغُلَامِ عَقِيْقَةٌ فَاَهْرِيْقُوْا عَنْهُ دَمًا وَاَمِيْطُوْا عَنْهُ الْاَذٰى.

''حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، اس کی طرف سے خون بہاؤ (یعنی جانور ذبح کرو) اور اس سے گندگی کو دور کرو''۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۲)

عَنْ اُمِّ كُرْزٍ اَنَّهَا سَاَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْعَقِيْقَةِ فَقَالَ: عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ وَاحِدَةٌ لَا يَضُرُّكُمْ ذُكْرَانًا كُنَّ اَمْ اِنَاثًا.

''حضرت ام کرز رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا، آپ نے فرمایا: لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری (ذبح کرو)، اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نر ہو یا مادہ''۔

(جامع ترمذی ج ۱ ص ۱۸۳)

ان احادیث مبارکہ کی رو سے بچے کی پیدائش پر عقیقہ کرنا سنت اور مستحب ہے، یہ نعمتِ اولاد کا بارگاہِ الٰہی میں تشکر بھی ہے اور آفات وبلّیات سے تحفظ کے لئے تصدق بھی ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

بَادِرُوْا بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّ الْبَلَاءَ لَا يَتَخَطَّاهَا.

''صدقہ دینے میں سبقت کرو، کیونکہ مصیبت اس سے تجاوز نہیں کر سکتی''۔ (مشکوٰۃ)

اَلصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَآءُ النَّارَ.

''صدقہ (آتشِ) گناہ کو اس طرح مٹا دیتا ہے، جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے''۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَدْفَعُ مِيْتَةَ السُّوْءِ.

''بے شک صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بری موت (یعنی انجام بد) کو دور کرتا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

سنت یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد ''تحنیک'' (گھٹی پلائی جائے)، یعنی کوئی بزرگ اور صالح شخص کھجور یا کوئی میٹھی چیز چبا کر اس کا شیرہ بچے کے تالو یا زبان پر رکھے تاکہ نیک فال کے طور پر سب سے پہلے کوئی متبرک اور شیریں چیز اس کے حلق میں جائے۔ اس کے بعد پیدائش کے ساتویں دن اس کا نام رکھا جائے اور اس کے بال مونڈ کر ان کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی جائے۔ پیدائش والے دن سے آئندہ ہفتے ایک دن پہلے ساتواں دن ہو جاتا ہے۔ اگر بعینہٖ ساتویں دن کسی وجہ سے عقیقہ نہ کیا ہو، تو چودھویں، اکیسویں یا اس کے بعد بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتویں دن سے تقدیم وتاخیر بھی جائز ہے:

قَالَ فِي السِّرَاجِ الْوَهَّاجِ اِذَا اَرَادَ اَنْ يُّعَقَّ عَنِ الْوَلَدِ يَذْبَحُ عَنِ الْغُلَامِ شَاتَيْنِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةً وَلَوْ ذَبَحَ عَنِ الْغُلَامِ شَاةً جَازَ لِاَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَقَّ عَنِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَبْشًا كَبْشًا، وَلَوْ قَدَّمَ الذَّبْحَ قَبْلَ يَوْمِ السَّابِعِ اَوْ اَخَّرَ عَنْهُ جَازَ اِلَّا اَنَّ يَوْمَ السَّابِعِ اَفْضَلُ وَالْمُسْتَحَبُّ اَنْ يُّفَصَّلَ لَحْمُهَا وَلَا يُكْسَرُ عَظْمُهَا تَفَاؤُلًا بِسَلَامَةِ اَعْضَاءِ الْوَلَدِ وَيُطْعِمُ وَيَتَصَدَّقُ.

''السراج الوہاج، میں فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی اولاد کا عقیقہ کرنا چاہے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے، اگر لڑکے کی طرف سے ایک بکری ذبح کی تب بھی جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے ایک ایک مینڈھے کا عقیقہ کیا، اگر عقیقہ ساتویں دن سے پہلے کر دے یا ساتویں دن کے بعد کرے تب بھی جائز ہے، مگر ساتویں دن کرنا افضل ہے، بچے کے اعضاء کی سلامتی کے لئے نیک فال کے طور پر مستحب یہ ہے کہ گوشت ہڈیوں سے الگ کر دیا جائے اور ہڈیوں کو نہ توڑا جائے، خود بھی کھائے، دوسروں کو بھی کھلائے اور صدقہ بھی کرے''۔

اسی میں ہے:

وَحُكْمُهَا كَاَحْكَامِ الْاُضْحِيَةِ

کہ عقیقہ کے احکام قربانی کے احکام کی طرح ہیں، (العقود الدریہ، کتاب الذبائح، ارگ بازار، قندھار افغانستان 232-233/2، بحوالہ فتاویٰ رضویہ مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن 586-587/20)

اس سے معلوم ہوا کہ عقیقہ اور قربانی کے جانور کے احکام یکساں ہیں، یعنی بکرا، دنبہ ایک سال کا، گائے دو سال کی، اونٹ پانچ سال کا یا جسے عرف عام میں دو دانت کا کہا جاتا ہے۔ عقیقہ کے گوشت اور کھال کا بھی وہی حکم ہے جو قربانی کے گوشت اور کھال کا ہے، عقیقہ کا گوشت خود بھی کھا سکتا ہے، والدین اور اعزاء واقرباء بھی کھا سکتے ہیں اور صدقہ بھی کرنا چاہئے۔ ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن کی شرط استحبابی ہے، وجوب کے طور پر نہیں ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں: ''عقیقہ ساتویں دن افضل ہے، نہ ہو سکے تو چودھویں، ورنہ اکیسویں، ورنہ زندگی بھر جب کبھی ہو، وقت دن کا ہو، رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے''۔

(فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، 586/20 لاہور)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی لکھتے ہیں: ''عقیقہ کے لئے ساتواں دن بہتر ہے اور ساتویں دن نہ کر سکیں تو جب چاہیں کر سکتے ہیں، سنت ادا ہو جائے گی، بعض نے کہا کہ ساتویں یا چودھویں یا اکیسویں دن یعنی سات دن کا لحاظ رکھا جائے، یہ بہتر ہے اور یاد نہ رہے تو یہ کرے کہ جس دن بچہ پیدا ہو، اس دن کو یاد رکھیں، اس سے ایک دن پہلے والا دن جب آ جائے تو وہ ساتواں ہوگا، مثلاً جمعہ کو پیدا ہوا تو جمعرات ساتواں دن ہے اور سنیچر کو پیدا ہوا تو ساتواں دن جمعہ ہوگا، پہلی صورت میں جس جمعرات کو اور دوسری صورت میں جس جمعہ کو عقیقہ کرے گا، اس میں ساتویں دن کا حساب ضرور آئے گا''۔ (بہارِ شریعت 95/15، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور)

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ عَقَّ عَنْ نَفْسِهٖ بَعْدَ النُّبُوَّةِ مَعَ اَنَّهٗ قَدْ وَرَدَ اَنَّ جَدَّهٗ عَبْدُالْمُطَّلِبِ عَقَّ عَنْهُ فِیْ سَابِعِ وِلَادَتِهٖ، وَالْعَقِیْقَةُ لَا تُعَادُ مَرَّةً ثَانِیَةً فَیُحْمَلُ ذٰلِکَ عَلٰی اَنَّ الَّذِیْ فَعَلَهُ النَّبِیُّ اِظْهَارًا لِلشُّکْرِ عَلٰی اِیْجَادِ اللّٰهِ اِیَّاهُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَتَشْرِیْعٌ لِاُمَّتِهٖ کَمَا کَانَ یُصَلِّیْ عَلٰی نَفْسِهٖ۔

''حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد اپنی جانب سے عقیقہ کیا، حالانکہ یہ روایت بھی ہے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی ولادت کے ساتویں دن آپ

کی جانب سے عقیقہ کر لیا تھا، عقیقہ تو دوبارہ نہیں کیا جاتا، اسے اس پر بھی محمول کر سکتے ہیں کہ حضور رحمۃ للعلمین ﷺ نے اپنی ولادت باسعادت کے تشکر کے طور پر اور امت کے لئے حکمِ شرعی وضع کرنے کی خاطر یہ صدقہ دیا ہو، جیسا کہ آپ اپنے اوپر تعلیم امت کے لئے درود بھیجتے تھے''۔

(الحاوی للفتاویٰ، 196/1)

یہ بات ہم نے اس بحث کے شروع ہی میں عرض کر دی ہے کہ عقیقہ بھی فی نفسہٖ نعمتِ اولاد کا تشکر ہے اور ردِ بلاء کے لئے صدقہ ہے اور دعاءِ عقیقہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو درج ذیل ہے:

اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ عَقِیْقَةُ اِبْنِیْ فُلَانٍ دَمُهَا بِدَمِهٖ وَلَحْمُهَا بِلَحْمِهٖ وَعَظْمُهَا بِعَظْمِهٖ وَجِلْدُهَا بِجِلْدِهٖ وَشَعْرُهَا بِشَعْرِهٖ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا فِدَاءً لِاِبْنِیْ مِنَ النَّارِ بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَکْبَرُ۔

''اے اللہ! یہ (ذبیحہ) میرے فلاں بیٹے کا عقیقہ ہے، اس کا خون اس کے خون (دَم' حدیث وفقہ میں جان کے معنی میں بھی آیا ہے)، اس کا گوشت اس کے گوشت، اس کی ہڈی اس کی ہڈی، اس کی جلد اس کی جلد اور اس کے بال اس کے بال کے بدلے میں (صدقہ ردِّ بلا) ہیں، اے اللہ! تو اس (ذبیحہ) کو میرے بیٹے کے لئے نارِ جہنم سے نجات کا فدیہ بنا دے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے''۔

اس دعا میں لڑکے یا لڑکی کا نام مع ولدیت لے کر بھی دعا کر سکتے ہیں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر بچے کی پیدائش کے ساتویں دن کسی مجبوری یا کوتاہی کی بناء پر عقیقہ نہ کیا ہو تو بعد میں کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے، پیدائش کا ساتواں دن افضل ہے، مگر تقدیم وتاخیر بھی جائز ہے۔ مفتی شامزئی صاحب نے جو عقیقہ کے جواز کو ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن تک محدود کر رکھا ہے اور اس کے بعد اس کے سنت یا جائز ہونے کی نفی کر دی ہے، وہ کسی دلیل شرعی کے بغیر ہے، اور اصولِ شرع کے مطابق امام احمد رضا قادری اور مولانا امجد علی کا جو موقف ہم نے ذکر کیا ہے، درست ہے۔ علامہ سیوطی نے اگرچہ اعلانِ نبوت کے حضور ﷺ کے خود اپنا عقیقہ کرنے کی روایت کی توجیہہ کی ہے، وہ درست ہے، لیکن حضرت انس کی روایت میں ''صدقۃ تشکر'' پر عقیقہ کا اطلاق ہمارے موقف کی حقانیت کی دلیل ہے۔

معروف فقیہ مولانا نور اللہ بصیر پوری اس سوال کے جواب میں کہ اگر بچے کی پیدائش کے

ساتویں دن عقیقہ نہ کیا ہو تو آیا بعد میں کر سکتے ہیں؟ لکھتے ہیں:

حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا سید عالم ﷺ نے: **مع الغلام عقیقة فاهر یقوا عنه دما و امیطوا عنه الاذی** "لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے، پس بہاؤ اس کی طرف سے خون اور دور کرو اس سے تکلیف (بخاری، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی)۔ پس اس حدیث شریف میں مطلقاً خون بہانے کا استحبابی امر ہے، بلا قید سابع (ساتویں دن)۔

اس قسم کی احادیثِ مطلقہ بکثرت ہیں اور بعض احادیث میں جو قید سابع موجود ہے، وہ استحبابا فی الاستحباب ہے، پس اگر ایک استحباب فوت ہو جائے یعنی سابع (ساتواں دن) گزر جائے تو دوسرا (یعنی نفسِ عقیقہ) کیوں ترک کیا جائے، آگے چل کر وہ علامہ شامی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد اپنا عقیقہ ادا کیا (عقود الدریہ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ)۔" پھر وہ علامہ ابن حجر کی کتاب العباب (جو شوافع کے نزدیک معتبر ہے) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وقتِ عقیقہ پیدا ہونے سے لے کر بالغ ہونے تک ہے، ساتویں دن عقیقہ کرنا سنت ہے اور جو بالغ ہو اور اس کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو مسنون ہے کہ خود کرے اور پھر اس پر خود عملِ رسالت سے استدلال کیا ہے۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ جو ساتویں (یا بقول بعض چودھویں اور اکیسویں دن) کے بعد عقیقہ کے عدمِ جواز کے قائل ہیں، وہ بتائیں کہ ان کی کیا دلیل ہے۔

(فتاویٰ نوریہ ج ۳ ص ۳۹۴-۳۹۳)

V.C.D کیا ہے اور کیا یہ دینی معلومات اور تبلیغ کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے؟

آواز اور تصویر کو محفوظ کرنے کے لئے کیمرہ استعمال ہوتا ہے اور وقتِ ضرورت اس کو دیکھا اور سنا جاسکتا ہے۔

کیمرے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

پہلی قسم وہ ہے جس میں تصویر اپنی پوری جزئیات کے ساتھ موجود رہتی ہے اور یہ تصویر مستقل ہوتی ہے۔ سارے غیر متحرک کیمرے اور 35mm کی فلم میکر متحرک کیمرے اس ضمن میں آتے

ہیں۔ ان میں نیگیٹیو بنتا ہے جس سے واضح پوزیٹو تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ ان کو دیکھنے کے لئے کسی پلیئر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ تصویریں مستقل ہوتی ہیں اس لئے علماء کرام نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ متفق علیہ ہے اور ہر مکتبۂ فکر میں اس کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری قسم کے کیمرے وہ ہوتے ہیں جس میں عکس کا گراف ہوتا ہے، تصویر نہیں ہوتی۔ اس کو دیکھنے کے لئے وڈیو پلیئر یا کمپیوٹر کی ضرورت ہوتی ہے، یہ کیسٹ یا V.C.D کی صورت میں محفوظ ہوتا ہے، یہ گراموفون کے ریکارڈ یا Audio-tape کی جدید شکل بھی کہلائی جاسکتی ہے، جس میں آواز کے ساتھ تصویر بھی گراف کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔ چونکہ ہم نماز کی V.C.D بنانا چاہتے ہیں اس لئے اس کے کام کرنے کا طریقہ ذرا وضاحت چاہتا ہے۔

کیمرے انسانی آنکھوں ہی کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص ہمارے سامنے آتا ہے تو روشنی کی شعاعیں اس شخص سے ٹکرا کر آنکھوں میں جاتی ہیں اور اس شخص کی ہو بہو تصویر آنکھ کے پردے پر بن جاتی ہے۔ آنکھ کا کام یہ ہے کہ اس تصویر کو بجلی کے کرنٹ میں تبدیل کر دیتی ہے اور آنکھ کی نسوں کے ذریعے دماغ کے پچھلے حصے میں چلی جاتی ہے، دماغ بجلی کے کرنٹ کو ایک خاکہ یا عکس بناتا ہے۔ دماغ کے اس حصے میں کوئی تصویر نہیں بنتی ہے بلکہ یہ خاکہ یادداشت میں محفوظ ہو جاتا ہے اور آئندہ جب بھی وہ شخص دوبارہ نظر آتا ہے تو اس موہوم خاکہ اور اس نظر آنے والے شخص کا موازنہ کر کے ہم اس شخص کو پہچان جاتے ہیں۔

اب آئیے V.C.D یا V.C.R کے کیمرے کا کام کرنے کا طریقہ معلوم کرتے ہیں۔ ان کیمروں میں نیگیٹیو کے بجائے ایک فیتہ مسلسل چلتا رہتا ہے اور فریم کی صورت میں عکس ریکارڈ کرتا ہے۔ اور کسی بھی متحرک یا غیر متحرک شے کا عکس ریکارڈ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک سیکنڈ میں کم سے کم دس (10) فریم ریکارڈ ہوں اور یہ فریم بھی تصویر کی صورت میں ریکارڈ نہیں ہوتے۔ بلکہ ایک گراف کی صورت میں ریکارڈ ہوتے ہیں اور یہ گراف ایک (Head) سوئی سے ریکارڈ ہوتے ہیں۔ جب یہ ریکارڈ ہو جاتے ہیں تو دیکھنے کے لئے پلیئر میں یہ سوئی مختلف سمت میں کچھ کام کر کے اس گراف کو عکس میں تبدیل کر دیتی ہے اور یہ عکس بھی مستقل نہیں ہوتا بلکہ ہر سیکنڈ میں دس (10) سے بیس (20) فریم آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ صرف ایک فریم اسی اعتبار سے پلیئر پر چلے تو انسانی آنکھ اس کو دیکھنے سے قاصر رہے گی۔ کیونکہ وہ عکس ایک لمحے کے

بیسویں حصے میں ظاہر ہوگا اور ختم ہو جائے گا اس لئے وہ عکس مستقل نہیں ہوتا۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غیر متحرک کیمرے سے جو تصویر (جس کا نیگیٹو بھی بنتا ہے) بنتی ہے وہ مستقل ہوتی ہے اور لیکن V.C.D کے کیمرے سے جو عکس بنتا ہے وہ غیر مستقل ہوتا ہے۔ تصویر تو بلاشبہ حرام ہے۔ لیکن اس عکس کو بھی (جس کو دھوپ میں ایک سائے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے) کیا ہم حرام قرار دیں گے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی کا مسئلہ ہے جسے ہمارے علمائے کرام کو حل کرنا ہے۔ ہم اس ٹیکنالوجی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے کیونکہ آج افغانستان میں جو بمباری ہوئی ہے اس میں یہ ٹیکنالوجی استعمال ہوئی ہے۔ ریڈار میں بھی یہی ٹیکنالوجی استعمال ہوتی ہے۔ رہا اس کا غیر ضروری اور غیر شرعی استعمال، تو یہ تو اس کے استعمال کرنے والے پر ہے۔ آج ہر گلی میں وڈیو کی دکانیں کھلی ہوئی ہیں اور آبادی کی ایک کثیر تعداد اس پر ہمارے دشمن کی عریاں فلمیں دیکھتی ہے۔ تو کیا ان کو نماز نہیں سکھلائی جا سکتی ہے؟

دوسرا سوال بھی قابل غور ہے کہ پاسپورٹ پر جو غیر متحرک کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر چسپاں ہوتی ہیں اس کے لئے علمائے کرام یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ ہے تو یہ حرام لیکن حالی ضرورتوں کے تحت یہ گوارہ کی جا سکتی ہے۔ اگر ایک حرام چیز کو ضرورت کے تحت ہم قبول کر سکتے ہیں تو دینی تبلیغ کے لئے V.C.D بھی قبول کرنے میں کیا حرج ہے۔ کیا علماء کرام اس کے لئے اجتہاد نہیں کر سکتے۔ اب کچھ اعتراضات جو ہمارے خیال میں کئے جا سکتے ہیں:

۱) وہ چیز جو عام طور پر غیر شرعی چیزوں کے لئے استعمال ہوتی ہو، اس کو ترک کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر ایک شخص اگر نیت کرتے وقت استقبالِ قبلہ کا خیال نہیں کرتا تو کیا ہم اس کو سکھلائیں گے یا اس کو کہیں گے تمہاری نماز نہیں ہوتی یا تمہارا نماز پڑھنا ہی فضول ہے۔ V.C.D. کا غیر شرعی استعمال روکنے کے لئے ہر شخص کو مقدور بھر کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم کو دینی علوم بھی نہیں سکھلانے چاہئیں۔

۲) ایک تکنیکی سوال جو کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ کمپیوٹر پر فلم روکی بھی جا سکتی ہے۔ اگر Pause کا بٹن دبا دیا جائے تو یہ ممکن ہے۔ لیکن پھر بھی یہ غیر مستقل ہی رہے گی۔ کیونکہ اس بٹن کو دوبارہ دبا دینے سے وہ فریم پھر چلا جائے گا اور یہی عمل کمپیوٹر کو بند کر کے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳) تیسرا عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا پرنٹ آؤٹ بھی نکالا جا سکتا ہے جو مستقل ہوگا لیکن

جاندار چیز کے لئے یہ عمل کیا ہی کیوں جائے۔ جب ہم یہ جانتے ہیں کہ مستقل تصویر حرام ہے۔

ہمارے ذہن میں جو سوالات آئے ہیں اپنی مقدور بھر کوشش کر کے اس کا جواب دے دیا ہے۔ امید ہے کہ علماء کرام مطمئن ہو جائیں گے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں مفتیانِ دین اس مسئلہ سے متعلق کہ اگر نماز کی ادائیگی سکھلانے کے لئے V.C.D بنائی جائے اور غیر تجارتی بنیاد پر لوگوں کو فراہم کی جائے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگ اپنی نماز کی اصلاح کر لیں تو کیا یہ V.C.D بنانا جائز ہے۔ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں اس سوال کا جواب عنایت فرمائیں، (سائل: ڈاکٹر حسن علی، ماڈل کالونی۔ کراچی)۔

جواب: آپ کی تحریر سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے' یہ ہے کہ V.C.D پر کسی چیز کی تصویر منقش یا مرتسم نہیں ہوتی' بلکہ یہ شعاعیں ہوتی ہیں جسے کمپیوٹر یا وڈیو پر منتقل کر کے صورت کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور اسے بھی استقرار نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ ایک حالت میں ساکن و ساکت رکھا جا سکتا ہے، لیکن ماؤس (Mouse) یا بٹن دبانے سے وہ فنا ہو جائے گی یا کمپیوٹر بند کرنے سے بھی وہ فنا ہو جائے گی۔ آپ کی تحقیق کے مطابق اسے دھوپ میں کسی جاندار یا انسان کے سائے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جو سورج کی روشنی کی راہ میں حائل انسان یا کسی دوسرے جاندار کے ہٹنے سے فنا ہو جاتا ہے اور اسے استقرار نہیں ہوتا۔ سائے پر کسی نے بھی آج تک تصویر کا حکم نہیں لگایا، اسی طرح V.C.D کی غیر مستقر لہروں یا شعاعوں کو بھی تصویر قرار نہیں دیا جا سکتا، خواہ کمپیوٹر اسکرین پر وہ صورت اور آواز دونوں کی صورت میں نمودار ہوں۔

لہٰذا ہماری رائے میں آپ کی بیان کردہ فنی تحقیق کے مطابق V.C.D کا استعمال، نماز کی عملی تربیت کے لئے جائز ہے، اسے دوسرے تبلیغی مقاصد کے لئے، مثلاً تلاوت، نعت، وعظ و تقریر یا اسلام پر وارد کئے جانے والے باطل اعتراضات کے رد کے لئے اسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے کمپیوٹر اسکرین پر کسی انسان یا جاندار کی تصویر کو روک کر اس کا پرنٹ نکالنا ناجائز ہوگا۔ اسی طرح V.C.D کے ذریعے کمپیوٹر اسکرین پر فواحش و منکرات پر مبنی ایسے پروگرام، جن میں بے حیائی ہو، بے حجابی ہو، شہوت پرستی، نفسانی اور جنسی تلذذ ہو، بے ہودگی اور لغویات ہوں، دیکھنا ناجائز ممنوع ہوگا اور ایسا کرنے والا گنہگار رہوگا۔

☆☆☆......***......☆☆☆

متفرق

ZQ— تفہیم المسائل دوم کورٹ پوٹ

اللہ تعالیٰ رحیم ہے تو اپنے بندوں کو آگ میں کیوں ڈالے گا؟

سوال: جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ستر ماؤں جتنا پیار کرتا ہے تو اپنے بندوں کو آگ میں کیوں ڈالے گا، (محمد اقبال۔ملیر)۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا، بلاشبہ اللہ شکر قبول کرنے والا بڑے علم والا ہے۔(النساء: ۱۴۷)''۔

لوگ اللہ کے بندے تو بنیں یہاں تو کوئی عزیر کا بندہ ہے، کوئی مسیح کا بندہ ہے، میری مراد یہود و نصاریٰ سے ہے، کوئی لات و منات کا بندہ ہے، کوئی رام اور لکشمن کا بندہ ہے، لوگوں نے اپنے اپنے معبود بنا رکھے ہیں، اور نہیں تو قرآن کے مطابق بعض خواہشاتِ نفس کے پجاری بن گئے ہیں، بقول غالب

ع کر دیا کافران اصنام خیالی نے مجھے

تو جو سچ مچ اللہ کا بندہ بن جائے اللہ تعالیٰ اسے عذاب جہنم میں کبھی نہیں ڈالے گا، جنت اس کے استقبال کے لئے حاضر ہے، حور و غلمان جنت اور انعاماتِ الٰہیہ اس کی منتظر ہیں۔ ماں کے پیار کو تو خالق کے پیارے سے کوئی حقیقی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ننانوے اپنے لئے روک لئے اور صرف ایک حصہ (یعنی ایک فیصد) زمین پر اتارا، اسی ایک فیصد جزءِ رحمت کا فیضان ہے کہ مخلوق ایک دوسرے پر شفقت کرتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا چلتے ہوئے اپنے قدم کو اٹھالیتا ہے کہ کہیں اس کا بچہ کچلا نہ جائے''۔(صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۶۰۰۰)

گم شدہ چیز کے ملنے کے لئے دعاء

سوال: آدمی کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جائے یا کوئی چیز گم ہو جائے تو واپس ملنے کے لئے کیا دعا کرے۔(مسز عائشہ)۔

جواب: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ یا اِنَّہٗ عَلٰی رَجْعِہٖ لَقَادِرٌ بکثرت پڑھتے رہیں، انشاء اللہ

مل جائے گی۔ شیخ احمد کبیر رفاعی رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء منقول ہے:

''یَا جَامِعَ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّارَیْبَ فِیْہِ رُدَّ عَلَیَّ ضَالَّتِیْ''

''اے روز قیامت کے لئے لوگوں کو جمع کرنے والے خالق و مالک میری گمشدہ چیز مجھے لوٹا دے''۔

برصغیر کے کس عالم نے سب سے زیادہ فتاویٰ لکھے ہیں

سوال: سب سے زیادہ شرعی مسائل برصغیر کے کس عالم نے تحریر کئے ہیں؟

(محمد سعید۔گلشن اقبال)

جواب: میری معلومات کے مطابق امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ سب سے زیادہ ہیں، جو پہلے بڑے سائز کی ۱۲ ضخیم مجلدات پر مشتمل تھے، اب انہیں باقاعدہ حوالہ جات اور عربی عبارات کے تراجم کے ساتھ رضا فاؤنڈیشن لاہور ۲۷ جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔

برسی پر کھانا پکا کر تقسیم کرنا

سوال: کیا کسی کی برسی پر کھانا پکا کر تقسیم کرنا ضروری ہے؟ (ثریا پروین۔نارتھ ناظم آباد)

جواب: ایسا کرنا ضروری نہیں ہے، ضروری واجب کے معنی میں ہوتا ہے کہ آپ نہ کریں تو گنہگار ہوں گی۔ ہاں البتہ ایصال ثواب شرعاً جائز و مستحسن اور قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ وہ برسی والے دن بھی کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے یا بعد میں بھی، اور کھانا پکا کر غریبوں کو کھلانا اس کی ایک صورت ہے، دوسری صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں، مثلاً غریبوں کی مالی اعانت کرنا، مساجد دینی مدارس کی اعانت کرنا، رفاہِ عامہ کے کام کرنا، جیسے کنواں کھود کر وقف کر دینا جہاں پانی کی قلت ہو۔

رزق میں برکت کیلئے دعاء

سوال: رزق میں برکت کے لئے کیا دعاء کی جائے؟

(مسز عائشہ شعیب بھومبل......گلشن اقبال)

جواب: اس کے لئے کئی دعائیں اور وظائف ہیں، جو قرآن و حدیث اور سلف صالحین

سے ثابت ہیں۔ سب سے بہترین وظیفہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کثرت سے استغفار کرنا ہے، سورۂ نوح آیت نمبر ۱۰ میں حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''تو میں نے کہا: اپنے رب سے مغفرت کی دعاء کرو، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا، اور (کثیر) مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد فرمائے گا، اور تمہارے لئے باغات اگائے گا اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا''۔

تفسیر مظہری میں ''سورۃ الطلاق'' کی آیت نمبر ۲ کے تحت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ: ''روزانہ پانچ سو بار ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' پڑھے اور اس کے اول و آخر سو سو مرتبہ درود شریف پڑھے'' یا امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے کہ ''بعد نمازِ عشاء کھلے آسمان تلے ننگے سر باوضو قبلہ رو بیٹھ کر پانچ سو بار ''یَامُسَبِّبَ الْاَسْبَاب'' پڑھے اور اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے، خواتین سر ڈھانک کر اور باپردہ جگہ بیٹھ کر پڑھیں، یا ہر نماز کے بعد گیارہ گیارہ مرتبہ اور صبح و شام سو سو مرتبہ اول و آخر درود شریف کے ساتھ یہ دعاء پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

''اے اللہ! تو مجھے رزق حلال اتنا وافر عطا فرما کہ حرام کی طلب بالکل نہ رہے اور تو مجھے اپنے فضل وکرم سے خود اتنا عطا فرما کہ تیرے غیر سے بے نیاز ہو جاؤں''۔

کھانے اور پھل وغیرہ پر فاتحہ

سوال: ہم لوگ کھانا اور پھل سامنے رکھ کر فاتحہ پڑھتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور ایسے کھانے کھانا جائز نہیں سمجھتے، ہم لوگ مذہبی تہواروں کے موقع پر لوگوں کے گھروں میں کھانا بھیجتے ہیں، یہ کیسا ہے۔ (مسز شعیب، بھوبل۔ گلشن اقبال)۔

جواب: کھانے سامنے رکھ کر فاتحہ دینا ضروری بھی نہیں ہے، اور اس کی شریعت میں ممانعت بھی نہیں ہے، کھانا سامنے نہ ہو تب بھی فاتحہ دی جا سکتی ہے۔ فاتحہ میں کیا ہے ایک تو کھانا ہے جو حلال ہے اور طیب ہے، دوسرا اس پر قرآن کی چند سورتیں یا آیات پڑھی گئی ہیں، وہ بھی ثواب اور برکت کا کام ہے، تیسرا ایصال ثواب ہے جو شرعاً جائز ہے بلکہ حدیث شریف میں اس کا جواز

موجود ہے، اب جو صاحب اس کے کھانے کو ناجائز کہتے یا سمجھتے ہیں تو وہ بتائیں کہ عدمِ جواز کی شرعی وجہ کیا ہے۔

خوشی کے مواقع پر ایک دوسرے کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی ترغیب حدیث شریف میں آئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو تا کہ تم میں باہم محبت پیدا ہو'' ایصالِ ثواب کا کھانا فقراء و مساکین کو دیا کریں، تبرک کا کھانا دوست احباب کو بھی دے سکتے ہیں۔

بند دکان میں بلی مرگئی

سوال: میں اپنی دکان بند کر رہا تھا کہ لاعلمی میں بلی اندر بند ہوگئی اور کسی کو پتا نہیں چل سکا، بعد میں دکان کھول کر دیکھا تو وہ مری ہوئی برآمد ہوئی، اس کا کوئی کفارہ ہے؟

(حفیظ الرحمٰن۔ سوسائٹی)

جواب: بلی کے دکان کے اندر بند کرنے میں آپ کے کسی ارادے یا کوتاہی کا کوئی دخل نہیں ہے، نہ ہی آپ کے علم میں تھا کہ غلطی سے بلی دکان میں بند ہوگئی ہے کہ آپ اس کے نکالنے کا اہتمام کرتے اور سستی کرنے پر قصوروار ٹھہرتے۔ بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں۔ استغفار ویسے بھی نزول برکت کا ذریعہ ہے۔

شوہر والدین سے ملنے نہیں دیتے

سوال: میرے شوہر والدین سے ملنے نہیں دیتے، اگر میں ان کی اجازت کے بغیر والدین سے ملوں تو کیا یہ ان کی حکم عدولی ہوگی، (ڈاکٹر بشریٰ۔ گلستان جوہر)۔

جواب: آپ کے شوہر کا آپ کو والدین کی ملاقات سے منع کرنا، یہ قطع رحمی کا سبب ہے، گناہ ہے، انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈرنا چاہئے، آپ انہیں نرمی سے قائل کرتی رہیں اور ''یَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ'' پڑھتی رہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں رحم کا جذبہ ڈال دے گا، حتی الامکان ان کی حکم عدولی نہ کریں۔

کبوتروں کو دانہ ڈالنا

سوال: بعض لوگ حرمینِ طیبین میں کبوتروں کے لئے دانہ ڈالتے ہیں، اسے کبوتر اور پرندے چگتے رہتے ہیں، چیونٹیاں بھی اپنے بلوں میں لے کر جاتی ہیں، کیا یہ عملِ خیر ہے اور اس پر اجر ملے

گا، بعض لوگ اسے اناج کا ضیاع کہتے ہیں یا بے ادبی پر محمول کرتے ہیں؟ شرعی حکم بیان کیجئے،

(نعیم الرحمٰن، بٹگرام)

جواب: صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی مسلمان پودا لگاتا ہے یا اناج کاشت کرتا ہے، اس سے کوئی درندہ، پرندہ یا کوئی اور جاندار کھاتا ہے، تو اس کے لئے اس میں اجر ہے۔ اور ایک روایت میں فرمایا کہ یہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ اس حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے کسی عملِ خیر یا محنت کے ثمرہ سے اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کو غیر ارادی طور پر بھی فائدہ پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اجر سے محروم نہیں فرماتا اور یہ نیکی اس کے لئے صدقہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا اس حدیثِ پاک کی روشنی میں چرند، پرند، حشرات الارض اور دیگر جانداروں کے لئے چارہ یا اناج ڈالنا نیک عمل ہے۔

حرمین طیبین میں اگر کوئی ایسی کھلی جگہ ہو جو عام گزرگاہ نہ ہو تو وہاں حسبِ ضرورت جانوروں کے لئے اناج ڈالنا بلاشبہ کارِ ثواب ہے، لیکن مشاہدے میں یہ آیا ہے کہ اکثر لوگ عام گزرگاہ پر اناج ڈالتے ہیں، پرندوں کو چگنے کا وقفہ کم ہی ملتا ہے، اناج ضرورت سے زیادہ ڈالا جاتا ہے، لوگوں کے پاؤں کے ساتھ لگ کر حرم کے اندر تک پہنچتا ہے اور کئی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، جن میں اناج کا ضیاع، بے حرمتی اور حرم پاک کی آلودگی سب شامل ہیں، لہٰذا زیادہ بہتر اور شرعی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کھلی جگہ پر جو عام گزرگاہ نہ ہو یہ اناج پرندوں کے لئے ڈالا جائے اور ضیاع واضح طور پر نظر آئے تو اس رقم کو کسی دوسرے کارِ خیر میں لگا دیں۔

دعوتِ دین کا اسلوب

سوال: ایک بہت مسئلہ اہم مسئلہ درپیش ہے، وہ یہ کہ کراچی کے ایک علاقے سابقہ کراچی ایسٹ کی ایک مسجد کے ایک بزرگ نمازی اکثر مسجد میں اس بات پر جھگڑا کر چکے ہیں کہ بغیر داڑھی والا نمازی اگلی صفوں میں کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھے، بلکہ پچھلی صفوں میں نماز پڑھے اور دوسرے یہ کہ داڑھی کٹوانا اور زنا کرنا ایک برابر ہے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ ان دونوں مسائل کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیے۔ شکریہ

(ایس این اقبال، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی)

جواب: دین کے بارے میں غیور و جسور ہونا، دینی حمیت رکھنا، دینی اقدار کی پامالی پر افسردہ ہونا اور مومنوں کے اصلاحِ احوال کے لئے حریص ہونا بہت اچھی بات ہے، مگر قرآن مجید نے جو دعوتِ دین کا حکیمانہ اسلوب بتایا ہے، دین کے داعی اور مبلغ کو اسے بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (النحل:۱۲۵)

"(اے حبیب: لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیے: اور احسن طریقے سے ان پر حجت قائم کیجئے، بے شک آپ کا رب انہیں خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گئے اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی خوب جانتا ہے"۔

اس آیت میں دعوتِ دین کے تین اسلوب بیان کئے گئے ہیں:

ایک دعوت بالحکمت: اس کے متعدد معانی میں سے ایک یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کے فساد اور خرابی کی بناء پر اختیار کرنے سے منع کرنا یا کسی چیز کو اس کے عمدہ اور مفید نتائج کی وجہ سے اختیار کرنے کی تلقین کرنا، یعنی علم اور عقل سے افعال اور اشیاء کی حسن و قبح کو جاننا اور ثابت کرنا۔

دوسرا موعظۂ حسنہ: اس سے مراد اچھے اجر کی نوید سنا کر عملِ خیر کی ترغیب دینا اور عذاب کی وعید سنا کر عملِ شر سے بچنے کی تلقین کرنا۔

تیسرا جدالِ احسن: کسی شخص کا دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے اور اپنی علمی برتری منوانے کے لئے دوسرے سے بحث و تمحیص کرنا جدل محض ہے، اور حق کی حقانیت اور باطل کے بطلان کو ثابت کرنے کیلئے دلنشیں اور مؤثر انداز میں دلائل دینا "جدالِ احسن" ہے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن كعب بن مالک قال: قال رسول الله ﷺ: من طلب العلم ليجاری به العلماء اوليماری به السفهاء اويصرف به وجوه الناس اليه ادخله الله النار.

"کعب بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو علم اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس کے ذریعے علماء سے مقابلہ کرے یا جاہلوں سے (اپنی علمی برتری ثابت

کرنے کیلئے) بحث ومناظرہ کرے یا اس لئے کہ لوگوں کا رخ اپنی جانب پھیردے تو اللہ اسے جہنم میں داخل کرے گا"۔ (مشکوٰۃ کتاب العلم بحوالہ ترمذی)

لہٰذا دین دار بزرگوں کو لعن طعن اور ڈانٹ ڈپٹ کا وتیرہ اختیار کرنے کے بجائے پیار ومحبت اور ترغیب وترہیب کا انداز اپنانا چاہئے۔ حدیث پاک میں ہے:

عن انس عن النبی ﷺ قال: یَسِّرُوا ولا تُعَسِّرُوا وبَشِّروا ولا تنفروا۔

"حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (دین کو) آسان کرکے پیش کرو، مشکل کرکے پیش نہ کرو، اور (لوگوں کو رحمت الٰہی کی) بشارت دو انہیں متنفر نہ کرو"۔ (صحیح بخاری کتاب العلم، رقم الحدیث:۶۸)

نماز باجماعت میں پہلی صف میں امام کے قریب ترجیحی طور پر ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ضرورت کے وقت امام کی نیابت کرسکیں، باقی لوگ جس ترتیب سے آئیں گے اسی ترتیب سے صف بندی کرکے نماز باجماعت میں شامل ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے داڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے، لہٰذا داڑھی رکھنا واجب ہے اور اسے کٹوانا مکروہ تحریمی ہے، اور ایسا کرنے والا فاسق ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ داڑھی کٹوانے اور زنا کرنے کی قباحت اور حرمت ایک ہی درجے کی ہے، غلط ہے، زِنا حرامِ قطعی ہے اور اس کی حرمت کا انکار کفر صریح ہے--

☆☆☆.........☆•••☆••☆.........☆☆☆

صوفیائے نقشبندیہ کے ہاں اعضاء انسانی کے ذکر کا تصور موجود ہے جسے ذکر خفی کہتے ہیں۔

میں نے اس سوال کا مندرجہ بالا جواب اپنی فہم کے مطابق دے دیا تھا۔ بعد میں علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز کی ایک تحریر نظر سے گزری، جو بظاہر میرے جواب کی مؤید ہے، وہ درج ذیل ہے: "جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کے ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے اگر آپ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں حضور کی توہین ہے تو ذرا اس امر پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں پندرہویں پارے میں ارشاد فرماتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ۔ اور تسبیح کے متعلق علمائے اعلام ومفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ تسبیح حقیقی ہے جیسا کہ مفرداتِ امام راغب مطبوعہ، ص:220 پر مرقوم ہے۔ فذلک یقتضی ان یکون تسبیحا علی الحقیقة یعنی دلائل وقرائن کا تقاضا یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں تسبیح حقیقت پر محمول ہو یعنی تسبیح قولی مراد لی جائے اور صرف امام راغب ہی نہیں بلکہ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ تفسیر روح المعانی پارہ 15، ص:79 پر تسبیح قولی حقیقی پر احادیث وآثار کثیرہ نقل فرماکر لکھتے ہیں: الی مالا یکاد ویحصی من الاخبار والآثار و ھی بمجموعھا متعارضة فی الدلالة علی ان التسبیح قال کما لا یخفیٰ و ھو مذھب الصوفیة۔ یعنی بے شمار احادیث اور آثار مجموعی قوت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ جس تسبیح کا ذکر فرمارہا ہے وہ "تسبیح قالی" ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور یہی صوفیہ کا مذہب ہے، اس کے بعد ص:80 پر فرماتے ہیں: ولعل الاولیٰ فیه ان یلتزم حمل التسبیح علی ما ھو الا عم من الحالی والقالی ویثبت کلا النوعین لکل شیء۔ یعنی اولیٰ یہ ہے کہ یہاں تسبیح سے عام تسبیح مراد لی جائے جو حالی اور قالی دونوں کو شامل ہو اور دونوں قسم کی تسبیح ہر شے کے لیے ثابت کی جائے۔ ان عبارات سے یہ بات روزِ روشن کی ثابت ہے کہ عالم کا ہر ذرہ (خواہ پاک ہو یا ناپاک، خبیث ہو یا طیب) حالی اور قالی تسبیح حقیقی میں مصروف ہے اب صرف اتنی بات غور طلب ہے کہ یہ تسبیح ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے کہیں ناپاک تو نہیں ہوگئی، اگر تسبیح خداوندی ہر ناپاک اور خبیث چیز میں پائی جاسکتی ہے تو جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کا پایا جانا کیوں قابل اعتراض ہے، نجاست جس قسم کی ہوتی ہے اسی قسم کی اشیاء میں اثر کرتی ہے، دیکھئے مشرکین نجس ہیں، لیکن اگر کوئی مشرک اپنا صاف ستھرا ہاتھ پانی میں ڈال دے تو وہ پانی ناپاک نہ ہوگا، حالانکہ شرک ناپاک

ہے۔ اس پانی کے ناپاک نہ ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ پانی اس عالم اجسام کی قسم سے ہے اور مشرک کی نجاست محض اعتقادی ہے، امورِ اعتقادیہ عالم اجسام کی قسم سے نہیں، لہٰذا یہ نجاست پانی میں اثر نہیں کرسکتی، بخلاف جسمانی نجاست کے کہ وہ اشیاء جسمانیہ کو متاثر کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی حقیقت عالم امر بلکہ اس سے بھی بالاتر ہے اور یہ نجاست وخباثت کے آثار صورِ جسمانیہ سے متعلق ہیں جو عالم خلق کی چیز ہے۔ اب بتائیے کہ شرک کی اعتقادی نجاست پانی کو ناپاک نہیں کرسکتی تو نجاستیں حضور کے نور کو کس طرح ناپاک کرسکتی ہیں؟ آفتاب و ماہتاب، شعاع بصری اور چراغ کی روشنی رات دن نجس اور ناپاک چیزوں پر پڑتی ہے مگر ناپاک نہیں ہوتی، آپ اندازہ کیجئے کہ جو نجاست مذکورہ روشنی اور اس کی شعاعوں کو ناپاک نہیں کرسکتی، وہ حضور ﷺ کے نورانی جلووں کو کیونکر ناپاک کرسکے گی؟ جس طرح یہ نجاست اپنی ہی نوع کی چیزوں کو متاثر کرسکتی ہے، اسی طرح اس کا ازالہ بھی ایسی ہی ہم جنس اشیاء سے ہوسکتا ہے۔

اعتقادی نجاست پانی سے دور نہیں ہوسکتی، خواہ تمام دنیا کے سمندر مشرک کو پاک کرنے کے لیے صرف کردیے جائیں، لیکن وہ پاک نہ ہوگا، اس کی پاکی کلمہ طیبہ کی تصدیق پر موقوف ہے، اگر وہ سچے دل سے ایک مرتبہ کلمہ طیبہ ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ'' پڑھ لے، تو جو نجاست دنیا کے پانیوں سے دور نہیں ہوسکتی وہ ایک آن میں زائل ہوسکتی ہے۔ اب اگر کوئی بے وقوف اس کلمہ طیبہ کو جسمانی نجاست کے ازالہ کے لیے استعمال کرے اور ناپاک جسم یا نجس کپڑے پر کلمہ شریف پڑھ کر پھونکنا شروع کردے اور یہ خیال کرے کہ یہ کلمہ تو ایسا ہے کہ سات سمندروں سے جو چیز پاک نہ ہوسکے وہ اس سے پاک ہوجاتی ہے، یہ ماشہ بھر نجاست اس کے سامنے کیا حقیقت رکھ سکتی ہے، تو کیا اس بے وقوف کا خیال صحیح ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ اس جسمانی نجاست کے لیے بہرصورت اسے پانی ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ جو اس عالم اجسام کی چیز ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم شہادت کی نجاستیں اسی عالم شہادت کی اشیاء کو متاثر کرسکتی ہیں اور جو نجاستیں جسمانیت سے الگ ہیں، ان کا اثر جسمانیات پر نہیں ہوسکتا پاکی اور ناپاکی کے اس فلسفے کو ذہن میں رکھ کر اگر آپ حاظر و ناظر کے مسئلہ کو سوچیں تو کوئی الجھن آپ کے ذہن میں باقی نہ رہے''۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا: '' خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا کی ناپاک اور خبیث چیزیں ہوں، جہنم کے طبقات ہوں یا کفار و مشرکین کی ذوات، اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ان سب چیزوں میں خدا کی شان جلال و کمال اور اس کی صفت و قدرت کے کمال کے

وہ نمونے پائے جاتے ہیں جو کھلی ہوئی آیات اور روشن نشانیاں ہیں، جب ان خباثت و نجاست کے اثرات جلوہ ہائے جلال و جمال خداوندی پر اثر انداز نہیں ہوسکتے، تو حقیقت محمدیہ کے جلوے بھی تو جمال خداوندی ہی کے جلوے ہیں، ان کو یہ چیزیں کیسے متاثر کرسکتی ہیں؟ (مقالاتِ کاظمی، جلد:3، ص126 تا128)''۔

اس کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری، وہ لکھتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ کو بندروں اور خنزیروں کا خالق کہنا ممنوع ہے: الزمر:62-61 میں فرمایا: اور اللہ متقین کو ان کی کامیابی کے سبب سے عذاب سے نجات دے گا، ان کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ ہی غمگین ہوں گے، اللہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا نگہبان ہے''۔ اس آیت سے پہلی آیت میں مشرکین مکذبین کی وعید کا ذکر تھا اور اس آیت میں مؤمنین اور مصدقین کے وعدہ کا ذکر ہے، اس میں ان کے لیے بشارت ہے کہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہیں گے''۔

الزمر 62 میں فرمایا: '' اللہ ہر چیز کا خالق ہے''۔

اللہ تعالیٰ کی حمد میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے وہ گندگی، کیڑے مکوڑوں اور بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف حسن اور اچھائی کی تخلیق کی نسبت کرنا صحیح ہے اور برائی کی تخلیق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ہماری کتب عقائد میں اسی طرح مذکور ہے۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی 791ھ لکھتے ہیں:

''یقال انه خالق الکل ولا یقال خالق القاذورات والقردة والخنازیر۔ یہ کہا جائے گا کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، (شرح المقاصد، ج:4، ص:275، ایران، 1409ھ)''۔ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ لکھتے ہیں:

''انما لا یطلق لفظ الشریر علیه کما لا یطلق لفظ خالق القردة والخنازیر مع کونه خالقالهما۔ اللہ تعالیٰ پر لفظ شریر کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ پر یہ اطلاق نہیں کیا جائے گا کہ وہ بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، حالانکہ وہ ان کا خالق ہے، (شرح

المواقف، ج:8،ص:63،مطبوعہ:ایران)''۔ علامہ قاسم بن قطلو بغا حنفی متوفی 881ھ لکھتے ہیں:''ولا یصح ان یقال خالق القاذورات و خالق القردة والخنازیر مع کونھا مخلوقة له اتفاقا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیروں کا خالق ہے، حالانکہ بالاتفاق یہ تمام چیزیں اسی کی مخلوق ہیں،(المسامرة شرح المسائرہ،ص:127،دائرۃ المعارف الاسلامیہ،مکران)''۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ خالق الاجسام ہے اس کو کیڑے مکوڑوں اور بندروں کا خالق کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے الفاظ سے اس کی تنزیہ واجب ہے،(تفسیر کبیر، ج:5،ص 417، دار احیاء التراث العربی، بیروت1415ھ)''۔

یہ کہنا کفر ہے کہ میری آنتیں ''قل ھواللہ'' پڑھ رہی ہیں اور دیگر کفریہ محاورے:

بعض لوگ شدید بھوک کا اظہار کرنے کے لیے یہ کہتے ہیں:''میری آنتیں قل ھواللہ پڑھ رہی ہیں''، یہ کلمہ کفریہ ہے کیونکہ آنتوں میں فضلہ اور براز ہوتا ہے اور یہ نجس چیز ہے اور نجس چیز کی طرف اللہ کے کلام کی نسبت کرنا کفر ہے۔ ملا علی قاری متوفی 1014ھ لکھتے ہیں:

من قال لا خرطبخ القدر بقل ھو اللہ احد کُفِّرَ۔ جس نے دوسرے شخص سے کہا:''پتیلی نے قل ھو اللہ احد سے کھانا پکایا''، اس شخص کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ حسن بن منصور ابن جندی متوفی 592ھ لکھتے ہیں:

''جس شخص نے مذاق سے یا استہزاء سے یا تخفیف کرتے ہوئے کلمہ کفر کہا، وہ سب کے نزدیک کافر ہو جائے گا خواہ اس کا اعتقاد اس کلمہ کفر کے برخلاف ہو،(فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ، ج3،ص:577،البحر الرائق ج5،ص:120،المحیط البرہانی ج5،ص:562)''۔

بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز خدا کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، قرآن مجید میں ہے:

''وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ''۔ ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے، بنی اسرائیل:44)۔ اور ہر چیز کے عموم میں آنتیں بھی داخل ہیں، سو ان کا قل ھواللہ پڑھنا بھی جائز ہونا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے عموم میں تو لید اور پیشاب بھی داخل ہے تو کیا ان کی طرف بھی حمد اور تسبیح کی نسبت کی جائے؟ اس لیے اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر چیز جو طاہر اور طیب ہو اور

مبتذل نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، فقہاء نے ہانڈی و دیگچی کی طرف بھی قل ھواللہ پڑھنے کی نسبت کرنے کو کفر قرار دیا ہے، حالانکہ ہانڈی نجس ہے اور نہ نجاست کا محل ہے اور آنتیں نجاست کا محل ہیں، تو ان کی طرف ''قل ھواللہ'' پڑھنے کی نسبت کرنا بہ طریق اولیٰ کفر ہوگا، اسی طرح یہ محاورات بھی کفریہ ہیں: فلاں نے فلاں کو صلوٰتیں سنائیں۔ اس میں گالم گلوچ اور فحش کلام پر صلوٰۃ کا اطلاق ہے، اسی طرح یہ محاورہ بھی کفریہ ہے: نمازیں بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے، اس میں روزوں سے بیزاری کا اظہار ہے،(تبیان القرآن، جلد:10،ص:289-288)''۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو اجمالی طور پر کہنا ہے کہ اللہ خالق کل شیءٍ ''یعنی اللہ ہر چیز کا خالق ہے''، اس عموم میں بلاشبہ طیب و طاہر اور خبیث و نجس ہر طرح کی مخلوق شامل ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر ہر چیز کا خالق ہے، لیکن بطور خاص اسے ''خالق خنزیر'' کہنا فی نفسہٖ معنوی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود خلافِ ادبِ بارگاہِ الوہیت جل وعلا ہے۔ اسی طرح وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ''یعنی ہر چیز (اپنی نوع اور حال کے مطابق) اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح بیان کر رہی ہے،(بنی اسرائیل:44)''، یہ بھی اپنے عموم کے اعتبار سے تمام مخلوقات کی تسبیحات و اذکار کو شامل ہے، لیکن بطور خاص کہنا کہ:''آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں'' بھی فی نفسہٖ معنوی طور پر درست ہونے کے باوجود آدابِ بارگاہِ الوہیت جل علا کے خلاف ہے اور کلمہ کفر ہے، لہٰذا میں اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کرتا ہوں اور قائل سے بھی کہتا ہوں کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان کرے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی دانستہ و نادانستہ تقصیرات کو معاف فرمائے۔

قرآن مجید نے ہمیں ذاتِ باری تعالیٰ کا یہی ادب سکھایا ہے، چند آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

ا۔ مَاۤ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ٘ وَمَاۤ اَصَابَكَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ

ترجمہ: تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے،(النساء:79)''۔

2۔ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۙ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۙ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۙ (الشعراء)

''(اللہ) وہ ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی مجھے راہ راست پر چلاتا ہے، اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے اور وہی ہے جب میں بیمار ہوتا ہوں، تو مجھے شفا دیتا ہے''۔

درحقیقت بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفا بھی اسی کی عطا ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرض (جو کہ نقص وعیب ہے) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی اور شفا (جو کمال ہے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی۔

3۔ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا۝

اور کشتی جو تھی، وہ مسکین بندوں کی تھی، جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے، تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کردوں، اوران کے پیچھے ایک (ظالم) بادشاہ تھا، جو ہر (عمدہ) کشتی کو غصب کر لیتا تھا، (الکہف:79)''۔اسی سورت کی آیت نمبر 82 میں فرمایا:

4۔ وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ۔

ترجمہ: دیوار جو تھی، وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی (ملکیت) تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ (دفن) تھا اوران کا باپ (مرد) صالح تھا، تو تمہارے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں، (ان کے ساتھ یہ حسن سلوک) تمہارے رب کی رحمت کے سبب سے ہے، اور میں نے (یہ سب کچھ) اپنی مرضی سے نہیں کیا''۔ حضرت خضر علیہ السلام نے مسکین مزدوروں کی کشتی کو عیب دار بنانے کی نسبت اپنی طرف کی (کیونکہ یہ ایک نقص ہے) اور دو یتیم لڑکوں کی دیوار کی تعمیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی (جو ایک خوبی ہے) حالانکہ انہوں نے خود بتا دیا کہ یہ دونوں کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیئے۔

غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی نوراللہ مرقدہ نے جو لکھا وہ دراصل تحقیقی انداز میں نہیں بلکہ الزامی انداز میں ہے، یعنی جو معاندین رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے منکر ہیں اور طرح طرح کے موانع وارد کرتے ہیں اور تعریضات کرتے ہیں، تو اس طرح کے موانع اور تعریضات تو پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہونے پر بھی وارد ہوسکتے ہیں، تو ''فما هو جوابكم فهو جوابنا'' یعنی تم شان الوہیت کی تنزیہہ وتقدیس کے شایانِ شان جو جواب دو گے، اس کا اطلاق شانِ رسالت کی تقدیس پر ہوگا۔

نوٹ: اگر فجر کے فرض وقت پر ادا کر دیئے ہوں اور صرف سنتیں رہ گئی ہوں، اُس دن طلوع آفتاب کے بیس منٹ بعد اور زوال سے پہلے ان سنتوں کی قضا پڑھ لینا امام محمد کے نزدیک مستحب ہے، کوئی نہ پڑھے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہے، شیخین کے نزدیک مستحب تو نہیں ہے، لیکن کوئی پڑھ لے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے۔